جلد (۷) شمارہ (۱)

زیر سرپرستی جناب خان فضل محمد خاں صاحب ایم۔ اے ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مجلس ادارت:۔ سید علی اکبر ایم۔ اے (کنٹب) مدیر مسؤل
سید فخر الحسن مُلّا بی اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) مدیر
محمد عبد النور صدیقی بی اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) شریک مدیر

مقاصد

(۱) طبقۂ اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدار کرنا۔
(۲) طبقۂ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا۔
(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔
(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔
(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

قواعد

(ا) رسالہ کا نام حیدرآباد ٹیچر ہوگا اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا۔
(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔
اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی تین روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ)
صرف اُردو حصہ (عہ ۱۲) سالانہ قیمت فی پرچہ اردو انگریزی (۱۲) صرف اردو (۸)
(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہوسکے گا۔
(د) صرف وہی مضامین درج ہوسکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔
(ر) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہئے۔
(س) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ہذا رہے گا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	لعہ	صہ ۸	سے ؍
نصف صفحہ	صہ ؍	عہ ۱۲	عہ ۸
ربع صفحہ	عہ ۸	عہ ۶	۱۵
فی سطر	۱۰	۸	۶

اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن میں طبع ہوکر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر مہتممی تعلیمات بلدہ سے شایع ہوا

جلد ۷ شمارہ (۱)

حیدرآباد ٹیچر

بابت شہریور ۱۳۴۱ف مطابق جولائی ۱۹۳۲ء

فہرست مضامین

نشان سلسلہ	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	عجائب خانوں کا اثر عملی تعلیم پر	جناب امداد احمد زبیری صاحب بی۔اے ایل ٹی	۲
۲	رُوسو کے مختصر حالات اور تعلیمی نظریات	،، عبدالشکور خاں صاحب بی۔اے مددگار مدرسہ فوقانیہ بیڑ۔	۱۰
۳	عجائبات قدرت۔	جناب ناظم صدیقی صاحب بی ایس سی۔	۱۴
۴	بچے کی تعلیم اور مدرسہ کی شرکت۔	،، عبدالجبار سبحانی صاحب بی۔اے۔بی ٹی۔	۲۱
۵	شذرات۔		۳۰/۳۲
۶	طریقۂ تعلیم ریاضی۔	جناب ڈی۔سی بھوگلے صاحب بی۔اے، بی ٹی۔	۱۷ تا ۴۸
			۶۴

عجائب خانوں کا اثر عملی تعلیم پر

از

(امداد احمد زبیری - (بی - اے - (علیگ)

عجائب خانوں کا تخیل زمانہ قدیم سے موجود ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب کوئی نادر چیز ہاتھ لگتی ہے تو وہ اس کو حفاظت اور احتیاط سے رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ درحقیقت یہی انسانی خواہش عجائب خانوں کا پیش خیمہ ہے۔ نادر اشیاء کو بہ حفاظت رکھنے میں بڑا کام کیا ہے۔ بعض نے اپنی بزرگوں کی یادگار کے طور پر بعض نے مذہبی اہمیت کا خیال کر کے اور بعض نے ملکی اور سیاسی خیالوں سے نوادر کا اچھا ذخیرہ جمع کیا۔ چنانچہ دنیائے اسلام میں انفرادی طور پر اس قسم کے بہت سے عجائب خانے موجود تھے لیکن آئے دن کی سیاسی جنگوں نے ان کو قایم نہ رہنے دیا۔ اور وہ دنیا سے نیست و نابود ہو گئے اور اب ان کا وجود سوائے تاریخ کے صفحات کے کہیں نظر نہیں آتا۔

پہلے زمانے میں عجائب خانے صرف نادر اشیاء کے انبار خانے سمجھے جاتے تھے اور ان کو شکل ہی سے حیات جاودانی بخشنے جانے کے قابل تصور کیا گیا تھا۔ لیکن اب حالات کے پلٹا کھانے اور تعلیم میں ترقی ہو جانے کی وجہ سے تحقیق کا مادہ لوگوں میں اس قدر پیدا ہو گیا ہے کہ عجائب خانوں کو عجیب و غریب اور نادر اشیاء کا صرف گنجینہ ہی نہیں خیال کیا جاتا بلکہ قومی قالبوں میں روح پھونکنے کیلئے ان کا وجود لازم سمجھا گیا ہے۔

یوروپین اقوام نے اس نکتہ کو پہلے ہی سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے بزرگوں کی نادر اشیاء کو دل سے لگا کر رکھا اور اس کا جو نتیجہ نکلا وہ ظاہر ہے۔ ان عجائب خانوں نے یوروپین اقوام کو ان کے بزرگوں کے علمی کارناموں کا جائزہ لینے اور ان کے ترقی و زوال کے علمی نمونے دیکھنے اور ان سے سبق حاصل کر کے اپنی زندگی کو لازوال بنانے میں بڑی مدد دی ہے۔ یورپ کے اس علمی شغف کو دیکھ کر ہندوستان میں بھی اس کا صحیح ذوق پیدا ہو رہا ہے۔ چنانچہ نہ صرف برٹش گورنمنٹ نے ہندوستان کے مشہور شہروں میں بلکہ بعض ریاستوں نے بھی اس طرف توجہ مبذول کی ہے۔ چنانچہ ہمارے بادشاہ اعلیٰ حضرت قدر قدرت سلطان العلوم میر عثمان علی خان خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کی خسروانہ توجہ اور شاہانہ سرپرستی سے حیدرآباد میں بھی ایک عجائب خانہ کی بنا پڑ چکی ہے۔ گو یہ ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔ مگر پھر بھی کتبوں۔ قدیم اسلحہ

بیدری سامان اور مرقعوں وغیرہ کا اچھا ذخیرہ فراہم ہوگیا ہے۔ اگر سلطنت کے ساتھ ساتھ اہل ملک بھی اس طرف توجہ کریں تو یہ عجائب خانہ کم از کم ہندوستان میں بڑی اہمیت حاصل کرسکتا ہے۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اہل ملک نے اس کی خصوصیت اور اہمیت کو کماحقہ نہیں سمجھا۔ یہاں اس کا مفہوم صرف اس قدر ذہن نشین کرلیا گیا ہے کہ شام کو باغ عامہ کی روشوں پر چکر لگاتے ہوئے ایک اچٹتی ہوئی نظر سے ایک برجیوں والی سفید اور نوساختہ عمارت میں بھی چکر لگا لیا جائے۔ اور پر نیچے پھر کر اپنے دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں چند لمحے از راہ تفریح اس عمارت میں بھی گذار دئے جائیں۔ حیدرآباد اور ریاست حیدرآباد میں نادر اشیا کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اہل ملک اگر اس طرف توجہ کریں تو "قطرہ قطرہ بہم شود انبار" کے مقولے کے موافق چند ہی دنوں میں ہمارے عجائب خانے کو چار چاند لگ جائیں گے نادر چیزیں عجائب خانہ میں دیدی جائیں تو اس سے کئی فائدے حاصل ہوں گے۔ اول تو یہ کہ ہمارا عجائب خانہ صف اول میں آکر ذوق علمی کی آبیاری کرے گا۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان سے دلچسپی رکھنے والے لوگ دوسرے ممالک سے اپنی علمی تشنگی بجھانے ہمارے ہاں آئیں گے۔ تیسرے جو نوادر ادھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں اور جن کے انفرادی حالت میں تباہ ہوجانے کا احتمال ہے وہ محفوظ ہوجائیں گے چوتھے اہل ملک ان چیزوں کو دیکھ کر فائدہ حاصل کریں گے اور ان میں علمی ترقی کا ایک صحیح ذوق اور تحقیق کی ایک نئی امنگ پیدا ہوجائے گی۔

دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ مصر کے عجائب خانے ہی پر نظر دوڑائیے تو معلوم ہوجائے گا کہ اوس میں کس قدر نادر الوجود اشیا دہیا کی گئی ہیں جن سے قدیم مصری تہذیب کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ مصریوں میں مصالحہ لگا کر لاشوں کو محفوظ رکھنے کا بڑا رواج تھا۔ چنانچہ اس قسم کی ہزار ہا سال پیشتر کی مصالحہ دار لاشیں جن کو "ممی" کہتے ہیں مصر کے عجائب خانے میں موجود ہیں۔ ان لاشوں کے دیکھنے سے ہزار ہا سال پیشتر کے انسانوں کے قد و قامت اور ان کی شکل و شباہت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے فن تعمیر کی پائداری اس سے ظاہر ہے کہ ان لاشوں کے لئے جو مقبرے بنائے تھے جو اہرام مصری کہلاتے ہیں اس وقت تک حوادثات زمانہ کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے اولوالعزم بانیوں کی رفعت و تہذیب کا مظاہرہ کررہے ہیں اور ہزار ہا برس کے رازہائے سربستہ کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں لیکن موجودہ علمی تحقیق کے ذوق کا بھلا ہو کہ ان تھک کوششوں کے بعد ان رازہائے سربستہ کو بھی منظر عام پر آنا ہی پڑا۔ اور کئی ہزار برس پہلے کی دنیا کی تہذیب کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے دنیا کے ہر حصے سے جوق جوق لوگ آرہے ہیں اور اپنے حسب مراد سوتی رول کرلئے جارہے ہیں۔ اور خود مصریوں کو

جو فائدہ پہنچ رہا ہے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔

مصر سے آگے بڑھ کر اب ذرا یورپ پر نظر ڈالئے۔ آپ اس ملک کے کسی حصے میں چلے جائیے ہر جگہ آپ کو اعلیٰ درجہ کے عجائب خانے دکھائی دیں گے۔ جن سے وہاں کی علمی اور عملی ترقی کے مطالعہ کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ نقاشی کے نمونے اگر دیکھنا ہوں تو اٹلی کے عجائب خانے مانی اور بہزاد کے نقاش خانوں کو مات کریں گے۔ برلن جو علمی معلومات اور تحقیقات کا ایک بڑا مرکز ہے عجائب خانوں کی کثرت کے لئے بھی مشہور رہا ہے۔ تحصیل علم کا یہ شوق ہے کہ علم کا کوئی شعبہ ایسا نہیں کہ جس میں انہوں نے ذہانت کا اظہار نہ کیا ہو۔ علم موسیقی کی تحقیق کو انہوں نے درجہ کمال کو پہنچا دیا اور ایک عجائب خانہ میں قدیم ترین آلات موسیقی جمع کر دیے گئے ہیں اس کے علاوہ کوئی تعلیمی شعبہ ایسا نہیں کہ جس کے الگ الگ عجائب خانے موجود نہ ہوں۔ چنانچہ ایک عجائب خانہ ایسا بھی ہے جس میں ستاروں کی گردش دکھانے کا قدیم سامان بھی مہیا کیا گیا ہے۔

برلن اور پیرس سے قطع نظر کر کے اگر انگلستان کو دیکھا جائے تو عجائب خانوں کی بہتات اور نادر اشیاء کی فراوانی ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ تحقیقات علمی کے پیاسے دور دراز ملکوں سے یہاں کھنچے چلے آتے ہیں۔ وہ مومی پتلوں کو انسان سمجھ کر گفت و شنید کرتے ہیں لیکن جب ان کو اپنی آنکھوں کا قصور معلوم ہوتا ہے تو پھر حیرت میں ڈوب جاتے ہیں اور انسانی کمال پر سر دھننے لگتے ہیں۔ اور لندن میوزیم میں آ کر زمانہ قدیم کے تمدن و معاشرت کا اندازہ کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اس سے گذر کر "ولیس کلکشن" کی نادر الوجود تصاویر ان کے پیش نظر ہوتی ہیں جن کو انگلستان کے ایک امیر کبیر نے جمع کیا تھا جس کے انتقال کے بعد اس بیش بہا ذخیرہ کو اس کی بیوہ خاتون نے ملک و قوم کی فائدہ رسانی کے لئے حکومت کے سپرد کر دیا ہے۔ ایک وہ ملک ہے کہ جہاں کی خواتین بھی اپنے ملک کی قومی اور سیاسی ضروریات سے واقف ہیں اور بخوبی واقف ہیں کہ کس چیز کا کیا محل ہے لیکن ایک ہمارے یہاں کے مرد ہیں کہ جن کو فرض شناسی اور ضروریات ملکی و قومی سے ذرا سا بھی مس نہیں۔ ہمارے یہاں بھی نادر اشیاء کے انفرادی ذخیرے موجود ہیں مگر ان سے کوئی کام نہیں لیا جاتا۔ اور نہ اس بات کی اجازت ہے کہ دوسرے اس سے فائدہ حاصل کریں۔ اگر ان علمی جواہر پاروں کو پبلک کی خاطر منظر عام پر لایا جائے تو ملک اور قوم کو بے حد فائدہ پہنچے گا۔ خدا ہمارے ملک کے ایسے امراء کو توفیق دے کہ وہ مسز سر رچرڈ ولیس کی طرح کام لے کر بقائے دوام حاصل کریں۔

علم و تعلیم کی ترقی کے ساتھ ساتھ عجائب خانوں کی تحریک بھی ایک نئی صورت اختیار کر چکی ہے۔

اور یہ مان لیا گیا ہے کہ علمی تعلیم کے لئے عجائب خانوں کا وجود لازم ہے۔ صرف وہی کتب کو پڑھ لینے سے دماغی نشوونما میں وہ جلا نہیں آسکتی جو ان چیزوں کے مشاہدہ سے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کنڈرگارٹن کے تعلیمی اصول نے بچوں کے ذہنی ارتقا میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اس کا اصول یہی ہے کہ بچوں کو مختلف چیزوں کے نمونوں، تصویروں اور کھیلوں کے ذریعہ سے تعلیم دی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کا دماغ کتابوں کے بوجھ سے ایک حد تک بے نیاز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسی مشاہدہ کا ایک جزو عجائب خانہ ہے۔ لندن میوزیم پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ مشاہدہ کرانے کے لئے اور حقیقی جذبہ علمی پیدا کرنے کے لئے کس قدر تیاریوں کے ساتھ ہر ایک شعبہ کو مکمل کر دیا گیا ہے۔ صرف لائبریری کی کتابوں کی تعداد بیس ۲۰ پچیس ۲۵ لاکھ کے قریب ہے۔ علاوہ ازیں یہاں پر مصر و یونان و روم وغیرہ وغیرہ کی نادر اشیا کا بھی کافی ذخیرہ موجود ہے۔ شعبہ حیوانات، شعبہ نباتات، شعبہ معدنیات اور شعبہ ارضیات وغیرہ کے متعلق کثرت کے ساتھ مواد موجود ہے۔

یورپ نے اس باب میں جو ترقی کی ہے۔ وہ تو آپ اپنی نظیر ہے۔ لیکن امریکہ نے اس میں جو موشگافیاں کی ہیں وہ یورپ سے بھی سبقت لے گئی ہیں۔ اس نے عجائب خانوں کے اصول و اصل کو سمجھ لیا ہے اور اس سے فائدہ اٹھا کر علمی تعلیم کی طرف جو قدم اٹھایا ہے اس کی وجہ سے قصر تعلیم میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا ہے۔ وہاں پر سفری عجائب خانے قایم کئے گئے ہیں جو ملک کے ہر حصے میں اپنی چیزوں کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ امریکہ میں ایک ہزار سے زیادہ عجائب خانے ہیں۔ جن میں سے "دی فیلڈ میوزیم آف نیچرل ہسٹری چکاگو" کو دنیا میں بڑی شہرت حاصل ہے۔ عام طور پر امریکہ کے عجائب خانے چار حصوں پر منقسم ہیں۔ (۱) تاریخ (۲) مصوری و نقاشی۔ (۳) سائنس (۴) صنعت و حرفت۔ تاریخی عجائب خانے تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ امریکہ کی اڑتالیس ریاستوں میں سے ہر ایک میں تاریخی انجمن ضرور موجود ہے۔ مصوری، نقاشی اور سائنس کی انجمنیں بھی اکثر مقامات پر قایم ہیں اور ترقی کر رہی ہیں۔

صنعت و حرفت نے عجائب خانوں کی سرزمین میں بالکل نیا قدم رکھا ہے۔ اور ان کی تعداد ابھی بہت کم ہے۔ مگر مشینوں کی فراوانی سے صنعت و حرفت کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ عجائب خانوں کے نقاد صنعت و حرفت کے کارناموں کو بھی ایک ممتاز جگہ دے رہے ہیں۔ سائنس کی تحقیقات کیلئے امریکہ کے نیشنل میوزیم سے بہتر کوئی عجائب خانہ نہیں۔ اس کے صرف ایک شعبۂ اقتصادی ارضیات میں پانچ لاکھ سے زیادہ مختلف قسم کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ جو دنیا میں لاثانی ہیں۔

نیشنل میوزیم میں اگر ہمیں ایک طرف امریکہ کے تاریخی نوادر نظر آتے ہیں تو دوسری طرف ریلوے انجن اور اس کی تدریجی تبدیلیوں کا پورا سامان پیش نظر ہوتا ہے۔ اس عجائب خانہ میں جمع شدہ اشیاء کی قیمت اندازہ سے مستغنی ہیں۔ کیا جارج واشنگٹن کی تلوار کو کوئی دولت خرید سکتی ہے؟۔

امریکہ میں دو طرح کے عجائب خانے ہیں۔ قومی اور ذاتی یا انفرادی۔ قومی عجائب خانے پبلک خرچ پر قایم کئے گئے ہیں اور ان کی دیکھ بھال اور انتظام حکومت کرتی ہے بعض اوقات پرائیویٹ فیاضی سے عجائب خانہ قایم ہوجاتا ہے۔ شہر واشنگٹن کا مشہور "اسمتھ یونین انسٹیٹیوشن" مسٹر اسمتھسن کے پرائیویٹ ذوق وشوق کی یادگار ہے۔ پانچ لاکھ ڈالر اس کی آمدنی کے لئے وقف کردیئے گئے ہیں لیکن اس کو قومی ادارہ بنانے کے لئے امریکہ کی کانگرس کو اس کی برابر امداد کرنی پڑتی ہے۔ اگر حقیقت پوچھو تو اسمتھسن اپنا نیک نام ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا۔ تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں اس کے نیک کام سے فائدہ حاصل کریں اور اس کی نیکی کی پیروی کرکے ملک وقوم کو فائدہ پہنچائیں۔

امریکہ کے عجائب خانوں میں جو خوبی ہے دنیا کے کسی اور عجائب خانے میں نہیں وہ یہ کہ یہاں عجائب خانوں کو عملی تعلیم کا ایک ذریعہ تسلیم کرلیا گیا ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے عجائب خانوں میں نمائشی چیزوں پر لیکچر دیے جاتے ہیں۔ مدرسین کے لئے نصاب مخصوص ہے۔ شام کو بچوں کی جماعتیں بھی ترتیب دی جاتی ہیں۔ ان لیکچروں کے ذریعہ جو تعلیم دی جاتی ہے۔ اس میں بہت سے مدرسوں کے طلباء شریک ہوتے ہیں۔ اس میں وسعت پیدا کرنے کے لئے طلباء کو کئی کئی ٹکڑیوں میں لیجاکر اشیاء متعلقہ سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ تاکہ جو مضمون زیر بحث تھا اس کو بہ نظر خود بھی دیکھ لیں۔

علم کے عام کرنے میں امریکہ والے جو کوشش کررہے ہیں اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ آنکھ والے تو تماشہ دیکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اندھوں کو بھی اس لطف سے محروم نہ رکھا۔ چنانچہ نیچرل ہسٹری (تاریخ طبعی) کا جو عجائب خانہ نیویارک میں ہے اس نے اندھوں کی تعلیم کا خاص انتظام کر رکھا ہے۔ اور وہ بھی عام طلباء کے دوش بدوش ایک ہی مدرسے میں تعلیم پاتے ہیں۔ ان کے گروپ بنادئے گئے ہیں اور ان کی نگرانی ٹرینڈ اساتذہ کرتے ہیں۔ امریکہ کے عجائب خانوں نے ان بچوں کی تعلیم میں بڑی سہولتیں پیدا کردی ہیں۔ پہلے ان کو زبانی تعلیم دی جاتی ہے۔ بعد ازاں یا تو ان کو اصلی چیزیں دکھائی جاتی ہیں یا اُن کے نمونے دے جاتے ہیں چونکہ اندھے بچے اپنے اردگرد کی چیزوں کو صرف چھو کر تمیز کرسکتے ہیں۔ اس لئے امریکہ کے عجائب خانوں میں ان کو جانوروں۔ چڑیوں۔ پھولوں اور دھاتوں کے متعلق عملی تعلیم حاصل کرنے کا بڑا

موقعہ حاصل رہتا ہے۔ عجائب خانوں کے کاربرداز ان بے چارے بچوں کے ساتھ بڑی ہمدردی سے کے ساتھ پیش آتے ہیں اور ہر طرح کی ممکنہ سہولتیں ان کو مہیا کر دیتے ہیں۔ ان کی اس ہمدردی کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک لاچار مخلوق بھی علم کی نعمتوں سے محروم نہیں رہنے پاتی۔ اگرچہ یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ اس قسم کی تعلیم خود دماغ کی طرح سطحی نظروں سے پوشیدہ ہوتی ہے لیکن طلبہ کی آیندہ زندگی پر اس تعلیم کے نتائج کا بڑا زبردست اثر پڑتا ہے۔

ہمارے یہاں کس قدر بچے آنکھوں کی نعمت عظمیٰ سے محروم رہتے ہیں۔ مگر کوئی ان کی خبر نہیں لیتا۔ مسلمانوں میں بہت ہی کم ایسے ہوتے ہیں جنہیں قرآن شریف حفظ کرا دیا جاتا ہے۔ مگر عام طور پر ان کی زندگی اس قدر خوش گواری کے ساتھ بسر نہیں ہوتی جس قدر کہ ان ہی جیسے انسانوں کی زندگی امریکہ یا یورپ میں بسر ہوتی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ قوم کی وہ مخلوق جس کو بیکار محض سمجھ لیا گیا ہے اس کو بھی باکار اور حوصلہ مند بنانے کے لئے کوشش کی جائے۔ ہندوستان میں اس اہم مسئلہ پر بہت کم غور و فکر کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ مسئلہ زیر بحث ضرور آچکا ہے۔ چنانچہ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم و مغفور نے اس جانب ملک کی رہنمائی فرماتے ہوئے اعلیٰ پیمانے پر اپنے والد صاحب کی یادگار میں "مدرسہ نابیناں" علی گڑھ میں قایم کر دیا۔ مدرسہ کی عمارت بورڈنگ ہاوس اور مدرسین کے مکان سب انہوں نے اپنے سامنے بنوا دیے تھے۔ ان اندھے بچوں کو کرسیاں بنانا لکڑی اور دوسری چیزوں سے سامان بنانا وغیرہ سکھایا جاتا ہے۔ حساب اور اُردو کی تعلیم بھی ایک خاص قسم کے اُبھرے ہوئے الفاظ اور ہندسوں میں دی جاتی ہے۔ وہاں اندھے اساتذہ کو اندھے بچوں کی تعلیم میں مشغول دیکھ کر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔ بچوں کو موسیقی بھی سکھائی جاتی ہے اور ان کے لئے کھیل کود کا بھی خاص طور پر انتظام کیا گیا ہے۔ جس وقت وہ کھیل میں مشغول نظر آتے ہیں تو ان میں زندگی اور خوشی کا ایک جذبہ موجزن نظر آتا ہے۔

اب ضرورت ہے کہ حکومت اور عوام اس ضروری مسئلہ پر غور کریں اور اس لاچار مخلوق کے لئے بھی عملی زندگی بسر کرنے اور خوش خرم رہنے کا کوئی سامان بہم پہنچایا جائے۔

امریکہ میں تعلیمی سہولتیں اس قدر پیدا کر دی گئی ہیں جس کی وجہ سے وہاں جاہل نام کو بھی نہیں ملتا۔ امریکہ کے عجائب خانوں نے عملی تعلیم کا جو مظاہرہ کر رکھا ہے وہ دنیا میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے خصوصیت رکھتا ہے۔ ان عجائب خانوں نے اپنے یہاں کے مدارس سے بڑا زبردست اتحاد عمل قایم کر لیا ہے چنانچہ "فیلڈ میوزیم آف جیکاگو" جس میں ہزاروں بلکہ لاکھوں نادر اشیاء موجود

ہیں وہ اپنے یہاں کی چیزوں کو مدارس میں بھیجتا ہے۔ ان چیزوں سے تقریباً چار سو مدارس فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔ اس طرح کہ تعطیل موسمی کے بعد جب اسکول کھلتے ہیں تو کچھ مدارس میں نمائشی اشیاء بھیجدی جاتی ہیں۔ دو مہینے گذرنے کے بعد اُس مدرسہ سے ان چیزوں کو دوسری جگہ روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اور میوزیم سے دوسری اشیاء پھر یہاں بھیجدی جاتی ہیں۔ اس طرح ہر مدرسہ میں یکے بعد دیگرے مختلف اقسام کی چیزیں طلباء کی نظروں سے گذرتی رہتی ہیں۔ ان چیزوں کے مشاہدہ اور مطالعہ کا طلباء کی ذہنیت پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس طریقہ عجائب خانہ اور مدارس ایک دوسرے سے قریبی طور پر ایک رشتہ میں منسلک ہو جاتے ہیں۔

ان اشیاء کی نمائش پبلک مدارس تک ہی محدود نہیں بلکہ ان سے خانگی مدارس، یتیم خانے اصلاحی ادارے اور عام کتب خانے بھی متمتع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اکثر و بیشتر ان چیزوں کی نمائش سلطنت متحدہ امریکہ سے دوسرے مقامات اور کناڈا کے مختلف شہروں میں بھی کی جاتی ہے۔ ان عجائب خانوں کے متعلق جاپان اور انگلستان میں بھی بڑی دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ امریکہ والوں کا عجائب خانوں کے متعلق موجودہ تخیل دنیا بھر میں مخصوص حیثیت رکھتا ہے۔

ان اشیاء کے نمائش کے علاوہ "فیلڈ میوزیم" لینٹرن سلائڈز اور تعلیمی متحرک تصاویر بھی طلباء کی تعلیم کی خاطر مہیا کرتا ہے۔ جن کے ذریعہ قدرتی مناظر۔ تاریخی واقعات اور انسانی اولوالعزمی و بہادری کے کارناموں کو پیش کیا جاتا ہے۔ ان کی وجہ سے تعلیمی اسباق میں جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بہت سے ایسے مضامین ہیں جن کی تعلیم صرف کتابوں کی حد تک محدود ہے وہ مضمون خشک رہ جاتا ہے اور طلباء کو دلچسپی نہیں پیدا ہو سکتی۔

پبلک کی فائدہ رسانی کا جذبہ اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ ان عجائب خانوں میں آنے جانے اور وہاں کے لکچروں میں شریک ہونے کی کوئی فیس نہیں لی جاتی بلکہ ان کے مہتمموں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس قدر ممکن ہو سکے آسانیاں بہم پہنچائی جائیں تاکہ ان سے زیادہ لوگ فائدہ حاصل کر سکیں۔

یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ عملی تعلیم کی اس فراوانی کو شروع ہوئے صرف پچیس سال ہوتے ہیں۔ اس قلیل عرصہ میں ان عجائب خانوں نے امریکہ کی تعلیمی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا ہے امریکہ کی "مجلس عجائب خانہ" نے اس معاملہ میں بڑا حصہ لیا ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ باقاعدہ طریقہ پر

عجائب خانوں سے کام لیا جائے۔ چنانچہ اسے خاطرخواہ کامیابی حاصل ہوئی اور اس کا دائرہ عمل اس قدر وسیع ہوگیا ہے کہ اس کی شاخیں ملک کے ہر گوشے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اب اس کا حلقہ اثر امریکہ سے نکل کر یورپ و جاپان تک پھیل چکا ہے۔ جس کا یہ نتیجہ ہے کہ یہ سب ممالک ایک رشتہ میں منسلک ہوگئے ہیں۔ اب دنیا کے کسی حصے میں اگر کوئی نادر چیز منظر عام پر آتی ہے تو اس کی خبر اس انجمن کو فوراً مل جاتی ہے۔ اس طرح یہ ممالک ایک دوسرے کے نوادر سے باخبر رہتے ہیں۔

ہمارے یہاں بھی انجمن اساتذہ حیدرآباد کی جانب سے مدرسین و طلبہ کو شوق دلانے کے لئے سالانہ کانفرنس کے ساتھ تعلیمی نمایش کے قیام کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ جو عملی تعلیم کی طرف ایک عمدہ اور مبارک اقدام ہے۔ اس وجہ سے کہ مقامی مدارس کے طلبہ کو اس نمایش سے استفادہ کی اجازت دی جاتی ہے لیکن اس انتظام میں کسی قدر اصلاح کی ضرورت ہے۔ کوئی ایسا پروگرام رکھا جائے کہ اساتذہ صاحبان طلبا کی رہنمائی کریں۔ ہر چیز کی ماہیت طلبا کے ذہن نشین کرانے اور سمجھانے میں حصہ لیں تو اس کا اثر طلبا کی ذہنی استعداد پر بہت اچھا پڑے گا۔ علاوہ ازیں تاریخ وجغرافیہ کے متعلق بطور خاص اشیا کی فراہمی کا انتظام بھی ضروری ہے اور ان کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ جن سے عہد بہ عہد کے حالات کا صحیح خاکہ نظر آجائے۔

ہمارے خیال میں امریکہ کی طرح اگر حیدرآباد میں بھی ایک مرکزی گشتی عجائب خانہ کا قیام سررشتہ عالیہ تعلیمات سرکار عالی کی جانب سے عمل میں آئے تو اس طرح عملی تعلیم کا ایک نیا باب نہ صرف ریاست ابد مدت میں بلکہ ہندوستان کی تعلیمی دنیا میں کھل جائے گا۔ خدا کے فضل وکرم سے حیدرآباد میں مدارس کی کافی تعداد موجود ہے اور ابتدا میں یہاں اس کا تجربہ بہت آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ اس مرکزی عجائب خانے کی اشیا مدارس میں گشت کرتی رہیں اور ان اشیا پر متعلقہ اساتذہ صاحبان اپنے یہاں کے طلبہ کے سامنے لکچر دیا کریں تاکہ طلبا کو ان چیزوں کی ماہیت سمجھنے میں آسانی ہو اگر یہ صورت حوصلہ افزا ثابت ہوتی تو اضلاع کے مدارس کو استفادہ کا موقع دیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک عام سالانہ نمایش کا قیام بھی عمل میں لایا جائے اور اس کے لئے جملہ مدارس کے طلبا کی بنائی ہوئی اشیا فراہم کی جائیں بعد نمایش ان اشیا کو مرکزی عجائب خانہ میں تبدیل کردیا جائے۔ اس طرح طلبا کی ذہنی استعداد کی تدریجی ترقی کا خاصہ مواد ہمارے پاس جمع ہوتا جائے گا۔

کہا گیا ہے کہ روم ایک دن میں نہیں بنا بلکہ رومی تمدن کو ترقی کرنے کے لئے صدیاں درکار ہوئیں اس طرح یہ کام استقلال اور امتداد زمانہ کا متقاضی ہے۔ اس لئے سررشتہ تعلیمات وقت کی اہمیت کے مدنظر اس قسم کی عملی تعلیم کی اشاعت اور اس کی ترقی میں کوشش کرے تو یہ مخلوق خدا کی ایک ایسی خدمت ہوگی جس سے آیندہ نسلیں فوائد عظیم حاصل کرینگی اور تعلیم کے ایک صحیح اصول کو اختیار کرکے تعلیمی دنیا کے ارتقا میں متمدن ممالک کا ساتھ دے سکیں گی۔ اس میں شک نہیں ہر بڑے کام کی طرح اس کام کے لئے بھی عزم و استقلال کی ضرورت ہے۔ اگر اس طرف سررشتہ تعلیمات استقلال کے ساتھ قدم اٹھائے تو خدا وہ دن جلد دکھائے گا۔ کہ اُسے اس کام میں ہر طرح کی کامیابی آسان نظر آئے گی۔ فقط

روسو کے مختصر حالات اور تعلیمی نظریات

از

(محمد عبدالشکور خاں مددگار مدرسہ فوقانیہ بیڑ)

رُوسو فرانس کا ایک نامور ماہر تعلیم، فلسفی اور مدبر گزرا ہے۔ ۱۷۱۲ء میں وہ جینوا کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس کا باپ جینوا میں گھڑی سازی کا پیشہ کیا کرتا تھا۔ روسو کو پیدا ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ اس کی مادرِ شفقت کا سایہ اس کے سر سے اُٹھ گیا۔ چونکہ اس کا باپ ایک کمزور طبع جذباتی شخص تھا۔ اس لئے اس کی ابتدائی تعلیم کی طرف سے غایت درجہ بے التفاتی برتی گئی۔ دس سال کی عمر تک وہ باپ ہی کی زیر تعلیم رہا۔

رُوسو کو تحصیل علم کا بڑا ذوق تھا۔ فسانے اور ناول اس کے خاص مطالعہ کی چیزیں تھیں اس نے گرجوں کی تاریخیں اور پلوٹارک کے سوانح حیات کا خوب مطالعہ کیا تھا۔ اسی قسم کے ابتدائی مطالعہ نے اس کے خیالات کو انتہا پسند بنا دیا تھا۔

اس کے باپ کے ترک وطن کے بعد وہ ایک پادری کے پاس باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے لگا۔ یہاں دو سال تک اپنے استاد کی صحبت میں رہکر اس نے دیہاتی زندگی سے الفت پیدا کرلی اول اول اس کو ایک مذہبی پیشوا بننے کا شوق پیدا ہوا جس کے لئے کئی سال کی مسلسل تعلیم کی ضرورت

تھی مگر بہت جلد اس کا یہ خیال بدل گیا۔ اب اس نے ایک ادارۂ بلدیہ میں منشی کی خدمت اختیار کرلی۔ یہاں بھی وہ زیادہ عرصہ نہ ٹکا اور خیالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ منشی سے نقاش بن گیا۔ اس کی بدنصیبی دیکھئے کہ اس پیشہ میں بھی وہ کامیاب نہ ہوسکا۔

سولہ سال کی عمر میں وہ فرانس پہنچا۔ یہاں کچھ عرصہ بیکار رہنے کے بعد اس نے خانگی مدرسی کا پیشہ اختیار کرلیا۔ مگر یہ کام بھی زیادہ عرصہ نہ کرسکا۔ پھر دس سال تک تلاش روزگار میں سرگرداں اور مفلوک الحال پھرتا رہا۔ آخر ایک متمول فرانسیسی نے اپنے دو بیٹوں کی تعلیم کے لئے اس کو مقرر کیا۔ ایک سال تک وہ یہ خدمت انجام دیتا رہا۔ مگر ناکامی اور نامرادی نے یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا اور اس کو اس خدمت سے دست بردار ہونا پڑا۔

اب وہ پایۂ تخت کی طرف روانہ ہوا۔ پیرس میں وہ چند اعلیٰ طبقہ کی خواتین سے ملا جنہوں نے اس کی بے چارگی اور بے کسی دیکھ کر اس کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ صنف نازک کا اثر فرانس کی حکومت اور سیاسی حلقوں میں بڑا زبردست تھا۔ ان خواتین کی سفارش سے فرانسیسی سفیر نے روسو کو اپنا معتمد بنالیا۔ کچھ عرصہ تک وہ اپنے فرائض حسن وخوبی سے انجام دیتا رہا۔ مگر سچ یہ ہے کہ قضا و قدر کے آگے کسی کا کچھ نہیں چلتا۔ فطرت انسانی اپنا جلوہ دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہاں بھی وہ ایک مناقشہ کا شکار ہوا اور خدمت سے بہ مجبوری علٰحدگی اختیار کرنی پڑی۔ اس وقت وہ نہایت مفلس اور قلاش ہوگیا تھا اور یہ اشعار اس کے حسب حال تھے:۔

میری خواری کے رتبہ کا کمال اوج تو دیکھو	کہ ہے چرخ زحل بھی سایہ بخت دژم میرا
وہ ہوں میں آتشین گل تازہ نخل شمع الفت کا	نہیں ہے کوئی گل چیں غیر مقراض ستم میرا

اب اس نے قلم کو اپنا معاون بنایا اور ایک انعامی مضمون لکھا جس کا عنوان تھا کہ "آیا سائنس اور دیگر علوم وفنون اخلاق سنوارتے ہیں یا بگاڑتے ہیں؟" اس مضمون میں اس نے آخر الذکر خیال کی تائید کی تھی۔ دوسرا مضمون اس نے انسانوں کے عدم مساوات پر سپرد قلم کیا اور اس میں سوسائٹی کو مخرب اخلاق ثابت کیا۔ ۱۷۶۱ء میں حکومت فرانس کے خوف سے وہ جینوا بھاگ گیا۔ اب اس کی تصانیف کا دور شروع ہوگیا تھا۔ اس کے علم وفضل کا آوازہ دور پھیل گیا تھا۔ انگریز فلسفی ہیوم نے بھی اس کو انگلستان آنے کی دعوت دی تھی۔ آخر عمر میں وہ پیرس واپس آگیا تھا۔ ۱۷۷۸ء میں یہ بڑا فلسفی اور ماہر تعلیم اس دار المحن سے رخصت ہوگیا۔

روسو کے نظریات۔ روسو کے نظریات اس کی زندگی کے تجربات کا نتیجہ ہیں اور ان میں عقل

کی بجائے جذبات کو زیادہ دخل ہے۔ اس کا مقولہ تھا کہ خدا نے تمام چیزیں اچھی بنائیں ہیں مگر انسان ان میں مداخلت کر کے خراب کر دیتا ہے۔ تاہم تعلیم نہایت ضروری چیز ہے۔ بہترین تعلیم یافتہ وہ شخص ہے جو زندگی کے آلام و خوشیاں بہترین طور پر برداشت کر سکتا ہے۔

اس کا پہلا علمی کارنامہ وہ انعامی مضمون تھا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ دوسرا مضمون انسانوں کی عدم مساوات پر تھا اس میں اس نے ایک فرضی قدیم سوسائٹی کا خاکہ کھینچا تھا۔ یہی آگے چل کر انقلاب فرانس کی بنیادی تعلیم اور آزادی کا اعلان ثابت ہوا۔ اس کا سب سے بڑا ادبی اور تعلیمی شاہکار ایمیل ہے۔ یہ ایک طویل داستان بطرز ناول ہے جو نصائح اور ہدایات سے پُر ہے۔ اس میں ایک بچہ کی تعلیم فطرت کے مطابق ایک خیالی سوسائٹی میں ایک فرضی استاد کی زیر نگرانی کی گئی ہے۔ اس میں جو نظریات اس نے پیش کئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

تعلیم کا مقصد دل و دماغ اور قوت فیصلہ کی تربیت ہے۔ اس کے خیال میں عمل علم سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ہر بچہ کے فطری رجحانات کو وہ زیادہ قابل ستائش خیال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے فرضی شاگرد ایمیل کو سوسائٹی سے علحدہ رکھ کر تعلیم و تربیت کرنا چاہتا ہے۔ مذہب و اخلاق کی درستی کے لئے وہ غیر رسمی تعلیم کو زیادہ ضروری سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تحصیل علم عمل کے ذریعہ سے ہوتی ہے نہ کہ راست تعلیم سے۔ اس کے نظام تعلیم میں اخلاق اور منطق کی تعلیم کا وقت سن بلوغ کے بعد ہے۔

وہ کہتا ہے کہ علم کی ابتدا اس وقت ہوتی ہے۔ جب ہم زندگی بسر کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ لوگ اپنے بچوں کی زندگی کے تحفظ میں متفکر ہیں۔ لیکن حقیقت میں ان کو چاہیئے کہ بچوں کو خود اس کی حفاظت کرنا سکھائیں۔ بچوں کے معلم کو خود بچہ بن جانا چاہیئے۔ استاد بچوں کو نصیحت نہ کرے بلکہ ان کو خود اپنے تجربات سے نصیحت حاصل کرنے کا موقع دے۔

بیمار اور کمزور بچہ کسی تعلیم سے اثر پذیر نہیں ہو سکتا۔ اگر تم کو حقیقی بہادر کی تلاش ہے تو وہاں جاؤ جہاں ڈاکٹر نہ ہوں۔ جہاں مُلا نہ ہوں اور جہاں فلسفی نہ ہوں۔ کیونکہ ڈاکٹر اپنی ہدایات فلسفی اپنے نظریات اور مُلا اپنے مواعیظ سے انسانوں کے دلوں کو کمزور اور موت سے خوف زدہ کر دیتے ہیں۔ اعتدال اور محنت تمام امراض کا علاج ہے۔ کام بھوک پیدا کرتا ہے اور اعتدال اس کو قابو میں رکھتا ہے۔

بچوں میں شرارت کمزوری سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کو طاقتور بنا دو اور تمام شرارت

دور ہو جائیگی۔ بچوں کی حقیقی ضروریات کا خیال رکھو۔ دیگر خواہشات کے لئے ان کو خود تمہارے پاس آنے دو۔ ان کو زیادہ بکواس کے لئے مجبور نہ کرو۔ جب حاجت ہوگی وہ خود باتیں کریں گے بچوں کو بہت سے الفاظ سکھانا درآں حالیکہ ان کے خیالات کا سرمایہ غایت درجہ کم ہو بہت بڑی غلطی ہے۔ دہقان لوگ جو شہریوں سے زیادہ عملی ہوتے ہیں اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اُن کے پاس الفاظ کی پُونجی تھوڑی ہوتی ہے۔

جب ایمیل کی اشاعت ملک میں ہوئی تو ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی اس لئے کہ جو طریقہ تعلیم اس میں پیش کیا گیا تھا وہ مروجہ تعلیم کے بالکل برعکس تھا۔ روسو نے اپنے نکتہ چینوں کو ان الفاظ میں جواب دیا تھا "میری تعلیم کا مقصد بچہ کو سست و کاہل بنانا نہیں ہے بلکہ اس کے فطری قویٰ اور رجحانات کو بروئے کار لانا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ بچہ کی مرضی کو ٹھکرایا جائے۔ بلکہ اس کو سنجیدہ کار اور استوار کرنا چاہیئے۔ میری تعلیم نیکی نہیں سکھاتی بلکہ بُرائی سے بچاتی ہے۔ وہ صداقت پیدا نہیں کرتی بلکہ غلطی سے محفوظ رکھتی ہے"۔

رُوسو کے خیالات کی کنہ تک پہنچنا ذرا مشکل ہے۔ اس کی تعلیم کے حقیقی مقصد کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس زمانہ کے تاریخی حالات اور رسم و رواج سے واقفیت حاصل کی جائے۔ جب کہ اس نے ایمیل تصنیف کی تھی۔

عجائباتِ قدرت

قدرت کے کمالات و عجائبات کی حد نہیں۔ ہزارہا سال سے انسان تجسس و تحقیق میں مشغول ہے۔ تاہم ہنوز روزِ اول نظر آتا ہے۔ آئے دن ایسے عجیب و غریب انکشافات ہوتے رہتے ہیں کہ بڑے بڑے عقلا حیران رہ جاتے ہیں۔ اور قدرت کی نیرنگیاں دیکھ کر بے ساختہ منہ سے نکل جاتا ہے۔ ع داماں نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار۔

مثلاً قدرت نے مچھلی کو ایک آبی جانور بنایا ہے۔ یہ ہمیشہ پانی ہی میں رہتی ہے۔ پانی سے نکلی کہ اس کی جان پر بن آئی۔ ماہی بے آب کی تڑپ مشہور ہے۔ مگر یہ سن کر تعجب ہوگا کہ مچھلیاں پانی کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہیں۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ دنیا میں ایسی مچھلیاں بھی ہیں جو پانی سے باہر آتی ہیں۔ مینڈک کی طرح خشکی پر چلتی ہیں اور پرندوں کی طرح ہوا میں پرواز کرتی ہیں۔

چلنے والی مچھلی
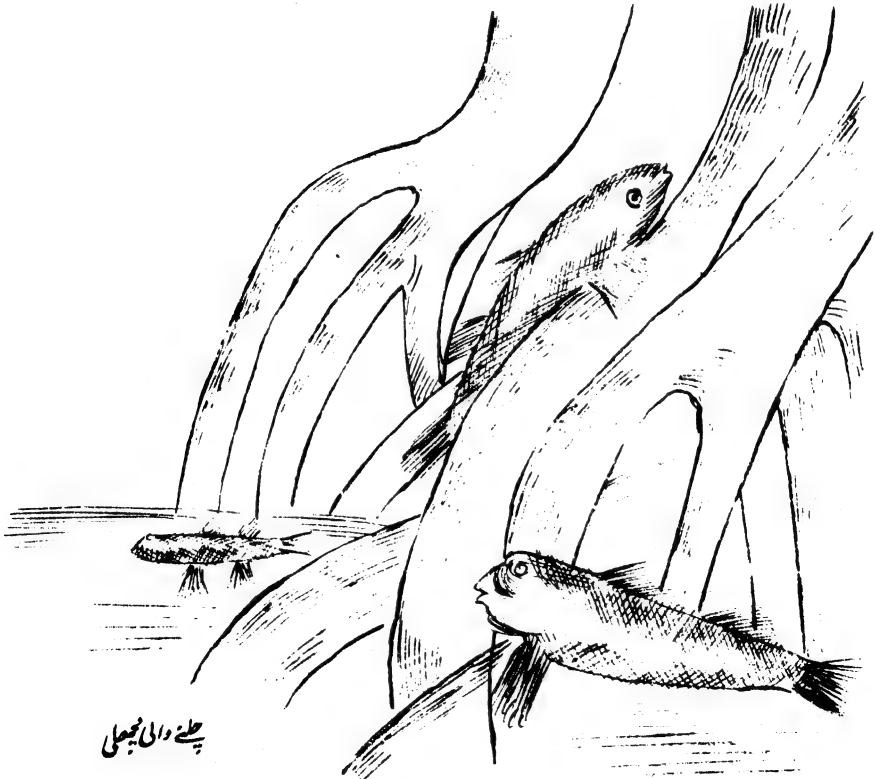
علیٰ ہذا پرندوں کے علاوہ بعض چوپائے بھی ایسے ہیں جو ہوا میں اُڑتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو انڈے دیتے ہیں یا پرندوں کی طرح درختوں پر گھونسلے بناتے ہیں۔

کیلیفورنیا اور جزائر شرقیہ کے قریب خط سرطان سے گذرتے ہوئے اکثر مچھلیاں ہوا میں اڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ مچھلیاں ہیرنگ مچھلی (Herring) کی شکل کی ہوتی ہیں۔ البتہ ان کے سینہ کے پنکھڑے زیادہ بڑے ہوتے ہیں۔ اور پرندکے بازوؤں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے اُوپر کے چھلکے چاندی کے مانند چمکدار ہوتے ہیں۔ جب ان مچھلیوں کے غول کسی جہاز کے قریب سے اڑتے ہوئے گذرتے ہیں تو اُن کے بازوؤں کے رُوپہلی چھلکے دیکھنے والوں کو جواہرات کی طرح جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بعض مچھلیاں ایسی ہیں جو پرواز کر سکتی ہیں۔ مثلاً تیتری مچھلی جو دریائے وکٹوریا اور کیمرون میں پائی جاتی ہے اس کے بازو بالکل تیتری کے پروں سے ملتے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے اُس کو تیتری مچھلی کہتے ہیں۔ گرنرڈ gurnard اسی قسم کی ایک دوسری مچھلی ہے جو اکثر بحرِ روم میں اڑتی ہوئی دیکھی گئی ہے۔

اڑنے والی مچھلی (گرنرڈ)

اڑنے والی مچھلی

بعض مچھلیاں مینڈک کی طرح خشکی اور پانی دونوں میں رہتی ہیں۔ ان مچھلیوں کے صرف تین اقسام ملے ہیں جو افریقہ۔ اسٹریلیا اور جنوبی امریکہ کے ان دریاؤں میں پائی جاتی ہیں جو خط سرطان کے قریب گذرتے ہیں۔ سانس لینے کے لئے ان مچھلیوں کے گلپھڑوں کے علاوہ پھیپڑے بھی ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے یہ خشکی پر بھی رہ سکتی ہیں۔

مغربی افریقہ کی دلدل پر پھدکنے والی مچھلی کو چلنے والی مچھلی (walking fish
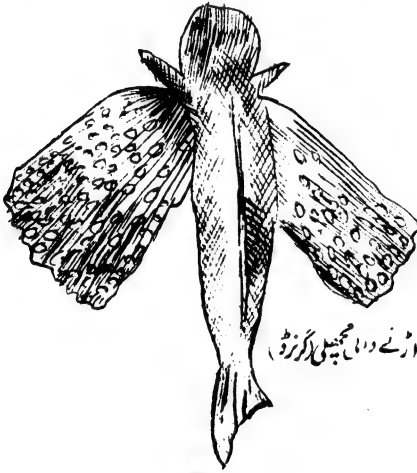
بھی کہتے ہیں۔ یہ ایشیا اور آسٹریلیا کے بعض دریاؤں کے دہانوں کے قریب دلدل میں بھی ملتی ہے
یہ مچھلیاں بہت چھوٹی ہوتی ہیں۔ ان کے غول اکثر پانی سے نکلکر دلدل پر آجاتے ہیں۔ ان مچھلیوں
کے صدری پنکھڑے عضلاتی اور مضبوط ہوتے ہیں۔ جن کی ساخت کچھ مینڈک کے پاؤں کی طرح
ہوتی ہے۔ اس وجہ سے یہ مچھلیاں دلدل پر پھدک سکتی ہیں۔ پانی سے نکل کر اپنا سر اوپر کو اٹھا
کر چلتی ہوئی
بہت ہی عجیب
معلوم ہوتی
ہیں۔ اٹھا ہوا
سر ابھری ہوئی
آنکھیں جونکوں
کی طرح پھٹی

دلدل پر پھدکنے والی مچھلی

ہوئی اور پریشان۔ بڑا مضحکہ آمیز منظر ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی ہنسی آجاتی ہے۔ یہ مچھلیاں درختوں پر
بھی چڑھ سکتی ہیں۔ انسان سے بہت جلد اتنی مانوس ہو جاتی ہیں کہ خود بخود ہاتھ پر آبیٹھتی ہیں

افریقہ میں دلدل میں رہنے والی ایک اور مچھلی پائی جاتی ہے جسے پیروٹوپیرن (Protopterus
annectens) کہتے ہیں۔ موسم گرما میں جب جھیلوں اور دریاؤں کا پانی خشک ہو جاتا ہے تو یہ دلدل
کے اندر گھس جاتی ہے۔ اس کے اوپر لیس دار چکنے مادے کی ایک تہ آجاتی ہے جب دلدل
سوکھ کر خشک ہو جاتی ہے تو اس کے اوپر ایک کویہ (Cocoon) سا بنجاتا ہے۔ جس
میں ہوا آنے کے لئے ایک سوراخ کھلا رہتا ہے۔ کیونکہ اس دوران میں مچھلی برابر اپنے
پھیپھڑوں سے جو دو ہوائی پھکنوں کی طرح ہوتے ہیں سانس لیتی ہے۔

جنوبی امریکہ کی پھیپھڑے والی مچھلی لیپیڈاسرن (Lepidosiren) کہلاتی ہے
اکثر دریائے امیزن کی وسیع دلدل میں گھنے گھاس کے اندر رینگتی پھرتی ہے۔ یہ مچھلی تقریباً ۴ فٹ
لمبی ہوتی ہے۔ اس کا جسم مضبوط اور گٹھا ہوا ہوتا ہے۔ دم نوکدار ہوتی ہے۔ سیانہ پنکھڑا پیچھے
دم کے اطراف تک چلا جاتا ہے اور آگے گردن تک پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ باقی پنکھڑوں کے دو جوڑ
گاؤدم ریشے کی طرح ہوتے ہیں۔ اس کے چھلکے چھوٹے چھوٹے اور کھال کے اندر پیوست ہوتے
ہیں۔ یہ زیادہ تر گھونگے کھاتی ہے جن کو اپنے سخت جبڑوں سے پیس ڈالتی ہے۔ بھوڑے

تھوڑے وقفے کے بعد اپنے پھیپڑوں میں ہوا بھرنے کے لئے سطح پر آتی ہے۔ موسم گرما کی آمد پر دلدل کے اندر ایک نالی نما سوراخ کر کے اس میں سو جاتی ہے۔ اور اُس کا دہانہ مٹی سے بند کر لیتی ہے۔ موسم برسات آنے پر دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہے۔ اب یہ زمانہ اس کے بیانے کا ہوتا ہے۔ چنانچہ دلدل میں چھوٹے چھوٹے گڑھوں کے اندر انڈے دیتی ہے۔ جب ان میں سے بچے نکل آتے ہیں تو نر اُن کی حفاظت کرتا ہے۔ ان کے حوضی پنکھڑے بہت بڑے ہوتے ہیں جن پر موٹے موٹے ریشے نکل آتے ہیں جو تنفس کا کام کرتے ہیں۔ ان کے اندر خون کی نالیاں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔

چوپائے خواہ وہ رینگنے والے ہوں یا دودھ پلانے والے ہمیشہ اپنی زندگی خشکی پر ہی بسر کرتے ہیں۔ مگر بعض دودھ پلانے والے جانور پانی میں بھی رہتے ہیں۔ مثلاً وھیل (whale) جس کو دودھ پلانے والی مچھلی کہتے ہیں۔ اس کی دم پتوار کی ہم شکل ہوتی ہے۔ جو تیرتے وقت پانی کاٹنے کے کام آتی ہے۔ اس کے جسم پر بال نہیں ہوتے۔ صرف منہ کے اطراف تھوڑے سے بال رہتے ہیں جو بہت حسّاس ہوتے ہیں۔ اس کے سینہ کی جوف بہت بڑی ہوتی ہے۔ جس کے اندر صاف خون کی بہت سی نالیاں بہتی ہیں۔ اسی وجہ سے یہ جانور بغیر سانس لئے دو دو گھنٹے تک پانی کے نیچے رہ سکتا ہے۔ پانی کے اندر اس کے بچوں کو دودھ کھینچنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ اسی وجہ سے قدرت نے اس کے تھنوں کی ساخت کچھ ایسی عجیب رکھی ہے کہ بچے کو دودھ چوسنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلکہ ایک دم اُس کا منہ دودھ سے بھر جاتا ہے اسی طرح واٹر شرو (water shrew) ایک دوسرا پانی کا چوپایہ ہے۔ اس کی پچھلی ٹانگوں میں پاؤں کے تلوؤں اور انگلیوں پر عجیب شکل کے بال ہوتے ہیں۔ جب یہ پانی میں تیرتا ہے تو بال کنگھے کی طرح کھلے رہتے ہیں لیکن زمین پر چلتے وقت بند ہو جاتے ہیں۔ اس کی دم عموداً چپٹی ہوتی ہے۔ جس کی بطنی سطح پر لمبے لمبے بال ہوتے ہیں۔ یہ دم پتوار کا کام دیتی ہے۔

بہت سے دودھ پلانے والے جانور ہوا میں پرواز بھی کر سکتے ہیں۔ یہ اپنی اگلی ٹانگوں یا پاؤں کی مدد سے اور بعض اپنی مخصوص دُموں کے ذریعہ سے ہوا میں اُڑتے ہیں چنانچہ امریکہ میں ایک گلہری ہوتی ہے جو ہوا میں اڑ کر ایک درخت سے دوسرے درخت پر پہنچ جاتی ہے۔ آسٹریلیا میں بھی بعض گلہریاں اُڑنے والی ہوتی ہیں۔ اُن کے پہلوؤں میں پسلی پر کی کھال پنکھہ کی طرح پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ ہوا میں اُڑتی

اڑنے والی گلہری

ہیں۔ اسی طرح اپوسم (opossum) ایک دوسرا جانور ہے یہ بھی ہوا میں اڑ سکتا ہے۔

سیلون میں ایک لومڑی (fruit-bat) ہوتی ہے جو اڑ سکتی ہے۔ یہ چمگادڑ سے ملتی ہوئی ہوتی ہے اور درختوں کی شاخوں پر الٹی لٹک جاتی ہے۔ اس کے بازو بہت زیادہ پھیل سکتے ہیں۔

بعض اوقات یہ ربڑ کے پودوں پر اس قدر زیادہ تعداد میں آکر لٹک جاتی ہیں کہ ان کے وزن سے اکثر شاخیں ٹوٹ کر گر جاتی ہیں۔

اڑنے والا مینڈک۔

جیکو

چوپایوں میں چھپکلی کی طرح کا ایک اور جانور جیکو (gecko)

ہوتا ہے۔ اس کی پسلیوں کے اوپر کی جلد بہت ڈھیلی ہوتی ہے۔ جب یہ اڑتا ہے تو یہ کھال پھیلکر ایک پرند کے بازوؤں کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اڑنے میں یہ اپنی دم سے پتوار کا کام لیتا ہے۔ بعض مینڈک بھی طاقت پرواز رکھتے ہیں۔ ان کے چاروں پاؤں میں چوڑی چوڑی جھلی ہوتی ہے۔

دودھ پلانے والے جانوروں کی یہ ایک خصوصیت خیال کی جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ بچے دیتے ہیں۔ لیکن اسٹریلیا اور ٹاسمینیا کا جانور پلیٹی پس (Platypus) پرندوں کی طرح

پلیٹی پس یا ڈک بل
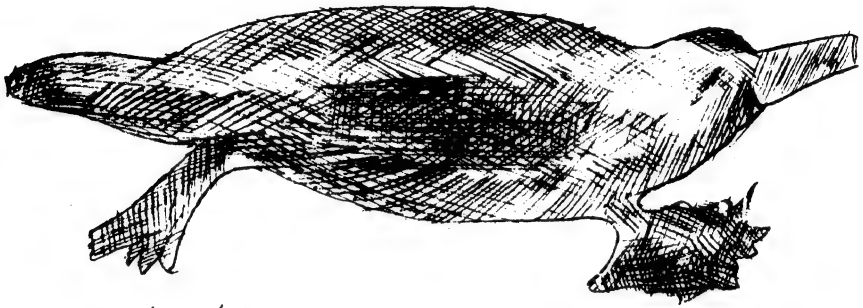
انڈے دیتا ہے۔ اس کا منہ بطخ کی چونچ کی طرح ہوتا ہے۔ یہ دریا کے کنارے زمین دوز گھونسلا بناتا ہے جس کے دو راستے ہوتے ہیں۔ بیانے کے زمانے میں مادہ دو یا تین انڈے دیتی ہے ایکڈنا (echidna) اور پرو ایکڈنا (Pro-echidna) اور ایسے دودھ پلانے والے جانور اسٹریلیا میں پائے جاتے ہیں۔ جو انڈے دیتے ہیں۔

یہ بھی اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض دودھ پلانے والے جانور پرندوں کی طرح درختوں پر اپنے گھونسلے بناتے ہیں۔ جزائر سماترا اور بورنیو میں اورنگ اوٹنگ (orang outan) ایک قسم کا بندر ہوتا ہے۔ جو جنگلوں میں درختوں پر نشیمن بناتا ہے اور اس کے آگے اپنے سونے کے لئے لکڑیوں کا ایک چھوٹا چبوترا سا تیار کرتا ہے۔ ایک مرتبہ چڑیا خانے سے یہ جانور رات کو آزاد ہو گیا تھا۔ صبح کو دیکھا گیا کہ اس نے رات بھر میں اپنے لئے اسی باغ میں ایک درخت پر گھونسلا بنا لیا تھا جس میں وہ خود بیٹھا پایا گیا۔ اسی طرح گوریلہ ایک بن مانس ہے جو اپنے متعلقین کے لئے درختوں پر گھونسلا رکھتا ہے۔ بیانت کے زمانے کے لئے اس کے علاوہ یہ ایک اور مخصوص مکان بناتا ہے۔ جب مادہ کے بچے پیدا ہونے کا زمانہ قریب آتا ہے تو

یہ اس کو اس خاص مکان میں منتقل کر دیتا ہے۔

جزیرۂ میڈاگاسکر میں بھی لیمور (Lemur) ایک لنگور ہوتا ہے جو درختوں پر نشیمن بناتا ہے جس کا قطر تقریباً ایک فٹ ہوتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ یہ لنگور بالعموم بہ یک وقت دو گھونسلے بناتا ہے۔ ایک میں یہ خود رہتا ہے اور دوسرا غلہ وغیرہ فراہم کرنے کے کام میں لاتا ہے۔ اسی جزیرے میں آئے آئے (aye-aye) ایک اور جانور پایا جاتا ہے جو بانس کے جنگلوں میں درختوں کے اوپر گھونسلا بنا کر رہتا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے کیڑے اور مختلف پرندوں کے انڈے کھاتا ہے۔ کینیڈا (canada) میں بعض کودنے والے چوہے ہوتے ہیں جو کھلیانی کھلاتے ہیں۔ یہ زمین کے اوپر رہتے ہیں۔ حالانکہ ان کے دوسرے ہم جنس جو شہری ہوتے ہیں ہمیشہ زمین کے اندر بلوں میں رہتے ہیں۔

غرض دنیا میں دست قدرت ہزاروں ایسے نئے نئے کھلونے بناتا ہے اور پھر خود ہی ان کو بگاڑ دیتا ہے۔ خاموش بیٹھے اس کی نیرنگی کا تماشا دیکھئے۔ وہ خود اپنی قدرت کاملہ سے ایک حسین کھلونا بناتا ہے۔ اس کے ماحول اور اس کی ضروریات کے مطابق اسے آراستہ کرتا ہے۔ تماشا گاہ عالم میں کچھ دن اس کا پرلطف تماشا دیکھتا ہے اور پھر اسے نیست و نابود کر دیتا ہے۔ جیسے ایک معصوم بچہ ایک مٹی کے کھلونے سے کھیلتا ہے اور کھیلتے کھیلتے اسے ہاتھ سے پھینک کر دوسری طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ پھر اس کھلونے کی شکستگی پر نہ اسے کبھی افسوس ہوتا ہے اور نہ شاید کبھی اس کا خیال دل میں آتا ہے۔

ناظم صدیقی۔ بی ایس سی۔

بچے کی تعلیم اور مدرسے کی شرکت

بچہ کو کس عمر میں مدرسہ شریک کیا جائے؟ یہ ایسا سوال ہے جو عموماً والدین کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے۔ عام رواج یہ ہے کہ جب بچہ پانچ سال کا ہوتا ہے تو اُسے مدرسہ بھیج دیتے ہیں۔ مکتب میں داخلہ کا پہلا دن رسم کے مطابق بڑی خوشی کا دن ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں اس رسم کو بسم اللہ خوانی کہتے ہیں۔ عزیز و اقارب دوست احباب جمع ہوتے اور مولوی صاحب بچے کے معلم بنتے ہیں۔ اس دن خاندان کا ہر فرد اور خاص طور پر وہ بچہ خوشی مناتا ہے۔ اس قدیم رواج کو ترک کرنا مناسب نہیں۔ تاکہ بچے قدیم دیرینہ رسوم سے واقف ہوں اور اس خاص رسم کو جان کر اس کی اہمیت کو سمجھیں۔ تیسری بات ان دونوں سے اہم یہ ہے کہ بچہ کی تعلیم کی ابتدا بزرگوں کی دعاؤں اور اعزہ و اقربا کی تمناؤں و آرزوؤں سے ہوتی ہے۔ پہلا روز تسمیہ خوانی اور دوسرا دن متبرک کلمات کے دہرانے میں صرف ہو جاتا ہے۔ اور اس کے چند دن بعد حروف تہجی کی ابتدا کی جاتی ہے۔ میری رائے میں تعلیم اطفال کے نصاب کی ابتدا اسی طریق پر ہونی مناسب ہے۔ حروف تہجی الفاظ اور مختصر جملے تصاویر و کہانی اور نظم کے ذریعہ سیکھ لینے کے بعد بچہ کی تعلیم کا ایک حصہ ختم ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے بعض حروف چھوٹ گئے ہوں۔ اس لئے میری رائے ہے کہ ہر قاعدہ اور ہر پہلی کتاب کے اول و آخر دونوں صفحوں پر حروف تہجی درج ہوں تاکہ اس مرتبہ حروف تہجی کی تدریس سے سابقہ تعلیم کی تکمیل ہو جائے یہ امر کتب درسی کی تالیف و تصنیف سے شغف رکھنے والے حضرات کے توجہ خاص کا محتاج ہے۔ بچہ اب اول جماعت سے اوپر ایک درجہ ترقی کرتا ہے۔ اب اُسے حروف تہجی کی ترتیب اور سلسلہ پر غور کرنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ حروف پہلے ہی سے اُسے ازبر ہوتے ہیں۔

مگر اس کا لازمی نتیجہ نہیں کہ بچہ کو پانچ برس کی عمر سے قبل شریک مدرسہ ہی نہ کیا جائے بلکہ اس عمر سے قبل ہی بچہ کی تعلیم گھر پر لازمی اور قریب تر مدرسہ میں اولی اور نرسری اسکولوں کا انتظام و قیام ضروری ہے۔ سر لزلی میکنزی (Sir Leslie Mackenzie) اپنی کتاب موسومہ "بچہ مدرسہ میں" (The Child at School) میں تحریر فرماتے ہیں کہ اگر مدرسہ اچھا ہے تو بچہ کو تین برس کی عمر میں بھی مدرسہ بھیجنا جلدی نہیں کہا جا سکتا۔ ایسے طریقوں سے آراستہ مدرسے میں جو آج کل تمام نرسری مدارس میں رائج ہیں بچہ

کے واسطے ایسا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ جہاں اُسے اپنی زندگی کے متعلق احساس کی تربیت کا موقع ملتا ہے۔ نونہالان قوم کی عمر عزیز کو خراب ماحول اور گلی کوچہ کے آوارہ گرد لڑکوں کی صحبت میں گزارنے سے مدرسہ میں گزارنا بدرجہا بہتر ہے اگر ان کم سن بچوں کا حضوری مدرسہ تعلیمی مفاد سے عاری ہو تو بُری صحبتوں سے صیانت اور پابندی مدرسہ کی عادت کے فائدہ عظیم سے خالی نہیں ہے۔ گو یہ بات اسکاٹ لینڈ کے بچوں کے متعلق لکھی گئی ہے، اگر پھر بھی نرسری مدارس کے قیام کے مسئلہ پر ہمیں سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیئے۔

چند اہم باتیں ۔ بچے کی عادت و اطوار کے متعلق معلم یا والد کو بعض امور کا جاننا ضروری ہے جن میں سے چند درج ذیل کی جاتی ہیں۔

(۱) ابتداً بچے کتاب پڑھنے سے متنفر رہتے ہیں۔ مگر جبلاً و فطرتاً قصص و کہانیوں کے سننے اور تصاویر کے دیکھنے کا بے حد شوق ہوتا ہے۔ لیکن اسی ضمن میں رفتہ رفتہ ان میں کتاب پڑھنے کا شوق دل میں جاگزیں ہوتا جاتا ہے۔ (۲) اعداد کے اسباق زبان کے اسباق کے بعد آتے ہیں۔ گنتے وقت پہلے پہل وہ جلدی جلدی گنتا ہے اور ان اشیا کی تعداد کا بھی لحاظ نہیں کرتا جو اس کے سامنے ہیں۔ مگر رہنمائی کی جائے اور بار بار دہرائے اور تجربہ ہو جائے تو ہر چیز بتا کر شمار کرنے لگتا ہے۔ (۳) بعض اوقات بچہ کاپی کتاب لے کر بیٹھنے کو چاہتا ہے بعض دفعہ اسے تختہ سیاہ پر لکھنے کی خواہش ہوتی ہے بعض مرتبہ وہ انہیں چیزوں سے کھیلنا پسند کرتا ہے۔ دن کا زیادہ حصہ وہ آزاد اور خود مختار رہنا چاہتا ہے۔ بہت سی چیزیں صرف دیکھ کر اپنے آزاد مشغلوں کے وقت خود انجام دینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ باتیں اس کی دماغی اور جسمانی نشو و نما اور ترقی کے واسطے ایسی ہی ضروری ہیں جیسے کھانا پانی زندگی کے لئے لازمی ہے۔ (۴) کھیل کے وقت بھی ہم بچے سے باتیں کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم اس کی سی باتیں کریں۔ (۵) بچہ کو لکھنے پڑھنے کی تاکید کا عام طریقہ اس کے دل میں تعلیم سے نفرت پیدا کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ کسی کام کے کرنے کی ہدایت سے پیشتر ہمیں چاہیئے کہ بچہ کو اس کام کی ترغیب و تحریص دلائیں اور اس سے دلچسپی پیدا کرائیں۔ اس لئے ہمیں خود اس کے ساتھ بیٹھنا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ وہ کیا کرتا ہے۔ اور اس کی دل افزائی کریں اور وقت ضرورت اس کو مشورہ دینا چاہیئے۔ جب بچہ کو کام کی رغبت ہو جائے گی تو پھر ہم جو کہیں گے وہ انجام دے گا۔ (۶) اگر اس طرح اس کے ساتھ بیٹھنے سے کوئی تھک جائے تو بچہ کو اکیلے چھوڑ دینا چاہیئے۔ بچہ پر خفگی نہ کرے اور نہ ناشائستہ و غیر مہذب الفاظ سے انہیں زجر و توبیخ کرے۔ چونکہ بچوں میں تقلید کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ بھی اس مذموم عادت کے مرتکب ہو کر آئندہ دوسروں کے نسبت

اس کا استعمال کریں۔ (۷) جو چیزیں بچہ کو کھیلنے کے واسطے دی جائیں بہت ممکن ہے کہ بچہ ان میں سے بعض اشیاء کو نظر انداز کر جائے' اور بعض چیزوں کی طرف بہت رغبت کرے اس لئے ایک کتابچہ میں تمام سامان درج کر کے کھیل کے بعد دشمار درج کئے جائیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ بچہ نے کس دن کس چیز کو استعمال کیا اور کس چیز کو بالکل استعمال نہیں کیا۔ جن اشیاء کو بچہ نے بالکل استعمال نہیں کیا' انہیں اس طرح پیش کرنا چاہیے کہ اسے وہ چیزیں پسند آئیں اور اچھی معلوم ہوں۔ جو بچہ اپنی عمر کے ابتدائی ایام گھر میں محبت و پیار کے ساتھ بسر کرتا ہے' بڑا خوش قسمت ہے' جس گھر میں تمیز و تہذیب سے بات چیت کی جاتی ہے۔ جہاں تعاون اور خود اعتمادی رائج ہوتی ہے' جہاں کسی میں خود رائی نہیں ہوتی جہاں ہمیشہ مہربانی کے ساتھ ایک دوسرے سے نیک سلوک کیا جاتا ہے۔ جہاں عمدہ چال چلن دوسروں کے لئے نمونہ کا کام دیتا ہے ایسا گھر دوسری جنت ہے۔

اس حصہ کو فری بل (Froebel) کے الفاظ میں ختم کرنا مناسب ہے۔" اے والدین ہمیں اپنی خامیوں کو اپنے بچوں میں سے دفع کرنا چاہیے۔ وہ انبج اور حیات بخش قوت جو ہم میں نہیں ہے ہمارے بچوں کی زندگی سے ہمیں حاصل ہو جائے۔ ہمیں اپنے بچوں سے سبق لینا چاہیئے۔ ہمیں ان کی زندگی کے نازک احساسات اور ان کے دماغ کے خاموش مطالبات پر غور کرنا چاہیئے۔ ہمیں اپنی زندگی وقف کر دینی چاہیئے۔ تب ہمیں ان کی زندگی سے اطمینان و آرام ملے گا۔ اور تب ہمیں خود بھی عقل اور سمجھ آئے گی"۔

معلم کی گذشتہ عظمت۔ سب سے اہم اور قابل غور مسئلہ معلم کا ہے۔ ہر شخص اس بات پر متفق ہے کہ تعلیمی حکمت عملی میں ہر اصلاح کی جان معلم ہے۔ اس کی حالت پر غور کرنا ہمارا فرض اولین ہے۔ اگرچہ بے شک اس مسئلہ کا حل خود ہم پر ہمارے احساس فرائض پر اور بڑی حد تک سررشتہ تعلیم پر ہے' تاہم والدین کے تعاون عمل کے بغیر یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اس لئے کہ مدرسین کی محنت کا بہترین و شیریں ثمرہ والدین حاصل کرتے ہیں مدرس کی حیثیت پر تین پہلو سے غور کرنا چاہیئے۔ (۱) زمانہ قدیم کا مدرس۔ (۲) بعد کا مدرس (۳) موجودہ مدرس۔

زمانہ قدیم میں مدرس کی وقعت شاہ و گدا سب کرتے تھے' بچے اس کے قدموں کے پاس بیٹھکر درس لینے کو فخر جانتے تھے۔ بچے ہی اس کے گھر بار کی دیکھ ریکھ کرتے تھے اور اس کے کھانے پینے کو لاتے تھے' ہندوؤں میں یہ باتیں اس درجہ کو پہونچ گئی تھیں اور گرو کی سیوا کرنا خدا

کی عبادت کے مساوی سمجھا جاتا تھا۔ استاد اور شاگرد ساتھ ساتھ رہتے سہتے تھے اور ایک دوسرے کے مفاد کا خیال رکھتے تھے۔ مدرس کو اپنی آمدنی اور گزر بسر کے متعلق کوئی تشویش نہ ہوتی تھی۔ راج ویر جا سب دان کرتے اور مدرس کو اپنی ضروریات سے زیادہ مل جاتا تھا۔ مدرس کا سارا وقت دھیان گیان یا درس و تدریس میں صرف ہوتا تھا۔ کسی عالی شان عمارت یا گران بہا ساز و سامان کی ضرورت نہ تھی۔ نہ درسی کتابیں رائج تھیں جو گروجی پڑھتے وہی سیوک دہراتے جاتے تھے۔ گروجی کی سادہ زندگی راست گفتاری اور اعلیٰ خیالی قابل تقلید ہوتی تھی وہ اخلاق حسنہ کا مجسمہ ہوتے تھے اور ایک زندہ مثال ہوتے تھے جس کی تقلید اور پیروی ان کے سب شاگرد اور سیوک کیا کرتے تھے۔

ایک گروہ دیہاتی مدرسین کا تھا۔ دیہاتی مدرسین ہر فن میں کامل و ماہر سمجھا جاتا تھا۔ وہ دیہات کا جوتشی بھی تھا اور پروہت بھی دستاویزوں کا لکھنا بھی اُس کے ذمہ ہوتا تھا اور خطوط کا لکھنا بھی۔ اس طرح ان سب باتوں کے علم سے اُسے وہی حیثیت حاصل ہو جاتی تھی جو پہلے اُس کے آباؤ اجداد کو حاصل تھی۔ بچوں کے والدین اور دیہات کے لوگ سب اونہیں کی خبر گیری کرتے تھے، اور اس کے خاندان کے دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی نیک سلوک کرتے تھے۔ اس کی آمدنی کا ذریعہ دیہات کی مشترکہ زمین کا ایک کھیت ہوتا تھا، جو اسی کے نام منسوب ہوتا۔ اور اکثر ایک دوسرے کو وراثتاً پہونچتا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ فصل کے زمانہ میں غلے اور دیگر اشیاء مایحتاج جو سال بھر کے لیے کافی ہوں اُسے مزید مل جایا کرتی تھیں۔ تیوہار سے پہلے بچوں کے والدین اور بچے وہاں چاول گھی تیل پھل، پھلاری سبزی ترکاری، پارچہ وغیرہ ہر قسم کے تحف و ہدایا مدرس کے گھر پہونچا دیتے تھے۔ جس کی وجہ ضروریات معیشت سے کسی چیز کی حاجت اور کسی قسم کی تشویش باقی نہ رہتی تھی۔

بچے دن بھر مدرس کے گھر گذارتے، اور مدرس پورا دن ان کی تعلیم و تدریس میں صرف کرتا۔ استاد و شاگرد اور مدرس اور والدین کے فی مابین اتحاد و اتفاق کا گہرا تعلق ہوا کرتا تھا۔ جو ہر سہ کے لئے مفید تھا۔ کسی شاندار عمارت یا قیمتی ساز و سامان کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ بچے استاد کے ساتھ ساتھ الفاظ و عبارت دُہراتے۔ پاس لکھنے کے لئے زمین کافی ہوتی تھی یا لکڑی کی تختیاں استعمال کی جاتی تھیں۔ بچے بڑے ہو کر مدرس کی بڑی عزت و تعظیم کرتے تھے اور بچپن میں جو استفاضہ و استفادہ کیا تھا۔ ان کی یاد دلوں میں تازہ رکھتے تھے۔

ان دونوں طرز کے مدرسوں میں چند خصوصیات مشترک ہیں۔ جو قابل غور ہیں۔ (۱) مدرس کی عزت و تعظیم کی جاتی تھی (۲) اس کی تمام ضروریات مہیا کی جاتی تھیں۔ (۳) وہ پورا دن کام کرتا تھا، والدین اور استاد اور استاد اور شاگرد میں تعلقات نہایت خوش گوار ہوتے تھے۔ بچے گرو کے سیوا دل و جان سے کرتے تھے۔ (۴) والدین تعلیم اطفال کو بہت اہم سمجھتے تھے، اور اس کی جانب کافی توجہ کرتے تھے۔ اس کے تعلیم و تدریس کا کامیابی لازمی نتیجہ تھا۔

(۲) بعد میں، مرور زمانہ سے ایک اور طرز کے مدرسین ہوگئے، جن کی عزت و وقعت بھی مندرجہ بالا اساتذہ کی طرح ہوتی تھی، مگر یہ اساتذہ درس و تدریس میں اپنی شخصیت کے اثر سے بجائے سزا زیادہ کام لیتے تھے، جن کے اس طریقۂ عمل سے بچوں کو تعلیم سے رغبت کے بجائے نفرت ہوجاتی تھی۔ مگر اب زمانہ بالکل بدل گیا، ان اساتذہ کے مطمح نظر میں وسعت پیدا ہوگئی، جدید تبدیلیوں سے وہ آگاہ اور باخبر ہیں۔ ایسے پرانی قسم کے اساتذہ یا تو روز افزوں ضروریات کے مدنظر جدید طرز اختیار کرتے جارہے ہیں، یا بتدریج ناپید ہورہے ہیں۔ بہرحال دیہات والے کسی نہ کسی مدرس کو ہر طرح کی مالی خدمت اور نیک سلوک کرکے نہایت عزت و وقار کے ساتھ اپنے گاؤں میں رکھتے تھے۔

سلمان بادشاہوں کے عہد حکومت میں سلاطین مغلیہ کے زمانہ میں بھی اساتذہ کی تعظیم کم و بیش یہی رہی۔ اس دور کی تعلیمی حالت کا تفصیلی بیان ایک علیحدہ اور مستقل مضمون کا محتاج ہے، یہاں صرف اس ایک واقعہ کا اظہار مقصود ہے کہ سلطنت کے فرائض اور بادشاہت کی اہم ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کے بعد ہر طرح کی آسائش اور ہر قسم کے سامان راحت کے باوجود نظر بندی کے زمانہ میں شاہ جہاں نے لڑکے پڑھانے کی خواہش کی۔ شہنشاہ عالمگیر نے کہا کہ شاید بادشاہت کا شوق ابھی قایم و برقرار ہے۔ اورنگ زیب کے اس بیان سے اس زمانہ کے خیالات کی جھلک نظر آتی ہے کہ مدرس کی وقعت شاگردوں اور ان کے والدین اور عزیز و اقارب کے نزدیک بادشاہ سے کم نہیں تھی۔

(۳) زمانہ ماضی کے پُرشکوہ اور دلفریب تذکرہ جس قدر کئے جائیں کم ہیں۔ زمانہ موجودہ کی حالت کا اظہار غیر ضروری ہے۔ مدرسہ کے مدرس کی حالت آپ کے پیش نظر ہے، اس کی ذمہ داریاں کم نہیں ہوئیں۔ بلکہ ان میں معتدبہ اضافہ ہوگیا ہے، اس کی خدمت اعلیٰ و ارفع تصور کی جاتی ہے۔ لوگوں کو بھی اس پیشے کی تقدیس کا احساس ہے، مگر یہ احساس ابھی

صرف زبانی ہمدردی پر مشتمل ہے۔ عملاً اس پر کوئی توجہ نہیں۔ قرینہ ہے کہ اس پیشہ کی بنیادیں زیادہ استوار ہو جائیں۔ عوام میں ہر شخص کو اگر اس بات کا احساس ہو جائے تو سابقہ حالت بہت جلد عود کر سکتی ہے اور یہ کچھ بہت دشوار نہیں۔

اعتماد و بھروسہ۔ ایک مرتبہ جب مدرس کی خدمات حاصل کر لی گئیں تو پھر اُس پر پورا پورا اعتماد اور بھروسہ کرنا چاہیئے۔ اس کے تفویض دو چار بچے نہیں ہوتے بلکہ تیس چالیس ایسے بچوں کی جماعت سے واسطہ رہتا ہے جن کی عمر مختلف، استعداد جدا اور مزاج میں کوئی یکسانیت نہیں ہوتی، ایسی صورت میں فرداً فرداً ہر بچہ کی حالت اور تدریجی ترقی پر غور کرتے رہنا اگر محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ صرف وہی لوگ مدرس کی دشواریوں اور ذمہ داریوں کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں جنہیں خود ایک سے زائد بچے ہوں۔ ہر بچہ کی ضرورت پر ہمیشہ الگ الگ نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ طلبہ پر منفردہ طور سے توجہ کرنا موجودہ تعلیم کا جزو لازم قرار پایا ہے، اور اس کے لئے ایسی تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں کہ اساتذہ ہر بچہ کی الگ الگ ضروریات کے مناسب حال ترقی کے ذرائع اختیار کریں۔ اس ضمن میں سب سے اہم جو چیز ہے اور جسے ہم سب ابھی تک نظر انداز کئے ہوئے ہیں گھر کی تعلیم و تربیت ہے۔

ڈاکٹر اور مدرس۔ ڈاکٹر یا طبیب کو لیجئے جب ہم اس کے پاس علاج کی غرض سے جاتے ہیں تو پہلے سے معلوم کر لیتے ہیں کہ اس کے ہاتھ میں شفا ہے یا نہیں۔ اس کی عام شہرت کیسی ہے لوگ اس کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں۔ اس کا برتاؤ اور اخلاق کیسا ہے۔ لیکن مدرس کے متعلق کیا ہم کسی خوبی کی جانچ پڑتال بھی کرتے ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں بلکہ ہر شخص کوئی بھی مدرسی کا اہل سمجھا جاتا ہے۔ اہلُ الرائے کا خیال ہے کہ مدرس کو اپنے فن کی تحصیل لازم ہے۔ کیونکہ فن تدریس ترقی کرتے کرتے سائنس ہو گیا ہے۔ بے شک بعض مستثنیات بھی ہیں جن اشخاص کو بچوں کا تجربہ ہوتا ہے وہ پیدائشی مدرس ہوتے ہیں۔ مگر عام طور پر ہر مدرس کو جو اپنے پیشے میں کامیاب ہونا چاہتا ہے، تھوڑی بہت فنی واقفیت نہایت ضروری ہے۔ کیا طبیب یا ڈاکٹر ہر وقت بیمار کے پاس یا اس کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ صرف یہ کرتا ہے کہ بیمار کی نبض دیکھی مرض کی تشخیص کی نسخہ تجویز کیا۔ ضروری ہدایات دیں اور چلا گیا۔ اب یہ کام عزیز و اقارب کا ہے کہ بیمار کی خبر گیری کریں۔ مناسب غذا کھلائیں، تسلی تشفی دیں، اور جسمانی اور دماغی آرام و آسائش کا خیال رکھیں۔ گو مدرس طالب علم کے ساتھ زیادہ وقت صرف کر سکتا ہے۔ مگر اس کو صرف طالب علم کا اور نیز اس کے والدین کا رفیق و راہبر تصور کرنا چاہیئے۔

ادنیٰ طبقہ کے لوگوں میں یہ امر نہایت ضروری ہے کہ والدین بچوں پر نگرانی رکھیں، مدرسہ کے کام سے واقف رہیں اور اساتذہ سے میل جول رکھیں۔

عملی کام اور قوت حافظہ ۔ تعلیم جدید میں دو امور ایسے ہیں جن پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے (۱) قوت حافظہ کی تربیت اور عملی کام کی صلاحیت پیدا کرنا۔ قوت حافظہ یہ چیز قدیم ہے جس میں ہم بھی مشہور زمانہ تھے۔ مگر عملی کام کی صلاحیت بالکل جدید چیز ہے۔ ان ہر دو میں عملی کام کی قوت کی تربیت پر زیادہ توجہ کرنی چاہئے۔ اور ساتھ ہی قوت حافظہ کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔ اس کے نظر انداز کرنے کی کیا وجہ ہے؟ یہ وجہ نہیں کہ حافظہ کی خوبی جدید فن تدریس کی ایجاد ہے۔ جس کی وجہ ہمارے بچے اس میں ناقص رہ جاتے ہیں۔ بلکہ اصلی سبب یہ ہے کہ گھر میں اس پر آج کل مطلق توجہ نہیں ہوتی بچہ کی تعلیم اگر ان اصولوں پر ہوتی جن کا مختصر سا خاکہ رسالہ حیدرآباد ٹیچر میں راقم الحروف نے اپنے سابقہ مضمون میں درج کیا ہے تو بچہ کو بعض باتوں کے حفظ کی عادت استاد کے بغیر تعریف و ترغیب خود ہو جاتی۔

قدیم فن تدریس کی یہ ایک بڑی خامی تھی کہ عملی کام کی کوئی تربیت نہیں کی جاتی تھی۔ بجائے اس کے کہ بچہ کو خود کام کرنے کا موقع دیا جائے اس سے مشین کا سا کام زیادہ لیا جاتا تھا۔ تعلیم اطفال میں تجرباتی تعلیم نے "ہاتھ اور آنکھ کی تربیت" اور معروف رکھنے کے طریقے ایجاد کئے۔ اسی طرح مدرسہ میں علم الحساب کی تدریس میں زندگی کے عملی پہلو سے حقیقی طور پر مطابقت کی جاتی ہے۔ اب ہمارا کام یہ ہے کہ جدید و قدیم کو ایک دوسرے میں ایسا پیوست والحاق کر دیں کہ دونوں ایک ہو جائیں۔

نصاب تعلیم ۔ مروجہ طریقہ تعلیم کے متعلق مدارس میں متعدد اور مختلف مضامین کی کثرت کی شکایت ہر شخص کے زبان زد ہے۔ یہ شکایت بسا اوقات خود اساتذہ صاحبان بھی کرتے رہتے ہیں۔ بے شک یہ درست ہے کہ مدرس کی زیادہ توجہ لکھنا، پڑھنا اور حساب کی جانب ہی منعطف رہنی چاہئے۔ دوسرے مضامین کا کام صرف یہ ہے اور ہونا چاہئے کہ جو معلومات اس طرح حاصل ہوں ان کے آپس میں تعلق قایم کر کے معین و مستحکم کیا جائے۔ دیگر مضامین کی تدریس کے ضروری ہونے کے وجوہات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) **مشاہدہ قدرت** ۔ اس مضمون سے قوت متخیلہ اور مشاہدہ کی تربیت ہوتی ہے۔ بچے اس مضمون کی تعلیم سے قدرت کی حسن کاری اور مناظر قدرت کی نیرنگی سے دلچسپی لیتے ہیں، اور مصنوع

سے صانع کی محبت اپنے دل میں پیدا کرتے ہیں۔ اور اس سے زبان کی اصلاح اور قوت بیانیہ میں کافی مہارت حاصل ہوتی ہے۔ قدیم مذہبی روایات قصہ اور کہانیوں سے اس مضمون کی تدریس میں امداد لی جاسکتی ہے۔

(۲) **تاریخ**۔ اگر ہم کو اپنے نوجوانوں میں حب وطن اور ملک کی قدیم تاریخی حالات سے دلچسپی پیدا کرانا مقصود ہو تو یہ صرف اس طرح ممکن ہے کہ مشاہیر زمانہ افراد کے حالات زندگی بیان کیے جائیں جنہوں نے بادشاہ سپہ سالار۔ یا مدبر کی حیثیت سے ملک و قوم کی خدمت گزاری کی ہو۔

(۳) **جغرافیہ**۔ ان کے اصلی کاموں کو سمجھنے کے واسطے جو اس نے مختلف نوعیت سے انجام دیے ہیں مثلاً صنعتی، تجارتی، اور معاشی، اور جو خدمت انسان اس ملک اور دوسرے اور ممالک میں اپنے بنی نوع کی انجام دے رہا ہے یہ اور اس قسم کی دوسری باتیں جاننے کے واسطے جغرافیہ کی تعلیم نہایت ضروری ہے۔

(۴) **دستی مشاغل**۔ اس مضمون کو شریک نصاب کرنے کا مقصد اعظم یہ ہے کہ ہمارا مطمع نظر محنت کا اعزاز ہونا چاہیے۔ نیز اس سے طلبہ کی آنکھوں اور ہاتھوں کی تربیت ہوتی ہے۔ گھر میں اگر کوئی معمولی سا کام مثلاً دیوار میں کیل گاڑنا۔ لیمپ جلانا۔ اسی طرح کے کچھ کام اگر پیش آجائیں اور بچے نہ کرسکیں تو وہ ہمارے بے حد خفگی کا باعث ہوتے ہیں۔ دستی مشاغل سے بچے ہر شئے کو خوش اسلوبی سے موزوں اور مناسب موقع پر با اصول استعمال کرنے کا طریقہ جانتے ہیں۔

(۵) **تعلیم ورزش جسمانی**۔ یہ امر واقع ہے کہ ہمارے طلبہ محنت جسمانی کے اعتبار سے بہت کمزور ہیں۔ اور ہمارے بچوں میں تحمل اور برداشت کا وہ مادہ نہیں ہوتا جو ورانتاً ہمیں اپنے بزرگوں سے حاصل ہوا تھا۔ گو اس کا نہایت گہرا تعلق بچوں کی غذا اور مناسب نشو و نما کے اہم مسئلہ سے ہے۔ تاہم دماغی اور اخلاقی تعلیم کے ساتھ ساتھ تعلیم ورزش جسمانی بھی ضرور ہونی چاہیے۔ کیونکہ صحیح دماغ تندرست جسم میں ہوتا ہے۔ اگر خوش حال لوگ مدرسہ کے غریب بچوں کی غذا کی طرف ذرا بھی توجہ کریں تو یہ اہم مسئلہ بڑی حد تک پورا ہو جائے گا۔

(۶) **اخلاقی تعلیم**۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے بچے کس طرح لا مذہب ہو جاتے ہیں اور کیسی خراب عادتیں ان کو لاحق ہو جاتی ہیں۔ ان میں مذہبی روح پیدا کرنے کے واسطے ہمیں سیرت رسول صلعم اور قصص قرآن پاک کی تعلیم دینی چاہیے۔ تاکہ دل و دماغ کی جلا ہو جائے۔ اور خصائل حمیدہ اور شمائل ستودہ حاصل کرکے ان پر زندگی میں عمل پیرا ہوں۔ اور بفحوائے الانسانیۃ تنحصر فی الاخلاق الحسنہ رسول صلعم کے اسوہ حسنہ اور اکابر اسلام اور بزرگان عظام کے سیر کی اتباع کرکے انسان کہلانے کے مستحق ہیں۔

تحریک کشافہ بڑی حد تک اس ضرورت کو پیدا کرنے کے واسطے جاری ہوئی ہے۔ بیرونی

ڈھانچہ یعنی جسم پر توجہ کرنے کے بجائے اندرونی احساسات کو بیدار کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے مار پیٹ کرنا یا زجر و توبیخ سے کوئی فائدہ مترتب نہ ہوگا۔ تحریص و ترغیب کے ذریعہ احساس پیدا کرنا ضروری ہے۔

(۷) **باغ بانی**۔ مدارس میں باغ بانی کی تعلیم کا منشاء یہ ہے کہ ہر گھر میں چھوٹا سا باغ ہو جس سے دماغی کام میں انہماک و شغف کے بعد دماغ کو فرحت و تازگی اور آنکھوں کو طراوت حاصل ہو اور عمدہ فواکہ و نیز سبزیات سے ہمارے باورچی خانہ کی معمولی ضروریات پوری ہوں۔ باغ بانی کی تعلیم سے اول تو اپنی مدد آپ کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ دوم اپنی تعلیم بھی خود کرنی آجاتی ہے۔ اور تیسرے قدرت کی عظمت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ہمارا ملک زرعی ہے اور اس لئے باغ بانی کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے بچے جسمانی محنت کو ایسا ذلیل سمجھتے ہیں کہ آئندہ زندگی میں ان سے ہل چلانے کی توقع رکھنا فضول ہے۔ حالانکہ ان میں جسمانی محنت کے کاموں کی وقعت ہونی چاہئے۔

(۸) **انگریزی**۔ انگریزی سلطنت کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ انگریزی زبان بھی عالمگیر ہوتی جا رہی ہے۔ انگریزوں کے ساتھ انگریزی بھی ہمارے ملک میں مستقل طور پر آگئی ہے۔ چاہئے انگریز اس ملک سے چلے جائیں۔ مگر انگریزی جاتی نظر نہیں آتی۔ انگریزی ساری دنیا کی بین الاقوامی زبان ہو گئی ہے۔ ہندوستانی حکومت کی زبان بھی انگریزی ہے۔ حکام عدالت اور عہدہ دار بھی انگریزی بولتے ہیں۔ تجارت اور کاروباری زندگی کے ہر شعبہ میں انگریزی کی شدید ضرورت ہے۔ والدین کی یہ عین خواہش رہتی ہے کہ بچے انگریزی بولیں اس لئے انگریزی ہندوستانی مدارس کے نصاب تعلیم کا جزو لاینفک ہے۔

(۹) **اُردو**۔ اُردو کی تعلیم جس قدر آسان سمجھ لی گئی ہے اتنی آسان نہیں۔ مادری زبان ہونے کی حیثیت سے اس کا معیار ابھی بہت بلند ہونا چاہئے۔ یہ دیکھ کر بڑا صدمہ ہوتا ہے کہ پڑھے لکھے لوگ نہایت معمولی غلطیاں کرتے ہیں جس سے چشم پوشی کی جاتی ہے۔ انگریزی تحریر میں ذرا سی غلطی بھی سخت معیوب خیال کی جاتی ہے۔ ملک میں عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام سے اردو کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ سرکاری زبان ہونے کے باوجود محض سرکاری دفاتر میں اُردو کی جانب کم التفاتی باعث تعجب ہے۔ خود جامعہ عثمانیہ سے طلبہ بغیر اُردو پڑھے بھی اسناد حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی طرح کی اور باتیں حد درجہ قابل غور ہیں۔ اس لئے اُردو زبان کا نصاب محتاج نظرثانی ہے۔ ناظرین پر اس طرح ظاہر ہوگا کہ بچوں کی تعلیم میں کس قدر دشواریاں حائل ہیں اور اساتذہ کا کام کتنا اہم ہے۔ تفصیلی طور پر ان باتوں کو بیان کرنے کی اس مختصر سے مضمون میں گنجائش نہیں۔ ضرورت ہے

کہ آیندہ اس عنوان پر ایک بسیط و جامع مضمون قلم بند کیا جائے جو تمام مسائل پر حاوی ہو۔

عبدالجبار سبحانی
مددگار فوقانیہ ام پلی

شذرات

روئداد جلسہ سالانہ مدرسہ تحتانیہ ٹیکمال ضلع میدک مدرسہ ہذا کا یہ سب سے پہلا جلسہ زیر صدارت مولوی محمد اسمٰعیل صاحب سابق سررشتہ دار فوجداری منعقد ہوا۔ جس میں حاضرین کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو تھی۔ حمد باری تعالیٰ و ترانہ شہریار دکن سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد محمد عبدالرحمن خاں صاحب معتمد جلسہ و مسٹر لچھماراج مددگار نے اردو و تلنگی میں مدرسہ ہذا کی رپورٹ سنائی۔

بعد ازاں صدر مدرس صاحب موصوف نے ضروریات مدرسہ پر روشنی ڈالتے ہوئے مؤثر و دلنشین تقریر فرمائی۔ جس پر پورے جلسہ نے مدرسہ میں (صہ ۵) کا چندہ جمع کیا گیا اور اعلیٰ حضرت بندگان عالی و صاحب زادگان ہمایوں فال و صاحبزادیان خجستہ خصال کی درازی عمر و اقبال و ترقی جاہ و جلال پر جلسہ ختم ہوا۔

مدرسہ تحتانیہ قصبہ سون تعلقہ نرمل مدرسہ ہذا کا سالانہ جلسہ بتاریخ ۲۰ خورداد ۱۳۴۱ف بصدارت عالی جناب مولوی محمد عبدالعزیز صاحب ڈویژن انجینیر گوداوری برج سون منعقد ہوا۔ میدان بازی گاہ مدرسہ۔ اشیا تعلیمی و گلی تصاویر و دستی مشاغل اور پرچم عثمانی نیز رنگ برنگ کی جھنڈیوں سے خوب سجایا گیا تھا۔ پانچ بجے جلسہ کا آغاز ہو۔ اولاً طلبہ نے اردو، تلنگی، مرہٹی نظم سنائی۔ اس کے بعد مسٹر باپوراؤ معتمد جلسہ و پنڈت گنڈ اچاری نے حالات مدرسہ اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب مددگار نے ورزش و کھیل کے فوائد و مسٹر نارائن مددگار نے باغچہ مدرسہ کی اہمیت پر اردو میں اور مسٹر نرہری مددگار نے تعلیم کی ضرورت پر تلنگی میں تقریر فرمائی۔ اور صدر مدرس صاحب مدرسہ نے سالانہ رپورٹ سنائی۔ بعد ازاں عالی جناب صدر نشین صاحب نے نمایش تعلیمی کا افتتاح اور گیمس کا ملاحظہ فرما کر خوشنودی کا اظہار اور سود مند پند و دلپذیر تقریر کے بعد اشیا نمایشی و گیمس کے کامیاب طلبہ کو انعامات تقسیم فرمایا۔ اور ۱۰ بجے جلسہ برخاست ہوا۔

جلسہ تقسیم اسناد امتحان سالانہ مدرسہ تحتانیہ قصبہ گنگا کھیڑ ضلع پربھنی مدرسہ ہذا کا جلسہ تقسیم اسناد زیر صدارت مسٹر عب گنپت راؤ صاحب جاگیردار بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔ منعقد ہوا جس میں اولیا طلبہ دیگر شرفا و حکام مقامی شریک تھے۔ مدرسہ اور اس کے محاذی

میدان کو پرچم آصفی و مختلف رنگ کے جھنڈیوں و سامان ڈرائنگ و نقشے سے بخوبی سجایا گیا تھا۔ صدر صاحب جلسہ کو کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہوتے ہی پھولوں کے ہار پہنائے گئے اور اس کے بعد حمد باری تعالیٰ و ترانۂ دکن سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ طلبہ نے نہایت دلچسپ مکالمہ کیا اور بزبان اُردو و مرہٹی و انگریزی خوش الحانی سے سبق و نظمیں سنائیں جس پر حاضرین جلسہ محظوظ ہوئے۔ اول مددگار صاحب نے مدرسہ کی رپورٹ پڑھی۔ اور بعد ازاں عالیجناب صدرنشین صاحب نے تعلیم پر بزبان مرہٹی نہایت فصیح و بلیغ مبسوط تقریر فرمائی اور جلسہ اعلیٰحضرت بندگان عالی و شہزادگان بلند اقبال و شہزادیان نیکو فال کی ترقی عمر و اقبال و ازدیاد جاہ و جلال پر برخاست ہوا۔ اور حاضرین کی شیرینی سے تواضع کی گئی۔

مدرسہ تحتانیہ تعلقہ سرپور۔ ضلع عادل آباد بتاریخ ۲۹ اردی بہشت ۱۳۴۱ف زیر صدارت عالی جناب مولوی محمد الیاس خاں صاحب خویشگی منصف تعلقہ سرپور مدرسہ ہذا میں جلسہ یوم الوالدین منایا گیا جس میں مقامی حکام کے علاوہ وکلار و دیگر معززین و اولیاوے طلبہ شریک تھے جلسہ کا آغاز مغرب کے بعد قرأت سے ہوا۔ اور اس کے بعد اُردو و تلنگی میں متفرق طلبا نے حمد پڑھی۔ اس کے بعد محمد عبدالرحمن خاں صاحب صدر مدرس نے مقصد تعلیم و تربیت اخلاق میں والدین کا حصہ اور مولوی فتح محمد صاحب مدرس نے طلبہ اور مکانات کی صفائی۔ اور مولوی سید موسیٰ صاحب مدرس نے تعلیم بالغان پر مضمون سنایا۔ اور آخر میں جناب صدرنشین صاحب نے اولیاے طلبہ اور مدرسین کے خوشگوار تعلقات و تبادلۂ خیالات اور تعلیم بالغان سے جو قومی و ملکی فوائد مترتب ہوتے ہیں ظاہر فرمایا۔ اس کے بعد دعائے سلامتی اعلیٰحضرت و استرداد برار کی نظم پر برخاست ہوا اور حاضرین کی چار، شیرینی و پان وغیرہ سے تواضع کی گئی۔

جلسہ انجمن اساتذہ مدارس تحتانیہ درجہ اول قصبہ حیدر گڑھ ضلع گلبرگہ شریف۔ بتاریخ ۲۷ فروردی روز دوشنبہ انجمن اساتذہ کا جلسہ زیر صدارت جناب سٹر وینکٹش راؤ صاحب مددگار اول ڈل اسکول گرگنال منعقد ہوا۔ تقریباً اسٹاف ڈل اسکول اور مدرسین تحتانیہ وامرگدہ و کانگرتی شریک جلسہ تھے۔ علاوہ ازیں مولوی عبدالواحد صاحب بی۔ اے انسپکٹر انجمن امداد باہمی ڈویژن یادگیر نے شرکت کی عزت بخشی۔ ٹھیک ۳½ بجے سے کارروائی انجمن کا حمد باری تعالیٰ و نظم سلامتی اعلیٰحضرت بندگان عالی و ترانہ دکن سے آغاز ہوا۔ مولوی منظور محمود صاحب صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ وامرگدہ نے تعلیم کی ضروریات پر نہایت مبسوط مضمون سنایا۔ اور چاہ مینار کی تعمیر پر تاریخ کا سبق دیا۔ اس کے بعد عبدالرزاق و گوبند راؤ نے بلحاظ حالات زمانہ تحتانی تعلیم کو غیر کافی بتلاتے ہوے لزوم تعلیم میٹرک و ضرورت شرکت مدارس فوقانیہ پر مکالمہ کیا۔ اس کے بعد صدر مدرس مدرسہ ہذا نے

فن تعلیم اور اس کی اہمیت پر تقریر کی۔ جناب انسپکٹر صاحب ممدوح نے شرکاء کی استدعا پر تحریک امداد باہمی اور تعلیم کے درمیانی تعلقات کو بوضاحت تمام بیان فرمایا اور توجہ دلائی کہ اساتذہ صاحبان باہمی اتفاق و اتحاد سے (جس طرح کہ اس وقت تین چار مدارس کے یہاں جمع ہیں) انجمن امداد باہمی کا افتتاح فرما کر اپنی مدد آپ کرنے کے اصول پر کاربند رہیں تو یقین ہے کہ اوروں پر بھی اس کا مفید اثر ہوگا۔ صدر نشین صاحب نے فن تعلیم اور نفسیات پر نہایت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے یہ ثابت فرمایا کہ انجمن اساتذہ کا وجود مدارس اور مدرسین ہر دو کے حق میں نہایت مفید و بہتر ہے۔ تبادلۂ خیالات سے اصول و طریقۂ تعلیم میں اضافہ اور مدرسین کی دقتوں اور پیچیدگیوں کا ارتفاع ہوتا ہے۔ اس کے بعد صدر مدرس صاحب مدرسہ ہذا نے جملہ اساتذہ صاحبان و معزز شرکاء و جناب انسپکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور قریب ۶ بجے یہ جلسہ نہایت کامیابی کے ساتھ برخاست ہوا۔ رات میں اساتذہ صاحبان و معززین کے خورد و نوش کا معقول انتظام تھا۔

تعمیر عمارت مدرسہ تحتانیہ وامرگدہ۔ قصبۂ وامرگدہ آبادی کی کثرت و سوتی و ریشمی صنعت و تجارت کے لحاظ سے شہرۂ آفاق ہے۔ یہاں ۱۳۲۶ف سے مدرسہ تحتانیہ کا قیام ہے۔ مکان مدرسہ عرصہ سے نہایت شکستہ و بوسیدہ حالت میں تھا۔ شیخ محمود صاحب نے مدرسہ ہذا کی کرسی صدارت پر متمکن ہونے کے بعد سب سے بڑا اور بے مثل کام تعمیر عمارت مدرسہ کا خیال کیا اور بڑی عرق ریزی و جانکاہی سے عالی جناب مولوی سید معین الدین صاحب بی۔ ایس، سی، بی۔ ٹی علیگ مہتمم تعلیمات ضلع ہذا کی گرانقدر نقد (۱۰۰) عطا اور سنین آیندہ کی گنجایش سے مزید اسلکہ منظوری کا وعدہ فرمانے پر مہاراجہ گوبند راؤ صاحب ساہو کے سبادلتاً اسلکہ نقد و ہر ممکنہ مدد سے ہاتھ بٹانے و نیز دیگر حامیان معاونان مدرسہ (جن میں سے علاوہ ساہو صاحب موصوف قابل الذکر جناب مسٹر رامچندر راؤ صاحب وکیل و چندر راؤ صاحب پٹواری و مسٹر بسیا صاحب مان پلی و جناب محبوب شریف صاحب دفعدار پولس و بیتیا صاحب کوڑگی ہیں) کے (۱۱عہ) نقد چندہ و حسب استطاعت ہر قسم کی درخت و مٹی و پتھر بار برداری کے لئے بلا اجرت بنڈی و مصلہ چندہ ناکارہ لکڑی کی قیمت (۵ عہ) کی قابل تشکر امداد سے مدرسہ ہذا کی بلڈنگ کو شاندار تعمیر کروا کر اپنے منصوبوں کو کامیاب کر دکھایا۔ جو عالیجناب صدر مہتمم صاحب کے حسن انتظام و تعلیمی شغف اور صدر مدرس صاحب موصوف کے بے لوث مساعی جمیلہ اور ساکنین قصبہ مذکور کی ہمدردی و علمی قدردانی کا ثبوت ہے جن کا یہ کام دیگر مدارس کے لئے سبق آموز و مشعل ہدایت ہوگا۔

نیز تاریخ قیام سے ۱۳۴۲ف تک یہ مدرسہ نہایت زبون حالت میں رہا لیکن موجودہ صدر مدرس صاحب نے صوری تعمیر عمارت کے نصب العین کے ساتھ معنوی ترقی مدرسہ کو اپنے مرکوز خاطر رکھ کر اپنے صرف ایک سالہ صدارت میں رعایا میں تالیف قلوب و تعلیمی شوق و ولولہ پیدا کر کے طلبہ و اسٹاف کے تعداد میں کافی اضافہ سے مدرسہ کو ترقی کے زینہ پر پہونچا کر دیگر مدارس تحتانیہ کے لئے نمونہ بنا دیا۔

طریقۂ تعلیم ریاضی

از ڈی سی تھوانگلے

گذشتہ سے پیوستہ

۴۔ دفعہ چہارم۔ محض مجرد اعداد کا استعمال اب ایسے سوالات دئے جائیں جن میں صرف مجرد طور پر اعداد پیش کئے جائیں چیزوں کے ساتھ تعلق دیکر اعداد پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ مثلاً ۳ اور ۲ ملکر کتنے ہوتے ہیں زبانی ۳ اور ۲ ملکر ۵ ہوتے ہیں تحریری ۳+۲=۵

۵۔ دفعہ پنجم مشقی مثالیں۔ ۵ کے ترکیبی اجزا کی کافی مشق ہونے کے خیال سے مندرجۂ ذ سوالات آخر میں دئے جائیں۔ (۱) ایک بچے کو اس کے والد نے ۳ پیڑے دئے اور اس کی ماں نے ۲ پیڑے دئے تو اس کو کل کتنے پیڑے ملے (۲) ایک گوالن پہلے روز ۲ سیر دودھ دوسرے روز ۲ سیر اور تیسرے روز ایک سیر دودھ لائی تو بتاؤ تین دن میں کل کتنے سیر دودھ ہوا

اس طرح کسی عدد کے اجزائے ترکیبی معلوم کرانے سے بچوں کو جمع کی مشق خود بخود ہوجائے گی اور آیندہ جمع کے اسباق دینے میں بالکل وقت محسوس نہ ہوگی

اجزائے ترکیبی کا تصور دلاتے وقت تفریق کا بھی عمل بچوں سے کرایا جاسکتا ہے مثلاً

۱۔ دفعہ اول بذریعہ اشیاء محسوسہ۔

۵۔ گولیوں میں سے دو گولیاں علحدہ رکھدینے کے لئے کہا جائے۔ اور باقی گولیوں کی تعداد دریافت کی جائے۔ بذریعہ سوال وجواب یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ ۵ گولیوں سے ۲۔ گولیاں کم کردی جائیں۔ تو ۳ گولیاں باقی رہتی ہیں۔ (زبانی)

۵ گولیاں۔ ۲ گولیاں = ۳ گولیاں۔ (تحریری) اسی طرح گولیوں میں سے ایک گولی کم کردیجائے تو باقی ۴ گولیاں رہتی ہیں۔ (زبانی)

۵۔ گولیاں۔ ۱ گولی = ۴ گولیاں۔ تحریری۔

۲ دفعہ دوم۔ بذریعہ اشکال پانچ مربع میں سے تین مربع الگ کئے جائیں تو باقی دو رہتے ہیں۔ (زبانی)

۵۔ مربع ۔ ۳۔ مربع = ۲ مربع

(تحریری)

۳۔ آسان عبارتی سوالات۔ بغیر اشیاء محسوسہ

احمد کے پاس ۵ سیب تھے ان میں سے تین سیب اس نے بشیر کو دیدیئے باقی سیب

اس کے پاس کتنے رہے؟

۵ سیب میں سے ۳ سیب دے دیے جائیں تو ۲ سیب رہتے ہیں۔ (زبانی)

۵ سیب - ۳ سیب = ۲ سیب (تحریری)

۴۔ دفعہ چہارم۔ مجرد اعداد۔

۵۔ میں سے ۳ کم کر دیے جائیں تو ۲ رہتے ہیں۔ زبانی)۔

۵ - ۳ = ۲ (تحریری)

۵۔ دفعہ پنجم۔ مشقی سوالات۔

ایک شخص کے پاس ۵ پیسے تھے۔ ان میں سے ۳ پیسے اس نے ایک فقیر کو دیئے تو اس کے پاس باقی کتنے پیسے رہے۔

۵ پیسوں میں سے ۳ پیسے خیرات دیئے باقی ۲ پیسے رہے (زبانی)

۵ پیسے - ۳ پیسے = ۲ پیسے۔ (تحریری)

اعداد شناسی اور اعداد نویسی کی مشق۔

گنتی کے اسباق کے ساتھ ساتھ مدرس بچوں میں قراءت و کتابت اعداد کی استعداد پیدا کرے۔ اعدادی ہندسوں کے مطابق بچوں سے اشیاء کی گنتی کرائے اور ہندسوں کے نزدیک بچوں سے ان اشیاء کو رکھوائے۔ مثلاً ان کی سلیٹ پر ۳، ۵، ۶، ۴ وغیرہ ہندسے لکھدئے جائیں۔ اور ان ہندسوں کے مطابق چیزوں کی گنتی کرا کے وہ چیزیں ان ہندسوں کے نیچے قرینہ سے رکھوادی جائیں۔ جیسا کہ ذیل میں بتایا جاتا ہے۔
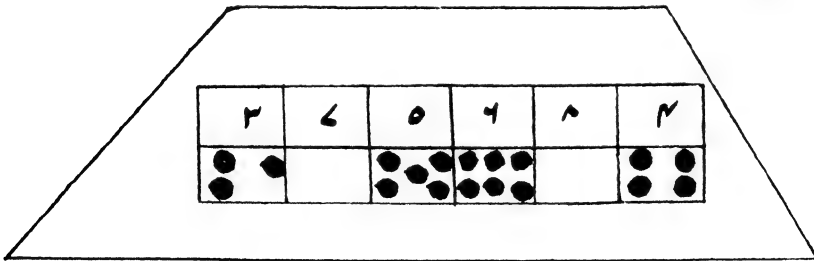
یہ خانے اس قدر بڑے بنائے جائیں کہ ان کے نیچے چیزوں کا مجموعہ آسانی سے رکھ سکیں چیزوں کی گنتی کرائی جائے اور اس گنتی کے مطابق ان چیزوں کے مجموعہ کے

نزدیک تعداد بتانے والا ہندسہ لکھوایا جائے۔ جیسا کہ ذیل میں بتایا جاتا ہے۔
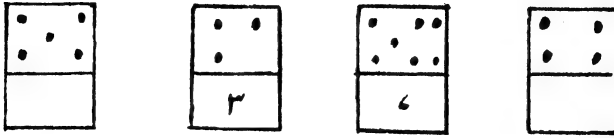
	٣	٧	

اس طرح کے مشق سے بچوں کو اعداد شناسی اور اعداد نویسی میں اچھی مہارت ہوسکتی ہے۔
بچوں کو کام میں مشغول رکھ سکتے ہیں۔ جس کی وجہ سے بچے جلد اکتاتے بھی نہیں۔

ایک سے ۱۰ تک کے اعداد کے تصور اور مشق کے لئے حسب ذیل تختہ کارآمد ہوسکتا ہے
۲ سے ۱۰ تک کے اعداد کے اجزاء ترکیبی کے لئے بھی یہ تختہ استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔ اور اس کی مدد سے اجزائے ترکیبی بچے فوراً معلوم کرسکتے ہیں۔ مثلاً ۶ ہندسے بتائی والی قطار ۱۰ ہندسے بتانے والی قطار پر رکھی جائے تو یہ معلوم ہوگا۔ ۶ سے ۱۰ بننے کے لئے اور ۴ کی ضرورت ہے۔ یعنے ۱۰ کے اجزائے ترکیبی ۶ اور ۴ ہوتے ہیں۔ ۷ ہندسے والی قطار ۹ ہندسے والی قطار پر رکھدی جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ ۷ سے ۹ بننے کے لئے ۲ کی ضرورت ہے یعنے ۹ کے اجزائے ترکیبی ۷ اور ۲ ہوتے ہیں۔

									١٠
								٩	٩
							٨	٨	٨
						٧	٧	٧	٧
					٦	٦	٦	٦	٦
				٥	٥	٥	٥	٥	٥
			٤	٤	٤	٤	٤	٤	٤
		٣	٣	٣	٣	٣	٣	٣	٣
	٢	٢	٢	٢	٢	٢	٢	٢	٢
١	١	١	١	١	١	١	١	١	١

Number Ladder

ایک سے دس تک کے اعداد کا زینہ

اوپر بیان ہوچکا ہے کہ ۱ سے ۹ تک کی گنتی سکھانے میں ان اعداد کا پختہ تصور دلانے میں اور ان کی قرأت و کتابت کی تعلیم میں بہت وقت صرف کرنا ہوگا۔ عمارت پائیدار و مضبوط ہونے کی غرض سے بنیاد ہی پختہ ڈالنی چاہئے۔ اگر بنیاد پختہ نہ ہو تو عمارت جلد گر جانے کا خوف رہتا ہے۔ ۱ سے ۹ تک کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے اجزائے ترکیبی بھی بتا دئے جائیں تو آئندہ جدید ابتدائی قاعدے سکھانے میں سہولت ہوگی۔

۱۰ کا تصور

دس کا تصور بھی اسی طرح دیا جاسکتا ہے جس طرح ایک سے ۹ تک کا تصور دلایا جاتا ہے۔ لیکن دس کی کتابت میں بچوں کو ایک نئی بات معلوم ہوگی ایک سے

نو تک کے اعداد ظاہر کرنے کے لئے ایک ایک ہی علامت (ہندسہ) بتائی گئی لیکن ۱۰ کے لئے دو علامتیں (ہندسے) بتائی جاتی ہیں جن میں سے ایک ہندسہ سے تو واقف ہوتے ہیں البتہ دوسرا ہندسہ (صفر) ان کے لئے بالکل نیا ہے۔ لہذا صفر کی بناوٹ اور اس کے معنی بچوں کو سمجھانا ضروری ہے۔ صفر کا تصور اور اس کی بناوٹ حسب ذیل طور پر سمجھائی جائے

بچے ایک سے نو تک کے ہندسوں سے واقف ہیں۔ ان کے سامنے چند چیزیں، مثلاً گولیاں رکھدی جائیں۔ اور کہا جائے کہ ان میں سے ایک ایک چیز الگ کرتے جائیں۔ اور باقی چیزوں کی تعداد بچوں سے اخذ کی جائے اور اس تعداد کو بتانے والا ہندسہ ان کے سلیٹ پر لکھوایا جائے۔ اس طرح ۹ سے ۱ تک کے ہندسے بچوں سے لکھوائے جائیں اور جب کوئی بھی چیز ان کے سامنے نہیں رہے گی۔ تو اس کی تعداد بچوں سے دریافت کی جائے۔ اگر یہ بتا سکیں تو دوسرا سوال کیا جائے کہ میرے پاس دو پیسے تھے وہ دونوں پیسے میں نے فقیروں کو دیدے۔ اب میرے پاس کتنے پیسے رہے۔ جواب کچھ بھی نہیں ملیگا اس کے بعد ان سے کہا جائے کہ ۹، ۸، ۷، ۶، وغیرہ کے لئے الگ الگ علامات ہیں اسی طرح کچھ بھی نہیں کیلئے کوئی علامت ہونی چاہئے کچھ بھی نہیں۔ کے لئے علامت۔ صفر بتا دی جائے۔ اور کچھ بھی نہیں کے لئے مختصر نام "صفر" بتایا جائے۔

صفر کا پختہ تصور دلانے کے لئے حسب ذیل سوالات کئے جائیں۔ تم صفر گولیاں اٹھاؤ مجھے صفر پیسے دو۔ تم صفر مرتبہ دوڑو۔ تم صفر مرتبہ کودو۔ وغیرہ وغیرہ۔ صفر کے معنی خالی کچھ بھی نہیں بتائے جائیں۔

صفر کا تصور اور اس کی علامت پوری طور پر ذہن نشین کرنے کے بعد ۱۰ کا ہندسہ کس طرح لکھتے ہیں۔ اور ۱۰ اس طرح کیوں لکھتے ہیں۔ بتایا جائے۔

بچوں سے دس دس چیزیں گنوائی جائیں اور ہر دس چیزوں کا مجموعہ انہیں سے بنوایا جائے۔ مثلاً دس تیلیوں کا ایک بنڈل بنوایا جائے۔ دس گولیوں کی ایک قطار بنوائی جائے۔ دس بیجوں کا ایک ڈھیر بنوایا جائے پھر یہ بات بچوں کے ذہن نشین کی جائے۔ دس چیزوں کے مجموعہ کو (خواہ وہ مجموعہ بنڈل ہو، قطار ہو۔ مالا ہو یا ڈھیر ہو) دہائی کہتے ہیں اور یہ بھی ان کو بتایا جائے کہ جس طرح دس چیزوں کے مجموعہ کو دہائی کہتے ہیں ایک چیز کو اکائی سے تعبیر کرتے ہیں۔ کافی مشق کے لئے بچوں سے مختلف چیزیں گنوا کر ان کو دہائی اور اکائی کی صورت

میں ظاہر کرنے کے لئے کہا جائے۔ مثلاً ۲۵ تیلیاں ان کے سامنے رکھدی جائیں اور کہا جائے
کہ ان میں سے دس دس تیلیوں کا ایک ایک بنڈل بنائیں۔ بذریعہ سوال و جواب یہ بات
ان سے اخذ کی جائے کہ ۲۵ تیلیوں کے ۲ بنڈل دس دس کے ہوتے ہیں۔ اور ۵
تیلیاں اکائیوں کی صورت میں رہتی ہیں یعنے ۲۵ میں ۲ دھائیاں اور ۵۔ اکائیاں
ہوتی ہیں۔ اس عمل کے بعد بچوں کو یہ کہدیا جائے کہ اپنے سامنے بائیں طرف دہائیوں
کے مجموعوں کو رکھدیں اور ان مجموعوں کے نیچے کی طرف دہائیوں کی تعداد بتانیوالا ہندسہ
لکھدیں اور دائیں طرف صرف اکائیاں رکھدیں اور ان کے نیچے کی طرف اکائیوں
کی تعداد بتانے والا ہندسہ لکھدیں۔ ۲۵ تیلیوں میں دہائیوں کے مجموعے ۲ ہیں
اور اکائیاں ۵ ہیں۔ ان کو حسب ذیل صورت میں ظاہر کیا جاتا ہے۔

دہائیاں　　　　اکائیاں

۲　　　　۵

اس لحاظ سے بچوں سے دس چیزیں گنوا کر سوال کیا جائے کہ ان کی کتنی دہائیاں
بن سکتی ہیں اور اکائیوں کی صورت میں کتنی چیزیں باقی رہتی ہیں اور جواب اخذ کیا جائے
کہ دس چیزوں کی ایک دھائی بنے گی۔ اور اکائیاں کچھ بھی نہیں رہیں گی۔ لہذا دہائی
کی تعداد بتانے والا ہندسہ اپنے بائیں طرف رکھدیا جائے۔ اور کچھ بھی نہیں۔ بتانیوالا
ہندسہ یعنے (صفر) دائیں طرف رکھکر دس کو مندرجہ ذیل صورت میں ظاہر کیا جائے

دہائی　　　　اکائی
کچھ بھی نہیں

اس طرح دس کا ہندسہ
۱۰ ظاہر کیا جاتا ہے۔

دہائی کا تصور کافی طور پر ہونے کے بعد ۲ دہائیاں ۳ دھائیاں بنوا کر ان کو
ہندسوں کی صورت میں ان کی سلیٹوں پر لکھوایا جائے مثلاً دو دہائیاں ۲۰ تین دہائیاں
۳۰ وغیرہ۔ طلبہ کو اس طرح عادی بنایا جائے کہ دہائیاں ظاہر کرنے والے ہندسے
دہائی کے خانے میں لکھدیں اور اکائی کے خانہ میں کچھ نہیں کی علامت ۰ لکھدیں

اس طرح تیس ۔ چالیس ۔ پچاس وغیرہ کی کتابت کا تصور دلایا جائے ۔

اا سے ۹ آنک کی قرات و کتابت

سابقہ وقفیت میں بچوں سے دس گولیاں ۔ دس تیلیاں ۔ دس بیج وغیرہ گنوائی گئی ہیں اب ان کو دھائی کی صورت میں ڈھیر یا بنڈل یا مالا جو صورت مناسب ہو تبدیل کرایا جائے اور دہائی کے نام سے تعبیر کرایا جائے ۔ بعد دس گولیوں میں ایک گولی اور زیادہ کی جائے اور کل گولیوں کی تعداد بچوں سے دریافت کی جائے ۔ ممکن ہے کہ کوئی بچہ "گیارہ" بتائے ۔ نہ بتانے کی صورت میں استاد خود کہدیگا کہ ۱۰ گولیوں میں ا گولی زیادہ کیجائے تو کل گولیوں کی تعداد گیارہ ہوتی ہے ۱۰ تیلیوں میں ا تیلی زیادہ کی جائے تو کل گیارہ تیلیاں ہوں گی ۔ ۱۰ اسی طرح دس میں ایک زیادہ کیا جائے ۔ تو اس عدد کو گیارہ کہتے ہیں ۔ الغرض گیارہ کا تصور ۔ ان کو ٹھیک طور پر دلایا جائے اور بعد میں گیارہ کو ہندسوں میں کس طرح ظاہر کرتے ہیں یعنے گیارہ کا ہندسہ بھی بتایا جائے ۔ ان سے بطور سوال و جواب یہ بات اخذ کیجائے کہ گیارہ میں ایک دہائی اور ایک اکائی کا ہندسہ "ا" دائیں طرف لکھکر اس کے بائیں طرف دھائی کا ہندسہ ا لکھتے ہیں ۔ لہذا گیارہ کے اس عدد کو حسب ذیل صورت میں بتایا جائے ۔ (۱۱)
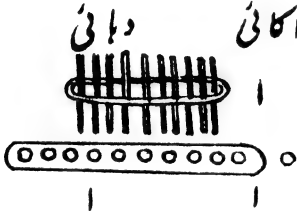
دہائی	اکائی
ا	ا

گیارہ کا تصور ٹھیک طور پر ہونے کے بعد بچوں کو یہ بتایا جائے اور بذریعہ تجربہ ان سے اخذ کیا جائے کہ جس طرح ایک دہائی اور ایک کو گیارہ کہتے ہیں ۔ ایک دہائی اور دو کو بارہ کہتے ہیں ۔ ایک دہائی اور تین کو تیرہ کہتے ہیں ۔ علیٰ ہذا انیس ۱۹ تک کا تصور اشیاء اور ہندسوں کے ذریعہ دلایا جائے اور حسب سابق اعداد مذکور کے اجزاء ترکیبی بھی بچوں سے نکلوائے جائیں ۔ ابتدا میں دہائی کو ظاہر کرنے والا ہندسہ اکائی کے ہندسہ سے کسی قدر بڑا لکھا جائے تاکہ بچے آسانی سے دہائیاں اور اکائیاں پہچان سکیں مثلاً ۔

۱۱ ، ۱۲ وغیرہ ۔

رفتہ رفتہ یہ طریقہ ترک کر دیا جائے اور دونوں ہندسہ مساوی پیمانے پر

عدد کے نام	اکائیاں	دہائیاں
گیارہ	۱	۱
بارہ	۲	۱

لکھے جائیں۔ بعد میں ہندسوں   تیرہ   ۳   ۱
کی قیمت ان کے مقام کے   چودہ   ۴   ۱
لحاظ سے بچوں کو ذہن نشین   پندرہ   ۵   ۱
کی جائے۔ مثلاً ۱۹ میں ۱ کی اصلی قیمت ۹ سے کم ہے۔ وغیرہ لیکن وہ دہائی کے مقام پر ہونے کی وجہ سے اس کی قیمت بجائے ایک کے دس ہے یعنے ۹ سے زیادہ ہے

اگر بچوں کو اکائی اور دہائی کی تمیز اچھی طرح ہوجائے تو ۲۰ کی قرأت وکتابت میں ان کو بالکل دقت محسوس نہ ہوگی ۱۹ میں ایک دہائی اور ۹ اکائیاں ہوتی ہیں اُن میں ایک اکائی زیادہ کیجائے تو ایک دہائی اور دس اکائیاں ہوں گی۔ لیکن دس اکائیوں کی ایک دہائی بنتی ہے لہذا کل دو دہائیاں ہوں گی اور اکائی میں کچھ نہیں ہوگا لہذا بیں کو ۲۰ سے ظاہر کرتے ہیں۔

۲۱ سے ۹۹ تک کی قرارت و کتابت

اس کی تفہیم میں بھی وہی طریقہ تعلیم اختیار کیا جائے جو ایک سے نو تک کے اعداد کے تصور دلانے کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔ دس چیزوں کی گنتی ہوتے ہی ان کی دہائیاں بنائی جائیں۔ مکمل دہائیوں کو دہائی کے درجہ میں اور اکائیوں کو اکائی کے درجہ میں دہائی کی دائیں طرف لکھدیا جائے اور اکائی نہ ہونے کی صورت میں اس کی جگہ یعنے اکائی کے درجہ میں صفر کی علامت لکھدی جائے۔ البتہ ان اعداد کا تصور دلانے میں بھی مقرون اشیاء کا استعمال کرنا اور طلبہ کی ذاتی کوشش و تجربہ سے کام لینا ضروری ہے۔ ان کی قوت باصرہ ولامسہ سے کام لیا جائے۔ اور ان کی قوت متخیلہ کی بھی تربیت کی جائے۔

مندرجۂ بالا طریقہ سے اعداد کا تصور دلانے میں اعداد کے مختلف نام مثلاً۔ اکیس۲۱۔ بائیس۲۲۔ تیئیس۲۳ یا اکاون۔ باون۔ ترپن وغیرہ وقت واحد میں یاد رکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اعداد کو دہائیوں اور اکائیوں کی صورت میں ظاہر کرنا کافی ہے مختلف نام تجربہ اور مشق سے ان کو یاد ہوں گے۔ اکیس۲۱۔ بائیس۲۲۔ تیئیس۲۳ وغیرہ کہنے کی بجائے اگر بچے یہ کہدیں کہ دو دہائیاں اور ایک اکائی۔ دو دہائیاں اور دو اکائیاں دو دہائیاں۔ اور تین اکائیاں وغیرہ تو کافی ہے۔ بعد میں مروجہ نام ان کو بتائے جائیں اس طرح ۹۹ تک کے اعداد بچے ذاتی تجربہ سے اور استاد کی رہنمائی سے معلوم

کر سکتے ہیں۔ ۹۹ کو وہ ۹ دہائیوں اور ۹ اکائیوں سے ظاہر کر سکتے ہیں۔

گنتی کے اسباق دیتے وقت ہی بچوں میں ہندسوں کی مقامی قیمت کا تصور پختہ طور پر قائم کیا جائے تاکہ آئندہ ابتدائی چار قاعدوں میں نیچے کے درجہ کے اعداد کو اوپر کے درجہ میں یعنے اکائیوں کو دہائیوں میں اور دہائیوں کو سینکڑوں میں تبدیل کرتے وقت دقت محسوس نہ ہو۔ اعداد نویسی کے سوالات میں ہندسوں کی مقامی قیمت کا علم ہونا بہت ضروری ہے۔ اس کی اہمیت ہرگز نظر انداز نہ کیجائے۔ ابتدا میں تمام تحریری سوالات میں اعداد نویسی کے وقت اعداد کے مختلف مدارج ظاہر کرنے کے لیے خانوں کا استعمال کیا جائے اور ان میں سیکڑہ دہائی اکائی وغیرہ لکھکر ان کے مطابق ہندسے ترتیب وار مختلف خانوں میں لکھے جائیں۔ یہ بات بچوں کے ذہن نشین کی جائے کہ سب سے چھوٹے درجہ کا یعنے اکائی کا ہندسہ دائیں طرف لکھا جائے اس سے اوپر کے درجہ کا یعنے دہائی کا ہندسہ اکائی کے بائیں طرف اور دہائی سے اوپر کا یعنے سیکڑہ کا ہندسہ دہائی کی بائیں طرف لکھتے ہیں۔ جس قدر اعداد کا درجہ بڑھتا جائے گا اس قدر اس کا مقام بائیں طرف منتقل ہوتا جائیگا۔ اعداد کی مقامی قیمت کا کافی تصور ہونے کے لئے اعداد نویسی میں کافی مشق کی ضرورت ہے۔ مثلاً ۵۵ میں دونوں ۵ کی مقامی قیمت کیا ہے؟ ۷۸ میں ۸ کی مقامی قیمت زیادہ ہے یا ۷ کی۔ علیٰ ہذا۔

سَو کا تصور اور اس کی قرأت و کتابت

بچوں کو ۹۹ کا تصور ہو چکا ہے۔ سوال وجواب کے ذریعہ وہ یہ بتا سکیں گے کہ ۹۹ میں ۹ اکائیاں اور ۹ دہائیاں ہیں۔ ان میں اگر ایک اکائی ملائی جائے تو کیا نتیجہ ہوگا۔ بچے جواب دیں گے کہ ۹ دہائیاں اور دس اکائیاں ہوں گی بعد میں یہ سوال کیا جائے گا کہ ایک دہائی میں کتنی اکائیاں ہوتی ہیں یا کتنی اکائیوں کی ایک دہائی بنتی ہے۔ جواب ملیگا کہ ۱۰ اکائیوں کی ایک دہائی بنتی ہے۔ اس لحاظ سے ۹ دہائیاں اور دس اکائیاں ملکر ۹ دہائیاں اور ایک دہائی بنتی ہے یعنے کل ۱۰ دہائیاں بنتی ہیں۔ بعد میں مدرس یہ سمجھائیگا کہ جس طرح دس اکائیوں کے مجموعہ کو ایک دہائی کہتے ہیں۔ اسی طرح دس دہائیوں کے مجموعہ کو ایک سو یا ایک سیکڑہ کہتے ہیں۔ اور اس کا درجہ اعداد نویسی میں دہائی کی بائیں طرف ہوتا ہے اس طرح اگر ایک سو ظاہر کرنا ہو تو سیکڑہ کے خانے میں

سیکڑہ	دہائی	اکائی
۱	۰	۰

ایک۔ دہائی اور اکائی کے خانوں میں کچھ نہیں کی علامت صفر رکھدیتے ہیں۔ اور ایک سو کا ہندسہ
۱۰۰ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ سو (۱۰۰) تک کی گنتی اور اس کی قرات و کتابت کی تفہیم میں
بہت سا وقت مدرس کو صرف کرنا ہوگا اگر ان اعداد کے متعلق معلومات پختہ طور پر
بچوں کو بہم پہونچائے جائیں۔ اور ان سے کافی مشق کرائی جائے تو بڑے درجوں کے اعداد
کا تصور دینا بہت ہی آسان ہوگا اور اعداد نویسی میں بہت کم دقت محسوس ہوگی۔

اعداد نویسی اور اعداد شناسی کے لئے مندرجہ ذیل تختہ کارآمد ہوسکتا ہے۔ اگر یہ خیال
کیا جائے کہ جب تک تمام اعداد کا تصور بچوں کو نہ دلایا جائے اعداد نویسی کا کام شروع
نہیں کیا جاسکتا۔ تو اس صورت میں بچوں کی ترقی بہت ہی آہستگی سے ہوتی رہے گی۔ کیونکہ
بڑے بڑے اعداد کا پوری طور پر تصور دلانا ایک مشکل کام ہے۔ لاکھ یا کرور کا تصور اشیاء
محسوسہ کے ذریعہ دلانا ممکن نہیں ہے۔ ایسے بڑے بڑے اعداد سکھانے میں بچوں کی قوت
متخیلہ ہی سے کام لیا جائے۔ ابتدائی جماعت میں اتنا سمجھ لیں تو کافی ہے کہ ۱۰ اکائیوں
کی ایک دہائی ہوتی ہے۔ دس دہائیوں کا ایک سیکڑہ ہوتا ہے اور دس سیکڑے کا ایک ہزار ہوتا
ہے۔ اعداد کی ساخت سمجھنے کے لئے ۱۰۰ تک کا تصور پوری طور پر دلانا کافی ہے بالعموم
کے ایک تار پر دس گولیاں ہوتی ہیں۔ ایسے دس تار پر کل سو ۱۰۰ گولیاں ہوتی ہیں۔

تختہ بغرض مشق اعداد نویسی اور اعداد شناسی

۱	۱۱	۲۱	۳۱	۴۱	۵۱	۶۱	۷۱	۸۱	۹۱
۲	۱۲	۲۲	۳۲	۴۲	۵۲	۶۲	۷۲	۸۲	۹۲
۳	۱۳	۲۳	۳۳	۴۳	۵۳	۶۳	۷۳	۸۳	۹۳
۴	۱۴	۲۴	۳۴	۴۴	۵۴	۶۴	۷۴	۸۴	۹۴
۵	۱۵	۲۵	۳۵	۴۵	۵۵	۶۵	۷۵	۸۵	۹۵
۶	۱۶	۲۶	۳۶	۴۶	۵۶	۶۶	۷۶	۸۶	۹۶
۷	۱۷	۲۷	۳۷	۴۷	۵۷	۶۷	۷۷	۸۷	۹۷
۸	۱۸	۲۸	۳۸	۴۸	۵۸	۶۸	۷۸	۸۸	۹۸
۹	۱۹	۲۹	۳۹	۴۹	۵۹	۶۹	۷۹	۸۹	۹۹
۱۰	۲۰	۳۰	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰

اعداد شماری کی تعلیم دیتے وقت مندرجہ بالا تختہ خوش نویس سے تیار کیا ہوا اگر جماعت میں بچوں کے سامنے رکھا جائے تو اس تختہ کی مدد سے ۱۰۰ تک کے اعداد کی بناوٹ ان کو معلوم ہوگی اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہر ایک سابقہ عدد میں ایک زیادہ کرنے سے دوسرا عدد بنتا ہے۔ اور تختہ پر نظر ڈالنے سے بچے یہ دیکھ سکیں گے کہ ۱۳ یعنی ۱۰ اور ۳، ۲۶ یعنی ۲۰ اور ۶ اور ۷۴ یعنی ۷۰ اور ۴ علیٰ ہذا۔ تختہ مذکور کی مدد سے ان کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ ۷ میں متواتر ۱۰ جمع کرنے سے ایک ایک دہائی زیادہ کرنے سے ۱۷، ۲۷، ۳۷ وغیرہ بنتے ہیں۔ یہی تختہ آئندہ نظری طور پر ۱۰۰ تک کی جمع و تفریق کے لئے بھی کام آئیگا۔

بچوں کو صفر کی اہمیت زیادہ تر اس وقت محسوس ہوگی جب ان کو اعداد نویسی کا کام کرنا ہوگا۔ مثلاً دو سو پانچ کو ہندسوں میں اگر ظاہر کرنا ہو تو وہ سیکڑہ کے خانہ میں ۲ کا ہندسہ لکھینگے اور دہائی کے خانہ میں لکھنے کے لئے کوئی عدد نہیں ہے لہذا اس خانہ میں کچھ نہیں کی علامت (۰) صفر رکھدیں گے اور اکائی کے خانہ میں ۵ رکھ دیں گے اس طرح دو سو پانچ کو ۲۰۵ سے ظاہر کریں گے۔

سیکڑہ	دہائی	اکائی
۲	۰	۵

بچوں کو اعداد نویسی کی کافی مشق ہونے کے بعد سکڑہ دہائی اکائی وغیرہ کے الفاظ ہندسوں کے اوپر لکھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ طریقہ مذکور کو ترک کر دیا جائے۔ اور متعلقہ ہندسوں کی مقامی قیمت دل میں قرار دیکر ہندسے دیدئے جائیں۔

چار ہندسوں کی اعداد نویسی میں مندرجہ ذیل قسم کا چوکھٹا کسی قدر مفید ثابت ہوگا اس چوکھٹے میں چار تار عمودی طور پر لگائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ہر ایک تار کے اوپر کی جانب اعداد کے درجے مثلاً ہزار سینکڑہ۔ دہائی اکائی وغیرہ بائیں جانب سے دائین جانب ترتیب دیکر ظاہر کئے جاتے ہیں۔ مثلاً دائیں ہاتھ کی طرف کی پہلے تار پر کی گولیاں اکائیاں ظاہر کریں گی۔ اس کی بائیں طرف کے تار پر کی گولیاں دہائیاں ظاہر کریں گی اسی طرح درجہ بدرجہ بائیں طرف کے تاروں پر سینکڑہ ہزار بتائے جائیں گے۔ استعمال کے وقت چوکھٹا زمین پر

ہزار	سینکڑہ	دہائی	اکائی

اس طرح رکھیں گے جیسی کہ وہ ہمیشہ رکھا کرتے ہیں تاکہ اکائی کے خانہ کے نیچے اکائی کی گولیاں دہائی کے خانہ کے نیچے دہائی کی گولیاں نظر آئیں اور جو عدد حسب مطلوب ہے اس کے درجہ کے مطابق گولیاں نیچے کی طرف تار پر اتاری جائیں گی ذیل کی شکل میں ہزار کے تار پر کی ۲ گولیاں سیکڑے کے تار پر کی

ہزار سیکڑہ دہائی اکائی

۲ ۵ ۳ ۴

ہزار	سیکڑہ	دہائی	اکائی
۲	۵	۳	۴
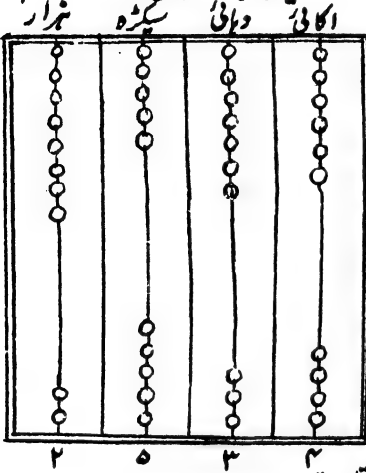
۵ گولیاں دہائی کے تار پر کی ۳ گولیاں اور اکائی کے تار پر کی ۴ گولیاں اتری ہوی ہیں لہذا عدد مطلوبہ دو ہزار پانچ چونتیس (۲۵۳۴) ہے اس طرح اعداد نویسی کی مشق کے لئے اور مقامی قیمت کے پختہ تصور کے لئے یہ چوکھٹا کارآمد ہوسکتا ہے۔

جمع اعداد کا تصور دلاتے وقت اشیاء محسوسہ کی مدد سے بچے جمع کا طریقہ سمجھ لیتے ہیں مثلاً ۶ گولیاں اور ۴ گولیاں ملکر ۱۰ گولیاں ہوتی ہیں۔ ۶ انار اور ۴ انار ملکر ۱۰ انار ہوتے ہیں۔ ۶ قلم اور ۴ قلم ملکر ۱۰ قلم ہوتے ہیں۔ ۶ چیزیں اور چار چیزیں ملکر ۱۰ چیزیں ہوتی ہیں۔ اور آخر میں مجرد اعداد کا استعمال کرکے ۶ اور ۴ ملکر ۱۰ ہوتے ہیں۔ یہ بات بچوں سے اخذ کرائی جاتی ہے۔ اعداد کے اجزائے ترکیبی کا تصور دلاتے وقت بھی بچوں کو جمع کا طریقہ کسی قدر معلوم ہوسکتا ہے اس لئے اب جمع تحریری سکھانے میں دقت محسوس نہ ہوگی۔

ابتدا میں بچوں سے معروف اشیاء مثلاً تیلیاں۔ بیج وغیرہ کے ذریعہ جمع کا عمل کرایا جائے کسی بچے کو ۶ تیلیاں دیجائیں اور ان میں ۳ تیلیاں زیادہ کرنے کے لئے کہا جائے اور ان سے کل تیلیاں گنوا کر یہ نتیجہ اخذ کرایا جائے کہ ۶ تیلیاں اور ۳ تیلیاں ملکر ۹ تیلیاں ہوتی ہیں۔ یعنے ۶ اور ۳ ملکر ۹ ہوتے ہیں۔

دوسرے بچے کو ۵ بیج دے جائیں۔ اور ان میں ۴ بیج زیادہ کرنے کے لئے کہا جائے

اوگنوا کر یہ نتیجہ اخذ کرایا جائے کہ ۵ بیج اور ۴ بیج ملکر ۹ بیج ہوتے ہیں یعنے ۵ اور ۴ ملکر ۹ ہوتے ہیں۔ اسی طرح ۷ اور ۲ = ۹، ۱ اور ۸ = ۹ وغیرہ باتیں بچّوں سے اخذ کرائی جائیں۔

اکائیوں کی جمع

اکائیوں کی جمع سکھانے میں وہی اشیاء استعمال میں لائی جائیں جو اعداد کا تصور دلانے میں پیش کیگئی تھیں۔ اگر بچوں کو اکائیوں کی جمع اچھی طرح سمجھائی جائے تو بچے آسانی سے اکائیوں کی جمع کے سوالات حل کریں گے۔ اس صورت میں مدرس کا کام صرف سوالات کو مناسب طور پر مرتب کرنا اور ان کا مفہوم بچوں کو ٹھیک طور پر سمجھانا ہوگا۔ جہاں اعدادی تصاویر یا کنڈرگارٹن کی تیلیاں یا اور کسی چیزوں کا میسّر آنا ممکن نہ ہو ایسی صورت میں بالفریم اور تختہ سیاہ کے استعمال سے بھی جمع کے سوالات بتائے جاسکتے ہیں۔ جمع سکھانے میں حسب ذیل طریقہ اختیار کیا جائے۔

(۱) عدد ۴ کہا جائے۔ بالفریم پر ۴ گولیاں گنوائی جائیں اور تختہ سیاہ پر ۴ کا ہندسہ لکھدیا جائے۔ اسی طرح دیگر اعداد کے ساتھ جن کو جمع کرنا ہے عمل کیا جائے۔

۲۔ ہر صورت میں چیزوں کی گنتی پہلے ہونی چاہئے۔ اور بعد میں ہر دو اعداد تختہ سیاہ پر لکھے جائیں۔

۳۔ جمع کا عمل حسب ذیل مدارج میں منقسم کیا جائے۔

۲ گولیاں اور ۳ گولیاں ملکر ۵ گولیاں ہوتی ہیں۔ اس لئے ۲ اور ۳ ملکر ۵ ہوتے ہیں۔ ۵ گولیاں اور ۴ گولیاں ملکر ۹ گولیاں ہوتی ہیں۔ اس لئے ۵ اور ۴ ملکر ۹ ہوتے ہیں

۴۔ مدرس ۲ کے نیچے ایک اُفقی خط کھینچکر جواب ۹ لکھدے طلبہ اسی طریقہ سے اُوپر کے ہندسے جمع کرتے آئیں اور جواب کی تصدیق کریں۔

۵۔ یہی عمل کنڈرگارٹن مکعب یا اینٹوں کے ذریعہ بھی بچوں سے کرایا جائے

□□ اور □□□ ملکر □□□□□

۲ مکعب + ۳ مکعب = ۵ مکعب

□□□□□ اور □□□□ ملکر □□□□□□□□□

۵ مکعب + ۴ مکعب = ۹ مکعب

مکعب کے ذریعہ اعداد کے اضافہ کا تصور بچوں کے ذہن نشین ہو سکتا ہے اس صورت میں بھی تختہ سیاہ کا استعمال ہونا ضروری ہے انواع و اقسام کی چیزوں کے استعمال کرنے سے حساب کے اصول کی تحقیق اور صداقت بچوں کے دل پر نقش کی جا سکتی ہے اور وہ یقینی طور پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ خواہ کوئی شی استعمال میں لائی جائے ۴ اور ۳ ملکر ۷ ہی ہوتے ہیں۔ اور اس کے ذریعہ ان کو مجرد اعداد کی جمع کا تصور پختہ طور پر اور آسانی کے ساتھ دلایا جا سکتا ہے

(۶) اس کے بعد مقرون اشیار کا استعمال ترک کیا جائے اور جمع کا عمل زبانی کیا جائے۔ اکائیوں کی جمع کی مشق حسب ذیل طریقہ پر کرائی جائے۔

کسی عدد میں دو دو جمع کئے جائیں مثلاً ۲ میں ۲ جمع کرنے سے ۴ ہوتے ہیں ۴ میں دو جمع کرنے سے ۶ ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ الفاظ "جمع کرنے سے" "اتنے ہوتے ہیں" کہنا ترک کر دیا جائے اور دل میں جمع کا عمل کر کے نتیجہ حسب ذیل ظاہر کیا جائے۔ ۲، ۴، ۶، ۸، ۱۰ وغیرہ

۳ سے شروع کر کے دو دو ملانے سے ۔ ۳۔ ۵۔ ۷۔ ۹۔ ۱۱۔ وغیرہ

۷ سے شروع کر کے تین تین جمع کرنے سے ۷۔ ۱۰۔ ۱۳۔ ۱۶۔ وغیرہ

اس طرح اگر اکائیوں کی جمع کی زبانی مشق پختہ ہو جائے تو آئندہ جمع کے بڑے بڑے سوالات حل کرنے میں مطلق مشکل محسوس نہیں ہوگی اور استاد اور شاگرد دونوں کا کام بالکل آسان ہوگا۔

	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹
۹	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶	۱۷	۱۸
۸	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶	
۷	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴		
۶	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲			
۵	۷	۸	۹	۱۰				
۴	۶	۷	۸					
۳	۵	۶						
۲	۴							

صرف اکائیوں کی جمع کے لئے یہ تختہ کار آمد ہو سکتا ہے۔ تختہ مذکورہ سے ظاہر ہوگا کہ اکائیوں کی جمع میں صرف ۳۶ ہی اعداد یاد رکھنے ہوں گے۔ جن میں سے آٹھ اعداد ضربی دو کا پہاڑہ تیار کرتے وقت پائے جائیں گے مثلاً

۲ + ۲ = ۴، ۳ + ۳ = ۶، ۴ + ۴ = ۸ ......

۹ + ۹ = ۱۸۔ الغرض اگر یہ ۳۶ اعداد بچے پختہ طور پر یاد رکھیں تو جمع کے ہر ایک نتیجہ کو جلد پہونچ سکیں گے۔

تختہ مذکور کا استعمال حسب ذیل طریقہ پر کیا جائے۔
اگر ہمیں ۷ اور ۵ کا حاصل جمع مطلوب ہے تو عمودی حاشیہ کی بائیں طرف ۷ کا ہندسہ دیکھ لیں اور افقی حاشیہ کی اوپر کی طرف ۵ کا ہندسہ دیکھ لیں ا... ۷ سے افقی سمت میں دائیں طرف اور ۵ سے عمودی سمت میں نیچے کی طرف دیکھیں۔ جہاں یہ دونوں سمتیں ملتی ہوں وہ ہندسہ (یعنے یہاں پر ۱۲) ۷ اور ۵ کا حاصل سمجھا جائے۔ ۷ اور ۵ کا حاصل جمع وہی ہے جو ۵ اور ۷ کا حاصل جمع ہے یعنے ۷ + ۵ = ۵ + ۷ یہ بات بچوں کو بذریعہ تجربہ سمجھائی جائے جن دو اکائیوں کو جمع کرنا ہے ان میں سے بڑا عدد عمودی حاشیہ کی بائیں طرف اور چھوٹا عدد افقی حاشیہ کی اوپر کی طرف دیکھکر بڑے عدد کی افقی سمت اور چھوٹے عدد کی عمودی سمت جہاں ملیں گی وہ عدد دونوں اعداد کا حاصل جمع ہوگا۔ اکائیوں کی جمع کی مشق بچوں سے اسقدر کرائی جائے کہ کسی دو اکائیوں کی جمع وہ حفظ یاد رکھ سکیں تاکہ آئندہ کسی دو عددوں کو جمع کرتے وقت دقت محسوس نہ ہو اور حاصل جمع آسانی سے دریافت کرسکیں نیز بچے صرف اتنا ہی نہ سمجھیں کہ ۶ اور ۸ ملکر ۱۴ ہوتے ہیں۔ بلکہ تجربہ سے وہ یہ معلوم کرسکیں گے کہ جن اعداد کے اکائی کے ہندسے بالترتیب ۶ اور ۸ ہوں اور ان اعداد کو اگر جمع کرنا ہو تو حاصل جمع میں۔ اکائی کے درجہ پر ۴ ہی کا ہندسہ ہوا کرے گا۔
بچوں کو ان کے ذاتی تجربہ سے یہ بات بھی معلوم کرائی جائے کہ بڑے عدد میں چھوٹا عدد جمع کرکے حاصل جمع دریافت کرنا آسان ہے بہ نسبت چھوٹے عدد میں بڑا عدد جمع کرکے حاصل جمع دریافت کرنے کے۔ مثلاً ۲ اور ۸ کا حاصل جمع دریافت کرنا ہے۔ ۲ میں ۸ جمع کرکے نتیجہ دریافت کرنا کسی قدر مشکل ہوگا۔ مگر ۸ میں ۲ جمع کرکے حاصل جمع آسانی سے دریافت کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں جمع کرنے کا عدد چھوٹا ہونے کی وجہ سے منزل مقصود کو جلد پہونچ سکتے ہیں۔ نتیجہ دونوں صورتوں میں ایک ہی ہوگا ۲ + ۸ = ۸ + ۲ = ۱۰ بذریعہ اشیاء محسوسہ بچوں کو یہ بات سمجھائی جائے کہ اعداد کی ادل بدل کرنے سے حاصل جمع میں فرق نہیں آتا۔ اور بڑے عدد میں چھوٹا عدد جمع کرکے حاصل جمع دریافت کرنا بہت آسان ہے ۹ + ۱ = ۱ + ۹ = ۱۰، ۷ + ۳ = ۳ + ۷ = ۱۰ وغیرہ۔

جمع کی مشق کے لئے حسب ذیل طریقہ بھی مفید ثابت ہوگا۔

مدرس تختۂ سیاہ پر ایک دائرہ کھینچے اور اس کے محیط پر ایک سے نو تک کے ہندسے کسی ترتیب سے لکھے اور جو عدد جمع کرنا ہو وہ ہندسہ مرکز پر لکھدے۔ اس عدد کو محیط کے ہر ایک عدد میں بچوں سے یکے بعد دیگر جمع کرائے اور زبانی ہی نتیجہ اخذ کرائے۔ مثلاً ایک بچے سے ۲ اور ۴ کا حاصل جمع دریافت کرایا جائے دوسرے سے ۳ اور ۴ کا تیسرے سے ۶ اور ۴ کا چوتھے سے ایک اور ۴ کا علی ہذا۔ اس قسم کی مشق سے تمام جماعت ایک کام میں مشغول رہتی ہے اور پھرتی اور صحت کے ساتھ جواب نکلوانے میں یہ طریقہ کسی قدر مفید ثابت ہوگا۔

۲ ۳ ۶ ۱ ۸ ۹ ۷ ۵ ۴ — ۴
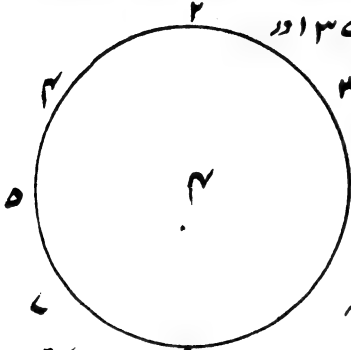
کسی صورت میں ابتدا میں جمع کے سوالات سلیٹوں پر نہ کرائے جائیں اگر تحریری کام ابتدا سے ہی زیادہ دیا جائے تو بچے گھبرائیں گے اور اس کا تعلیم حساب پر خراب اثر پڑیگا چھوٹے بچوں کے لئے لکھنے کا کام بہت تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے واضح اور صاف طور پر لکھنے کی کوشش کرنے میں بچے جلد تھک جائیں گے اور اس سبب سے تحریری حساب کے تعلقات سمجھنے سے وہ قاصر رہیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بالکل ابتدا میں تحریری عمل ان کے خیالات کے تسلسل میں رکاوٹ پیدا کریگا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حسابی تعلقات میں سلسلہ قائم نہیں رہ سکے گا۔ حساب کی تحریر بالکل چھوٹے بچوں کے حق میں مضر ہے زبانی مشق کے دوران میں تحریری مشق کی چنداں ضرورت نہیں۔

کافی زبانی مشق کے بعد تحریری مشق مناسب سمجھی جائے گی۔ اس صورت میں حسب ذیل قسم کے تاش کا استعمال عمل میں لایا جائے تو بچوں کو تحریری مشق تکلیف دہ نہ ہوگی۔ اور جواب کی ترتیب بھی ان کی سمجھ میں آئے گی۔ اور جواب صاف اور واضح طور پر لکھنے کی عادت ان میں پیدا ہوگی۔

صرف دس تک کی جمع کے تاش برائے مشق

جمع				+
۸	+	؟	=	۱۰
۶	+		=	۹
۵	+		=	۸
۷	+		=	۱۰
۴	+		=	۷

جمع				+
۱	+	۶	=	؟
۳	+	۵	=	؟
۴	+	۶	=	؟
۶	+	۳	=	
۵	+	۲	=	

مقررہ خانوں کی تکمیل منہدسوں کے ذریعہ طلبہ ہی سے کرائی جائے اعداد کا تصور دلاتے وقت اجزار ترکیبی بچوں سے نکلوائے گئے ہیں لہذا اس وقت جمع کرنے میں بچوں کو کسی قدر آسانی ہوگی تاہم جواب صحیح نہ آنے کی صورت میں اشیار محسوسہ کا استعمال کرکے بچوں سے جواب اخذ کرایا جائے۔ اور معزا خانوں کی تکمیل کرائی جائے۔

اکائیوں اور دہائیوں کی جمع

I جس میں حاصل نہ آئے۔ مثلاً ۱۴ + ۱۲

(۱) بذریعہ اشیا محسوسہ۔ چند طلبہ کے سامنے کچھ بیج دے جائیں اور ان سے کہا جائے کہ ان میں سے ایک مرتبہ ۱۴ چیزیں اُٹھائیں اور الگ رکھدیں۔ دوسری مرتبہ باقی چیزوں میں سے اور ۱۲ چیزیں اٹھائیں اور پہلے ڈھیر کے پاس رکھدیں۔ بعد میں یہ کہا جائے کہ ۱۴ چیزوں میں سے ۱۰ چیزوں کی ایک دہائی (بنڈل) بنائیں اور وہ دہائی (بنڈل) اپنی بائیں طرف اور اس کے پاس دائیں طرف باقی ۴ چیزیں رکھدیں

دہائی (بنڈل)　　　　اکائی

||||||||||　　||||

||||||||||　　||
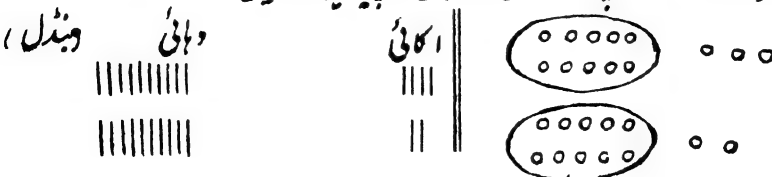
وہی عمل ۱۲ چیزوں کے ساتھ کیا جائے بعد میں ان سے دریافت کیا جائے کہ ان دونوں ڈھیروں میں ملکر کل دہائی (بنڈل) کتنی ہیں۔ اور کھلی چیزیں کتنی ہیں۔

اور یہ جواب اخذ کیا کہ ۲ بنڈل دس دس کے یعنے دو دہائیاں اور ۶ کھلی چیزیں یعنے اکائیاں ہوں گی۔ اور جواب ۲۶ ہوگا۔

ب ۔چیزوں کے ساتھ تعلق دیکر بغیر موجودگی اشیار محسوسہ

اشیار محسوسہ کی مدد سے مندرجہ بالا سوال کرنے پر اس کا تحریری عمل کرنے کا طریقہ تبایا جائے اور اُن کو کہدیا جائے کہ وہ دہائیوں کے نیچے دہائیاں لکھدیں اور ان دونوں اعداد کے نیچے ایک خط کھینچیں بعد اکائیوں میں اکائیاں جمع کر کے حاصل جمع اکائیوں کے درجہ میں لکھدیں اور دھائیوں میں دہائیاں جمع کر کے حاصل جمع دہائیوں کے درجہ میں لکھدیں اور جواب ۲ دہائیاں اور ۶ اکائیاں (۲۶) بتائیں۔

	دہائی	اکائیاں
گولیاں	۱	۴
"	۱	۲
"	۲	۶

ج ۔ بذریعہ اعداد مجرد۔

بچوں کو اس قسم کی جمع کا تصور ہوجانے کے بعد کہ ۱۴ گولیاں اور ۱۲ گولیاں ملکر ۲۶ گولیاں ہوتی ہیں۔ ۱۴ تیلیاں اور ۱۲ تیلیاں ملکر ۲۶ تیلیاں ہوتی ہیں۔ ۱۴ پیسے اور ۱۲ پیسے ملکر ۲۶ پیسے ہوتے ہیں۔ ۱۴ چیزیں اور ۱۲ چیزیں ملکر ۲۶ چیزیں ہوتی ہیں ان سے بذریعہ سوال و جواب یہ بات اخذ کرائی جائے کہ ۱۴ اور ۱۲ ملکر ۲۶ ہوتے ہیں۔ اور عمل حسب مندرجہ حاشیہ لکھتے ہیں

۱	۴
۱	۲
۲	۶

اس طرح متعدد سوالات بچوں سے حل کرائے جائیں اور بعد میں مشقی سوالات کے تاش دے جا کر ان سے جواب کی تکمیل کرائی جائے۔

مندرجہ ذیل قسم کے مشقی تاش مدارس خود تیار کر کے بچوں میں تقسیم کرے اور بچوں سے متراخانوں کی تکمیل کرا کے جواب نکلوائے۔

اکائی	دہائی	
۵ + ۱۰	=	۵
+ ۱۰	=	۱۱
+ ۱۰	=	۱۴
+ ۱۰	=	۱۶
+ ۲۰	=	۲۴

اکائی	دہائی	
۶		۳ + ۳ =
		۱۳ + ۳ =
		۴ + ۲ =
۶	۱	۱۴ + ۲ =
		۱۴ + ۱۲ =

دو ہندسوں کے اعداد کی جمع میں مدرس پہلے اس بات کا اطمینان کرے کہ بچے ان اعداد کے اجزائے ترکیبی سے پوری طرح واقف ہیں۔ اس لئے چند اعداد کے اجزاے ترکیبی بنا لئے جائیں۔ شلاً ۳۷، ۱۴، ۴۳ وغیرہ اعداد ان کے سامنے تختہ سیاہ پر لکھکر ان کی دہائیاں اور اکائیاں بچوں سے دریافت کی جائیں اور ان سے اکائی اور دہائی کے ہندسے متعلقہ ہندسوں میں لکھوائے جائیں ساتھ ہی مدرس اس بات کا بھی یقین کرے کہ بچوں کو نظام عشری کے پیمانوں سے واقفیت ہے شلاً ۱۰ اکائیاں = ۱ دہائی ۱۰ دہائیاں = ۱ سیکڑہ وغیرہ تاکہ آیندہ حاصل والی جمع میں یہ پیمانے ابتدا سے بتانے کی ضرورت نہ پڑے۔

اصل عدد	اکائی	دہائی
۳۷ =	۷	۳
۱۴ =	۴	۱
۴۳ =	۳	۴

II دو ہندسی اعداد کے حاصل والی جمع۔

جس میں صرف اکائیوں کی حاصل جمع کو دہائیوں میں تبدیل کرنے کی ضرورت ہو۔ شال ۳۷ + ۱۴ + ۴۳۔

ا۔ بذریعہ اشیار محسوسہ

بچوں کو ۳ بنڈل دس دس کے اور ۷ تیلیاں، ایک بنڈل دس کا اور ۴ تیلیاں اور ۴ بنڈل دس دس کے اور ۳ تیلیاں دیدیجائیں اور کہا جائے کہ وہ ان کو دہائیوں اور اکائیوں کی ترتیب میں رکھدیں۔

دہائی	اکائی
۳	۷
۱	۴
۴	۳
۸	۱۴

اس طرح ہندسوں کے درجوں کے مطابق بنڈل اور کھلی تیلیاں رکھکر بچوں سے ان کی گنتی کرائی جائے اور جواب اخذ کرایا جائے۔ کہ کل بنڈل دس دس کے ۸ ہیں۔ اور کھلی تیلیاں ۱۴ ہیں۔ اب ان سے دریافت کیا جائے کہ آیا ۱۴ تیلیوں ہیں

۱۰ تیلیوں کا ایک بنڈل بن سکتا ہے۔ ان سے دس تیلیوں کا ایک بنڈل بند ہوا یا جائے اور جملہ بنڈلوں کی تعداد دریافت کی جائے۔ نیز کھلی تیلیوں کی۔ اور یہ جواب اخذ کرایا جائے کہ جملہ بنڈلوں کی تعداد ۹ ہوگی اور کھلی تیلیاں ۴ ہوں گی۔ یعنی جواب ۹۴ ہوگا۔

ب۔ اعداد کا چیزوں کے ساتھ تعلق دے کر مگر بغیر موجودگی اشیا محسوسہ اشیاء محسوسہ کی مدد سے مندرجہ بالا سوال حل کرنے پر اس کا تحریری عمل بچوں کو بتایا جائے اعداد لکھنے کی ترتیب تو ان کو معلوم ہے لہذا ان سے چیزوں کی تعداد ہندسوں میں سلیٹوں پر لکھوائی جائے۔ نمونہ کے لئے تختہ سیاہ پر بھی وہ ہندسے لکھے جائیں بعد میں ان کو کہا جائے کہ وہ اعداد کو جمع کریں مثل سابق پہلے اکائیوں کو جمع کر کے ۱۴ اکائیاں اور دہائیوں کو جمع کر کے ۸ دہائیاں جواب بتائیں گے۔ اس کے بعد ان سے یہ دریافت کیا جائے کہ کھلی (اکائی) چیزوں کو بنڈل (دہائی) کی صورت میں کب تبدیل کرتے ہیں۔ ان سے یہ جواب اخذ کرایا جائے کہ دس چیزیں ہوتے ہی ایک بنڈل بناتے ہیں۔ اس لحاظ سے ۱۴ میں سے ۱۰ تیلیوں کا ایک بنڈل جدید تیار ہوگا۔ یہ جدید بنڈل اور سابق ۸ بنڈل ملکر ۹ بنڈل ہوئے اور ۴ کھلی تیلیاں رہیں

اکائی	دہائی	تیلیاں
۷	۳	"
۴	۱	"
۳	۴	"
۴ ①	۸ ①	"
۴	۹	"

لہذا کل مجموعہ (حاصل جمع) ۴ اکائیاں اور ۹ دہائیاں یعنی ۹۴ ہوا۔

حاصل کا تصور۔ بچوں کو یہاں پر یہ سمجھایا جائے کہ ۱۰ چیزیں ہوتے ہی ایک جدید بنڈل تیار کیا جاتا ہے اوسکو حاصل کا بنڈل کہتے ہیں۔ مثلاً اکائیوں کو جمع کرنے سے ۲۴ اکائیاں اگر آجائیں تو ان کی دو دہائیاں بن سکتی ہیں۔ لہذا یہاں حاصل کے ۲ سمجھے جائیں گے جو سابقہ دہائیوں میں ملائی جائیں گی۔ اگر اکائیوں کی حاصل جمع ۳۵ ہو تو حاصل کی ۳ دہائیاں ہوں گی علی ہذا۔

ج بذریعہ اعداد مجرد۔

اب بچوں سے یہ سوال کیا جائے کہ وہ ۳۷ + ۱۴ + ۴۳ کا حاصل جمع دریافت

دہائیاں	اکائیاں
۳	۷
۱	۴
۴	۳
۸ ①	① ۴
۹	۴

کریں ان کو کہا جائے کہ اعداد مذکور کو عمودی طور پر لکھیں اور جب اکائیوں کو زبانی جمع کریں تو عمل حسب ذیل ہو۔ ۳ اور ۴ سات ۷ اور ۷ چودہ جواب چودہ بتائیں گے اور وہ اکائیوں کے درجہ میں لکھدیں گے دہائیوں کی زبانی جمع حسب ذیل ہوگی ۴ اور ایک پانچ ۵ اور ۳ آٹھ ۔ ۸ کہکر وہ دہائیوں کے درجہ میں لکھدیں گے۔
اب مدرس ان سے دس اکائیوں کی ایک دہائی بنوائے گا (اور طلبہ سے کہیگا کہ اس جدید دہائی کو حاصل کی دہائی سمجھتے ہیں) اور سابقہ ۸ دہائیوں میں شامل کر لے گا۔ اکائیوں کے درجہ میں اب ۴ اکائیاں رہیں گی اور دہائیوں کے درجہ میں ۹ دہائیاں ہوں گی۔ جواب ۹۴ لکھا جائیگا۔ اس طرح عمل مدرس تختہ سیاہ پر کرے اور بچوں سے ان کی سلیٹوں پر کروائے دو ہندسوں کی اعداد کی جمع کی مشق بچوں سے کافی طور پر کرائی جائے اور وہ اعداد لکھکر آسانی کے ساتھ ان اعداد کا حاصل جمع دریافت کرسکیں۔ ان میں تاش تقسیم کرکے مشق اور جواب کی تکمیل کرائی جائے

۵۲ = ۲۷ + ۲۵
= ۴۵ + ۳۸
= ۳۲ + ۵۹
۲۸ + ۶۴

۴۱ = ۹ + ۱۷ + ۱۵
= ۱۰ + ۱۸ + ۲۲
= ۱۵ + ۱۲ + ۵۴
= ۱۶ + ۱۹ + ۱۳

اس قسم کی مشق کے بعد عبارتی سوالات بھی حل کرائے جائیں مثلاً ایک تاجر کو یکشنبہ کے روز ۱۵ روپیہ نفع ہوا۔ دوشنبہ کے روز ۱۷ روپیہ نفع ہوا۔ اور سہ شنبہ کے روز ۹ روپیہ نفع ہوا۔ تو بتاؤ کہ تین دن میں اس کو کل کتنا نفع ہوا۔
عمودی جمع کی بھی مشق بچوں میں تاش تقسیم کراکے جواب کی تکمیل بچوں سے کرائی جائے۔

۲۲
۱۵
۳۰
۱۹

۳۸
۱۵
۴۰
۷

دو ہندسی اعداد کی جمع جن کا حاصل جمع سو سے زیادہ ہو

مثال - ۷۸ + ۶۹

۱- پہلے مندرجہ بالا اعداد بچوں سے ترتیب وار لکھوا کر مدرس بھی خود تختہ سیاہ پر وہی اعداد ترتیب وار لکھے۔

اصل عدد		اکائی	دہائی
۷۸	=	۸	۷
۶۹	=	۹	۶

اکائیوں کو اکائیوں میں جمع کرنے کے لئے کہا جائے - ۹ - اکائیاں اور ۸ اکائیاں ملکر ۱۷ اکائیاں ہوتی ہیں - یہ جواب بچوں سے اخذ کرایا جائے بعد میں سوال کرکے یہ بات نکلوائی جائے کہ ۱۷ اکائیوں میں ۷ اکائیاں اور ایک دہائی ہوتی ہے لہذا ۷ اکائیوں کو اکائی کے درجہ میں لکھدیا جائے اور ایک دہائی دہائیوں میں جمع کرائی جائے

اس کے بعد کل دہائیوں کو جمع کرایا جائے ادہائی + ۶ دہائیاں + ۷ دہائیاں ملکر ۱۴ دہائیاں ہوتی ہیں - ۱۴ دہائیوں میں ۴ دہائیاں اور ایک سیکڑہ ہوتا ہے لہذا ۴ دہائیوں کو دہائی کے درجہ میں لکھدیا جائے۔ اور ایک سیکڑہ دہائیوں کی بائیں طرف رکھدیا جائے - حاصل جمع میں ہندسے متعلقہ درجوں میں بچوں سے لکھواکر مدارس خود تختہ سیاہ پر لکھے۔

اکائی	دہائی	سیکڑہ
۸	۷	
۹	۶	
۷	۴	۱

بچوں سے بھی یہی عمل مکمل طور پر کروایا جائے۔
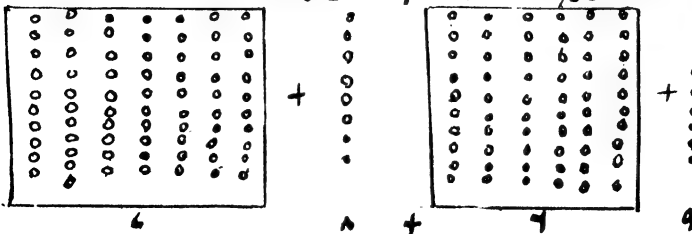
۷ + ۸ + ۶ + ۹

مندرجہ بالا سوال کا عمل اشکال کے ذریعہ ذیل میں بتایا جاتا ہے۔ اس سے بھی جواب کی تصدیق ہو سکتی ہے

۹ اکائیاں + ۸ اکائیاں = ۱۷ اکائیاں

۷ ؍؍ + ۱ دہائی حاصل کی

۱۴۰ دہائیاں
۴ دہائیاں ۱۔ سیکڑہ

۱ دہائی ۱۰ دہائیاں ایک سیکڑہ نو دہائیاں ۴ دہائیاں
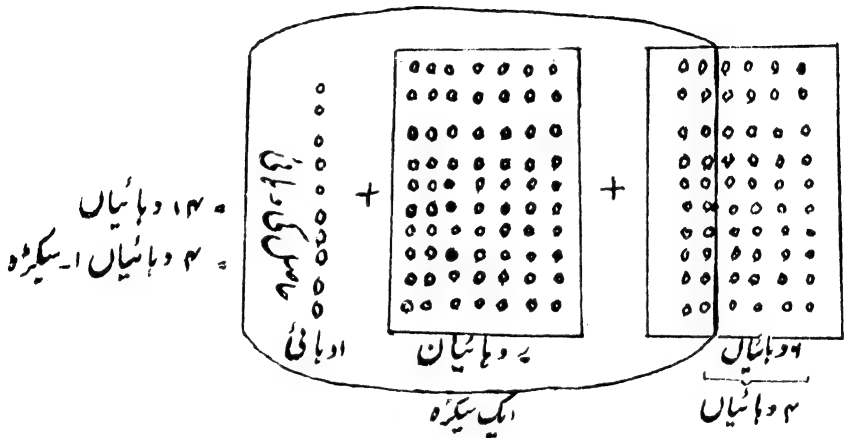
جواب ۷۔ اکائیاں ۴ دہائیاں ۱ سیکڑہ = ۱۴۷

تین ہندسوں کے اعداد کی جمع۔

۱۔ جمع بلا حاصل۔

چونکہ اب بچے اکائیوں کو آسانی سے ۹ تک (بموجب سبق اول) جمع کر سکتے ہیں لہٰذا مندرجہ ذیل قسم کے سوالات حل کرنے میں ان کو مطلق دقت محسوس نہ ہوگی۔

سیکڑہ	دہائی	اکائی
۲	۳	۱
۳	۴	۵
۱	۲	۲
۶	۹	۸

۲ اور ۵ سات ۷ اور ۱ آٹھ اکائیاں
۲ اور ۴ چھ، ۶ اور ۳ نو دہائیاں
۱۔ اور ۳ چار، ۴ اور ۲ سیکڑے
اب بچوں کو اس طرح عادی بنایا جائے

کہ وہ ۲ اور ۵ سات، ۷ اور ۱ آٹھ کہنے کے بجائے وہ ہندسوں کو دیکھتے ہی ۲، ۷، ۸، کہکر اکائیوں کے درجہ میں لکھدیں۔ ۲ اور ۴ چھ ۶ اور ۱ سات کہنے کے بجائے۔

۲، ۶ و ۹۔ کہکر ۹ کو دہائیوں کے درجہ میں لکھدیں اور اسی طرح ۱، ۴ ۶ کہکر ۶ کو سیکڑہ کے خانہ میں لکھدیں۔ اس طرح جلد جواب نکالنے کی عادت ہوجاتی ہے اس قسم کے سوالات میں سوائے مشق کے اور کوئی بات ملحوظ نہیں ہوسکتی۔

ب۔ حاصل والی جمع۔

طریقہ تعلیم وہی ہوگا۔ جو دو ہندسی جمع میں اختیار کیا جاتا ہے اب تعلیمی آلات کی چنداں ضرورت نہیں بچوں کی قوت متخیلہ سے کام لیا جاسکتا ہے البتہ بچے اگر سمجھ نہ سکیں تو اس صورت میں آلات کا یعنے اشیا محسوسہ کا استعمال بچوں کی تفہیم کے لئے مناسب سمجھا جائے گا۔ بچوں کو اعداد کے ہندسوں کی مقامی قیمت سے واقف ہونا ضروری ہے اور ساتھ ہی ۱۰ اکائیوں کی ایک دہائی اور دس دہائیوں کا ایک سیکڑہ اور دس سیکڑہ کا ایک ہزار یہ پیمانہ نظام عشری کا معلوم ہونا چاہئے۔

بچے عموماً تختہ پر جمع کے سوالات اتاریں اور ابتدا میں ہندسوں کے اوپر ان کے درجوں کا نام بھی مثلاً اکائی۔ دہائی سیکڑہ لکھدیں اور زبانی عمل حسب ذیل کریں۔

سیکڑہ	دہائی	اکائی
۲	۳	۴
۱	۲	۵
۱	۶	۸
۵	۲	۷

I پہلے اکائیوں کی جمع ۵ اور ۸ تیرہ ۱۳ اور ۴ سترہ اکائیاں جن میں حاصل کی ایک دہائی آتی ہے اور ۷ اکائیاں باقی رہتی ہیں جو اکائیوں کے درجہ میں لکھدیجائیں۔ اور حاصل کی ایک دہائی دہائیوں میں جمع کی جائے۔

II دہائیوں کی جمع۔ ۱ (حاصل کا) اور ۶ سات ۷ اور ۲ نو ۹ اور ۳ بارہ دہائیاں۔ جن میں دس دہائیوں کا ایک سیکڑہ حاصل آتا ہے۔ اور ۲ دہائیاں باقی رہتی ہیں۔ جو دہائیوں کے درجہ میں لکھدی جائیں اور حاصل کا ایک سیکڑہ سیکڑے میں جمع کیا جائے۔

III سیکڑوں کی جمع۔ ۱ (حاصل کا) اور ۱ دو اور ۱ تین، ۳ اور ۲ پانچ سیکڑے۔ سیکڑے کے درجہ میں لکھدئے جائیں اور جواب ۵۲۷ بتایا جائے کافی مشق کے بعد درجوں کے نام اعداد پر لکھنے کا طریقہ ترک کیا جائے

اور بچوں کو اس طرح عادی بنایا جائے کہ ۸ اور ۵ تیرہ، ۱۳، اور ۴ سترہ وغیرہ طول طویل عبارت میں کہنے کے بجائے صرف مندرجہ ذیل طور پر کہدیں ۸، ۱۳، ۱۷ اور ۱۷، سترہ کے ۷، حاصل آیا ۱، اکائی کے درجہ میں ۷ لکھدیں ۱، ۷، ۹، ۱۲، بارہ کے ۲ حاصل آیا ۱۔ دھائی کے درجہ میں ۲۔ لکھدیں، ۱، ۲، ۳، ۵، پانچ کے ۵ سیکڑے کے درجہ میں ۵ لکھدیں۔

کافی مشق ہونے تک حاصل کا ہندسہ اس درجہ کے اعداد کے اوپر یا نیچے لکھدیا جائے لیکن ہمیشہ کے لئے اس کا لکھنا ضروری نہیں۔

جمع کے سوالات کی جانچ اوپر سے نیچے کی طرف جمع کر کے اور بعد نیچے سے اوپر کی طرف جمع کر کے کرائی جائے۔ عمودی اور افقی دونوں طریقوں سے جمع کے سوالات حل کرائے جائیں مثلاً ۲۳۴ + ۱۲۵ + ۱۶۸ = ۵۲۷۔

بہت لمبے سوالوں میں ایک سطر یا ایک درجہ کی جمع کرنے پر خفیف سا آرام دیا جائے کیونکہ بعض بچے دیر تک توجہ نہیں قائم رکھ سکتے اگر جمع کرتے وقت توجہ دوسری طرف بٹ جائے تو سوال کا جواب صحیح آنا مشکل ہے جمع میں اکثر غلطیاں عدم توجہی کی وجہ سے ہوا کرتی ہیں۔

بچوں کو ہدایت کی جائے کہ جب ان کو پریشانی یا تکان معلوم ہو تو وہ ذرا کام روک دیں اور تھوڑی دیر تک دوسری طرف دیکھتے رہیں ذرا گہری سانس بھی لیں۔ لیکن اس وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ سوال کہاں تک حل کیا گیا ہے اور کہاں سے حل کرنا باقی ہے سوال جہاں تک حل ہوا ہو۔ اس مقام پر حاصل جمع کی نشانی پنسل سے لگانا نامناسب نہ ہوگا۔ کیونکہ بچے جلد بھول جاتے ہیں۔ اور بار بار وہی اعداد جمع کرنے لگتے ہیں۔ پہلی گنتی کہاں تک ہوئی تھی اس کا خیال ان کو مطلق نہیں رہتا۔

بچوں کی قوت متخیلہ اور استدلال کی تربیت کی غرض سے بچوں کو چند عباتی سوال ایسے دئے جائیں جن میں بچوں کو سوال سمجھ لینے کی اور بعد میں اس کو حل کرنے کی تدابیر سوچنے کی ضرورت محسوس ہو۔ مثلاً

۱۔ احمد کے پاس ۵ گولیاں ہیں۔ بشیر کے پاس احمد سے ۲ گولیاں زیادہ ہیں تو۔

احمد اور بشیر کے پاس ملکر کل کتنی گولیاں ہونگی۔

اس سوال میں جب تک بشیر کی گولیاں معلوم نہ ہوں دونوں کے پاس کی گولیوں کی تعداد صحیح طور پر معلوم نہیں ہوسکتی بشیر کی گولیوں کی تعداد معلوم کرنے کے لئے احمد کی گولیوں کی تعداد میں ۲ زیادہ کرنا ہوگا۔ یعنے ۵ + ۲ = ۷ گولیاں بشیر کے پاس ہوں گی۔ اب احمد اور بشیر کی گولیوں کو جمع کیا جائے اور جواب نکالا جائے (عمل) احمد کے پاس ۵ گولیاں۔ بشیر کے پاس ۲ گولیاں زیادہ یعنے بشیر کے پاس ۵ - ۲ - ۷ گولیاں احمد و بشیر کے پاس ملکر گولیوں کی کل تعداد۔

۵ + ۷ = ۱۲ ہوگی۔ جملہ ۱۲ گولیاں جواب۔

(۲) جماعت چہارم میں ۵ ا طلبا پڑھتے ہیں۔ جماعت سوم میں چہارم سے ۵ طلبہ زیادہ ہیں۔ جماعت دوم میں چہارم و سوم ملکر جتنے طلبہ ہیں اتنے طلبہ پڑھتے ہیں تو بتاؤ کہ دوم، سوم، چہارم ملکر طلبہ کی تعداد کیا ہوگی؟

اس قسم کے سوالات سے بچوں کی قوت متخیلہ اور استدلال کی تربیت ہوکر جمع کی مشق بھی ہوگی۔ جواب عجلت و صحت کے ساتھ نکلوانے کی کوشش ضرور کی جائے مدرس اس بات کا خیال رکھے کہ سوالات حل کرنے میں دو چیزیں یعنے عجلت و صحت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ لہذا مشق ہونی چاہئے۔ اور ہر وقت سوالات حل کرانے میں کتنا وقت صرف ہوگا اس کا بھی اندازہ لگا لینا چاہئے۔ صرف جلد حل کرنے سے مطلب نہیں ہونا چاہئے بلکہ کوشش کی جائے کہ جوابات صحیح ہوں۔ سوالات کی نقل اتارنے کی ضرورت نہیں صرف جواب بچوں سے دریافت کیا جائے۔ اگر سوالات اجتماعی ہوں تو کافی وقت دینے کے بعد مدرس اس سوال کا جواب کہدے اور بچے اپنے جواب کی جانچ خود کرلیں یا مدرس خود کرے یا دوسرے طلبہ سے کرائے اگر غلطی ہو تو اس کی تصحیح لازمی طور پر فوراً ہونی چاہئے۔ ورنہ سوالات کی اہمیت باقی نہیں رہے گی۔ صحیح جواب بچوں کے ذہن نشین کردیا جائے اگر سوالات کی جانچ احتیاط کے ساتھ نہ ہو تو بچے لاپرواہ بن جائیں گے۔ مشقی سوالات بچوں کی ترقی آزمانے کے لئے کار آمد ہوں گے حساب کی تعلیم کا مقصد ہمیشہ یہ ہوا کرے کہ بچے تھوڑے عرصہ میں صحیح جواب نکالیں۔ بعض بچے حاصل کا ہندسہ تختی یا کاغذ پر لکھا کرتے ہیں

اس معیوب عادت کو روک دیا جائے۔ البتہ طول طویل جمع میں حاصل لکھ رکھنے سے مدد ملتی ہے۔ لیکن جہاں جمع کرنے کے اعداد بالکل تھوڑے ہوں وہاں حاصل لکھنے کی مطلق ضرورت نہیں تعلیم حساب میں عجلت اور صحت دونوں مساوی طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ لہذا یہ دونوں جزو ہرگز نظر انداز نہ کئے جائیں۔

تفریق

جب بچوں کی استعداد اس قدر ہو جائے کہ وہ جمع کے آسان سوالات حل کر سکیں تو تفریق کا تصور دلانا نامناسب نہ ہوگا جمع اور تفریق دونوں کے قاعدے ساتھ ساتھ پڑھانے میں کوئی عیب نہیں ہے تفریق کا تصور جمع کے بعد اس وجہ سے دلایا جاتا ہے کہ بہ نسبت جمع کے تفریق کا عمل کسی قدر مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ تفریق کے سوالات کی ترتیب مختلف طور پر ہوتی ہے اسی حالت میں تفریق کے سوالات مساوات کی صورت میں باسانی ظاہر نہیں کئے جا سکتے نمونہ کے طور پر تفریق کی ایک مثال ذیل میں درج ہے۔

(۱)۔ ۷ میں سے ۵ کم کرو۔ یعنے ۷ نفی ۵ جس کو ۷ - ۵ = ۲ سے ظاہر کر سکتے ہیں۔

(۲)۔ ۵ میں کیا جمع کیا جائے کہ حاصل جمع ۷ ہو؟ یہ سوال جمع معکوس کا Inverse Addition ہے اور وہ ۵ + ؟ = ۷ - سے ظاہر کر سکتے ہیں۔

(۳)۔ ۷ کا عدد ۵ سے کس قدر زیادہ ہے؟ اس سوال سے دو اعداد کا مقابلہ مطلوب ہے اور اس کا جواب یا تو راست تفریق (Direct Subtraction) یا جمع معکوس سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔

(۴)۔ ۵ کا عدد ۷ سے کس قدر چھوٹا ہے؟

(۵) ۷ اور ۵ میں کس قدر فرق ہے؟

مذکورۂ بالا اقسام کی مثالوں سے واقف ہونے کی غرض سے بچوں سے زبانی مشق کرانے کی ضرورت ہے۔ اور یہ سوالات ابتدا میں بذریعہ مفرول اشیاء

بچوں کے تجربہ اور ذاتی کوشش سے حل کروائے جائیں تاکہ اُن کو تفریق کا تصور ٹھیک طور پر ہو سکے۔

مثلاً سوال نمبر (۱) میں بچے ۷ گولیاں اٹھائیں اور ان میں سے ۵ گولیاں الگ کردیں اور باقی گولیوں کی گنتی کرکے دیکھ لیں کہ ۷ گولیوں میں سے ۵ گولیاں نکالی جائیں تو ۲ گولیاں باقی رہتی ہیں۔ مختلف بچے مختلف چیزوں کا استعمال کرکے بھی نتیجہ معلوم کرلیں ○○○○○ | ○○

سوال نمبر ۲ میں بچے ۵ گولیاں اٹھائیں اور ان میں اتنی گولیاں جمع کرتے جائیں کہ کل تعداد ۷ ہو۔ جمع کی ہوئی گولیوں کو گن کر یہ نتیجہ نکالیں کہ ۵ میں ۲ جمع کئے جائیں تو ۷ ہوتے ہیں۔ یہی عمل مختلف چیزوں کے ذریعہ کرایا جائے۔

سوال نمبر (۳) میں بچے ۷ گولیوں کا ڈھیر بنائیں اور دوسرا ڈھیر ۵ گولیوں کا بنائیں اور ان دونوں کا مقابلہ کرکے دیکھیں کہ ۷ گولیوں کے ڈھیر میں ۵ گولیوں کے ڈھیر سے کتنی گولیاں زیادہ ہیں۔ تجربہ کرکے اس نتیجہ کو پہونچیں کہ ۷ گولیوں کے ڈھیر میں ۲ گولیاں زیادہ ہیں۔

○○○○○ ○○
○○○○○

بعض اصحاب تفریق کی تفہیم کے لئے معکوس جمع کا طریقہ زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ان کا یہ بیان ہے کہ یہ عمل (جمع معکوس کا) قدرتی ہے اور بچوں کے لئے آسان بھی ہے کیونکہ طریقہ مذکور جمع کے ساتھ زیادہ تعلق رکھتا ہے۔

دیگر اصحاب تفریق بہ طریقہ راست پسند کرتے ہیں۔ ان کا یہ بیان ہے کہ تفریق کرنا یا کم کرنا بچوں کو زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے اور مساوات کے اظہار میں بھی زیادہ آسانی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً ۷ - ۵ = ۲، ۷ کم ۵ برابر ۲۔ تفریق کی ابتدا کے لئے تو یہی طریقہ مناسب ہے

تفریق کی تعلیم میں دونوں طریقے (۱) تفریق بہ طریقہ راست اور (۲) تفریق بہ طریقہ جمع معکوس استعمال میں لائے جائیں اور دونوں طریقوں کی اچھی مشق کرائی جائے۔ جب دو اعداد تقریباً مساوی ہوتے ہیں تو طریقہ جمع معکوس استعمال میں لایا جائے اور جب ایک عدد دوسرے سے بہت بڑا ہو تو تفریق بطریقہ راست

کا استعمال کیا جائے ۔ مثلاً
۱۰۶ ۔ ۸۷ کے حل میں طریقہ جمع معکوس اور ۱۰۶ ۔ ۱۷ کے حل میں طریقہ تفریق راست عمل میں لایا جائے ۔

جب تک بچوں کو تفریق کا تصور پختہ طور پر نہ دلایا جائے تفریق کے مروجہ طریقے ۔ (۱) طریقہ تحلیلی (۲) طریقہ ساوی جمع یا (۳) طریقہ تکمیلی سے تفریق سکھانا مناسب نہ ہوگا ۔

اشیاء محسوسہ کے ذریعہ اور ذاتی تجربہ کے ذریعہ بچوں کو تفریق کا تصور دلانے کے بعد اس کی مشق بھی کرائی جائے۔ حساب کی تعلیم میں مشق اہم چیز ہے ویسے بھی کوئی چیز ذہن نشین کرانے کے لئے مشق کی سخت ضرورت ہوتی ہے

اکائیوں کی تفریق

(۱) بذریعہ اشیاء محسوسہ ۔

بچوں کو تیلیاں، بیج، گولیاں ۔ وغیرہ جیسی اشیاء دیدی جائیں ۔ ان میں سے ہر ایک کو کہا جائے کہ وہ ۹ چیزیں اٹھائیں ۔ اور باقی چیزیں دوسری طرف رکھدیں بعد میں ۹ چیزوں میں سے ایک چیز کم کرنے کے لئے کہا جائے اور باقی چیزوں کی گنتی کروائی جائے اور عمل حسب ذیل لکھوایا جائے ۔

۹ گولیاں ۔ ۱ گولی = ۸ گولیاں
۹ بیج ۔ ۱ بیج = ۸ بیج
۹ تیلیاں ۔ ۱ تیلی = ۸ تیلیاں

یہاں گھٹانے یا کم کرنے کے لئے جو علامت ۔ نفی استعمال میں لائی جاتی ہے بچوں کو بھی بتائی جائے اور تفریق کا تحریری عمل مساوات کی صورت میں تختہ سیاہ پر بتایا جائے ۔

دوسری مرتبہ بچوں سے کہا جائے کہ بچے ۸ گولیوں میں سے ۵ گولیاں کم کردیں یا آٹھ بیج میں سے ۵ بیج کم کردیں یا ۸ تیلیوں میں سے ۵ تیلیاں کم کردیں اور باقی چیزوں کی گنتی کریں اور نتیجہ نکالیں کہ

۸ گولیاں - ۵ گولیاں = ۳ گولیاں

۸ بیج - ۵ بیج = ۳ بیج وغیرہ

اکائیوں کی تفریق کا مشقی تختہ بچوں سے بنوایا جائے۔ جو زبانی مشق کے لئے کار آمد ہو سکتا ہے۔

ب۔ اعداد کو حو چیزوں کے ساتھ تعلق دیکر مگر بغیر موجودگی اشیا محسوس بنایا جائے۔

۹ - آم - ۷ - آم = ۲ آم

۸ - پیسے - ۳ پیسے = ۵ پیسے

۶ قلم - ۴ قلم = ۲ قلم

۷ کاغذ - ۵ کاغذ = ۲ کاغذ وغیرہ

ج۔ محض مجرد اعداد استعمال میں لاکر

۹ - ۸ = ۱ اور ۸ - ۳ = ۵ و ۶ - ۲ = ۴ وغیرہ

علامت تفریق	—	
۹ - ۱	=	۸
۹ - ۲	=	۷
۹ - ۳	=	۶
۹ - ۴	=	۵
۹ - ۵	=	۴
۹ - ۶	=	۳
۹ - ۷	=	۲
۹ - ۸	=	۱

اکائیوں کی تفریق کی مشق کے لئے مندرجہ ذیل قسم کے کارڈ مدرس خود تیار کرکے بچوں میں تقسیم کر سکتا ہے یا تختہ سیاہ پر لکھکر مساوات کی تکمیل بچوں سے کرا سکتا ہے۔ اگر کسی بچے کو دقت محسوس ہو تو اس کو بذریعہ بیج یا تیلیاں سمجھایا جائے مثلاً ۷ بیج میں سے ۴ بیج اپنے پاس رکھ لینا ہو تو ان میں سے ۳ بیج کم کرنے ہونگے۔ ۹ تیلیوں میں سے ۶ تیلیاں اپنے پاس رکھنے کے لئے ان میں تین تیلیاں کم کرنی ہوں گی۔

تفریق	—	
۶ - ۲	=	۴
۷ - ۳	=	
۸ - ۵	=	
۹ - ۴	=	
۵ - ۲	=	

تفریق	—	
۹ - ۳	=	۶
۷ -	=	۴
۴ -	=	۳
۵ -	=	۲
۶ -	=	۵

۵۸۱۶

ایک ہی عدد متعدد بار تفریق کرنے سے بھی کافی مشق ہو سکتی ہے۔ مثلاً ۹
میں سے ایک ایک تفریق کیا جائے تو ۹-۱=۸، ۸-۱=۷، ۷-۱=۶
۶-۱=۵، ۵-۱=۴، ۴-۱=۳، ۳-۱=۲، ۲-۱=۱ وغیرہ
۹ میں سے دو دو تفریق کئے جائیں تو ۹-۲=۷، ۷-۲=۵
۵-۲=۳، ۳-۲=۱۔ ابتدا میں اس کا زبانی عمل حسب ذیل ہوا کرتا
ہے ۹ میں سے ۲ گئے، رہتے ہیں ۷، ۷ میں سے ۲ گئے تو ۵ رہتے ہیں۔
۵ میں سے ۲ گئے تو ۳ رہتے ہیں۔ ۳ میں سے ۲ گئے تو ۱ رہتا ہے۔
بعد میں بچوں کو اس طرح عادی بنایا جائے کہ وہ طول طویل عمل کرنے کے
بجائے زبانی صرف اتنا کہیں کہ ۹، ۷، ۵، ۳، ۱
۹ سے شروع کر کے تین تین تفریق کرتے وقت زبانی عمل حسب ذیل
ہوا کرے۔ ۹۔ ۶، ۳، ۰۔ چار چار تفریق کرتے وقت ۹، ۵، ۱ وغیرہ
جب طلبہ اکائیوں کی تفریق سے اچھی طرح واقف ہو جائیں تو اکائی
اور دہائی کے یعنے دو ہندسی اعداد کی تفریق بتائی جائے۔ اس کے
لئے پہلے ۲۰ تک کی جمع کا اعادہ کیا جائے۔ اور ۲۰ تک کے اعادہ کے
اجزائے ترکیبی ان سے کہلوائے جائیں تاکہ تفریق کے مشکل سوالات (جن میں
حاصل کی ضرورت ہے) حل کرنے کے لئے وہ تیار ہو سکیں۔
۲۰ میں سے دو دو تین تین یا چار چار متواتر گھٹانا مثلاً ۲۰-۲=۱۸
۱۸-۲=۱۶، ۱۶-۲=۱۴، ۱۴-۲=۱۲ وغیرہ۔ عمل کے وقت ۲۰ نفی
۲ برابر ۱۸، ۱۸ نفی ۲ برابر ۱۶، ۱۶ نفی ۲ برابر ۱۴ وغیرہ کہنے کے بجائے
بچوں کو اس طرح عادی بنایا جائے کہ وہ دل میں عمل کر کے زبانی صرف
۲۰، ۱۸، ۱۶، ۱۴، ۱۲، وغیرہ کہیں۔
اسی طرح تین تین تفریق کرتے وقت ۲۰، ۱۷، ۱۴، ۱۱، ۸ وغیرہ
اتنا ہی کہیں زیادہ طویل عمل کی ضرورت نہیں۔ اس طور پر زبانی مشق ہونے
کے بعد بچوں کو مساوات کی تکمیل تحریری طور پر کرنے کے لئے کہا جائے

دو ہندسوں کی تفریق جس میں چھوٹے عدد (مفروق) اکہرے درجہ کا ہندسہ

بڑے عدد (مفروق منہ) کے اسی درجہ کے ہندسہ سے چھوٹا ہو۔ مثلاً ۱۸-۱۳، ۲۷-۱۶، وغیرہ

بچوں کو کہا جائے کہ وہ اعداد کے ہندسوں کو متعلقہ درجوں میں

میں باترتیب لکھیں۔ مثلاً دہائیوں کے خانہ میں دہائیاں۔ اور اکائیوں کے

خانہ میں اکائیاں پہلے بڑا عدد لکھا جائے اور بعد میں چھوٹا عدد۔ دونوں

اعداد لکھنے کے بعد ایک افقی خط چھوٹے

عدد کے نیچے کھینچا جائے۔ بعد میں ۸ میں سے

۳۔ تفریق کرنے پر جو نتیجہ آتا ہے یعنے (۵)

اکائی کے نیچے لکھیں پھر ایک دہائی میں

دہائی	اکائی
۱	۸
۱	۳
	۵

ایک دہائی تفریق کر کے نتیجہ (صفر) دہائی کے خانہ میں لکھیں لیکن اس درجہ پر

صفر لکھنے کی ضرورت نہیں۔

اسی قسم کے دیگر سوالات بھی بچوں سے

حل کروائے جائیں۔ نمونہ کے طور پر ایک سوال

مدرس تختہ سیاہ پر حل کر کے بتائے۔ بچے اکائیوں

کی تفریق اگر ٹھیک طور پر جانتے ہوں تو اُن کو

دہائی	اکائی
۳	۵
۲	۱
۱	۴

اس قسم کے سوالات حل کرنے میں دقت محسوس نہ ہوگی۔ عمودی طور پر سوالات

حل کرنے کی کافی مشق ہونے کے بعد اُفقی طور پر یعنے مساوات کی صورت

میں تفریق کے سوالات لکھوا کر حل کرائے جائیں اس مقصد کو پورا کرنے کی

غرض سے مندرجہ ذیل قسم کے کارڈ استعمال کئے جائیں تو مناسب ہوگا۔ جہاں

بچے سوال نکال سکتے وہاں اشیار محسوسہ کا استعمال کر کے وہ سوال سمجھایا جائے

تفریق —
۱۹ - ۵ = ۱۴
۲۹ - ۵ =
۲۷ - ۴ =
۱۷ - ۴ =
۸ - ۲ =
۱۸ - ۳ =

تفریق —
۱۸ - ۸ = ۱۰
۲۶ - = ۲۰
۱۷ - = ۱۰
۲۷ - = ۲۰
۳۸ - = ۳۰
۲۴ - = ۱۰

تفریق —
۲۸ - ۱۶ = ۱۲
۳۶ - ۲۳ =
۲۷ - ۵ =
۴۸ - ۳۴ =
۵۵ - ۴۲ =

اس قسم کی آسان تفریق کی کافی مشق ہونے کے بعد ایسے سوالات دے جائیں جن کے حل کرنے میں بچوں کو کسی قدر مشکل محسوس ہو مثلاً ۱۱ - ۳ مثال ۱۱-۳ یہہ سوال بچوں کو بذریعہ اشیاء محسوسہ سمجھانا ہوگا۔ ان کو ۱۱ تیلیاں دے جائیں۔ اس طرح کہ ۱۰ تیلیوں کا ایک بنڈل اور ایک کھلی تیلی ہو۔ ان کو کہا جائے کہ اس بنڈل اور تیلی میں سے ۳ تیلیاں دوسرے کو دیدیں۔ یہاں پر ان کو یہ مشکل محسوس ہوگی کہ کھلی تیلی تو ایک ہے اور تیلیاں تو ۳ دینی ہیں۔ ایک کھلی تیلی دیدی جائے تو بھی دو تیلیاں ابھی دینی رہتی ہیں۔ اس مشکل کو انہیں کی قوت متخیلہ کو کام میں لاکر رفع کیا جائے سوچنے کے لئے کافی وقت دیدیا جائے اور بذریعہ سوال وجواب یہ بات ان سے اخذ کرائی جائے کہ اگر بنڈل کھول دیا جائے تو ۱۰ تیلیاں ہوں گی اور ان میں سے دو تیلیاں دیدینے کے بعد ۸ تیلیاں باقی رہیں گی یعنے ۱۱ میں سے ۳ کم کر دئے جائیں۔ تو باقی ۸ رہتے ہیں۔ لہذا ۱۱-۳ = ۸ ۔

اس قسم کے چند سوالات حل کروائے جائیں جن میں بڑے عدد کا یعنے مفروق منہ کا اکائی کا ہندسہ چھوٹے عدد کے یعنے مفروق کے اکائی کے ہندسہ سے چھوٹا ہو۔ مثلاً ۱۴-۸، ۱۲-۵، وغیرہ اس قسم کے سوالات بہت سے دئے جائیں۔ تاکہ ان کو کافی تصور ہو اور ساتھ ہی زبانی مشق بھی ہو۔ مثلاً ۱۱ نفی ۳ برابر ۸، ۱۵ نفی ۹ برابر ۶ وغیرہ ۔

۱۸ تک کے اعداد میں سے اکائیاں تفریق کرنے کی مشق کافی طور پر ہو جائے تو تفریق کے مشکل سوالات بھی جلد اور صحت کے ساتھ بچے حل کرسکیں گے۔ اس قسم کی مشق کے لئے مندرجہ ذیل تختہ مفید ثابت ہوگا۔ جو جمع کی مشق کے لئے بھی کارآمد ہو سکتا ہے۔

تفریق کا مشقی تختہ

۹	۸	۷	۶	۵	۴	۳	۲	۱	۰
۱۰	۹	۸	۷	۶	۵	۴	۳	۲	۱
۱۱	۱۰	۹	۸	۷	۶	۵	۴	۳	۲
۱۲	۱۱	۱۰	۹	۸	۷	۶	۵	۴	۳
۱۳	۱۲	۱۱	۱۰	۹	۸	۷	۶	۵	۴
۱۴	۱۳	۱۲	۱۱	۱۰	۹	۸	۷	۶	۵
۱۵	۱۴	۱۳	۱۲	۱۱	۱۰	۹	۸	۷	۶
۱۶	۱۵	۱۴	۱۳	۱۲	۱۱	۱۰	۹	۸	۷
۱۷	۱۶	۱۵	۱۴	۱۳	۱۲	۱۱	۱۰	۹	۸
۱۸	۱۷	۲۱	۱۵	۱۴	۱۳	۱۲	۱۱	۱۰	۹

"Instruction in Indian Secondary Schools"

Edited by E. A. MACNEE,

PUBLISHED BY THE OXFORD UNIVERSITY PRESS,

PRICE RS. 4.

This is a revised and enlarged edition of the book bearing the same title, first published in 1919 under the editorship of A. H. Mackenzie. As pointed out in the Preface, all the chapters in the first edition have been rewritten except those on School Management and the Teaching of Nature Study, Drawing and Handwork. New chapters have been added on The Dalton Plan, The Teaching of the Mother-Tongue, Physical Education and Scouting.

A special feature of the book is that each chapter in it, dealing with a particular aspect of education, has been written by a different person, by one who has a sound knowledge of his subject. Controversial theories have been mentioned, explained and commented upon in a scholarly and unbiased way. A spirit of compromise and a sympathetic regard for the actual difficulties of the teachers pervade the whole book. It is not a Utopia for the entertainment of the mental speculators. It is a practical guide for those engaged in the profession of teaching, written obviously by those who have faced and honestly tried to overcome the difficulties of the class-room. There is a very useful list of books at the end of each chapter.

The book is a clear, concise and comprehensive statement of the problems and methods of teaching, and may be unhesitatingly recommended to all those who are concerned with teaching in Indian Secondary Schools.

M. A. R.

use the school building as a social centre is poor economics as well as bad educational philosophy". The content of the term education must be broadened and the activities of the school extended so that they may also evolve into "people's universities." Above all, the " We " feeling must be cultivated regarding the school, for only so can the villager be won over and his interest in education stimulated both for his children and himself. Indeed, the masses may catch their first enthusiasm for education from a temporary experiment which does not at first emphasise literacy. Village education must proceed on all fours (civic, social, vocational, recreational) and the besetting sin of treating rural problems in isolation be done away with.

This demands of course a new type of village teacher and the author has some pertinent remarks to make under this head. He must have a sense of mission, for the teacher not only makes the school but "makes the community".

The colleges too should make their contribution and should undertake extension work as is done in America and students could help in vacation months. This suggestion we note is in line with the recent Lindsay Commission's report on College Education in India.

With this many-sided attack the author is confident that the village problem of India can be solved as it has been solved in America, provided people will dedicate themselves to this service.

The book is lucidly written and its 160 pages are a mine of useful information on rural problems generally. It may well find a place in every school and college library.

F. C. P.

The Chapter on Penn School reveals how a whole negro community numbering 6000 was transformed as regards general living conditions by adapting the school to the particular needs of the community until the whole Island of St. Helena on which they resided practically became the school in the sense that it became an organic whole with the school as the radiating centre. "The point to notice is that the school is the best and most successful agency for introducing new ideas and the various improved aspects of rural improvement and progress."

Berry School—instituted to uplift the poor and neglected boys of the mountainous and rural districts of the South—the Mountain Whites—is a striking story of what can be done to train children for rural life. It emphasises the career of a farmer as a dignified profession and its very efficient and practical curriculum seems to work wonders of transformation in its pupils whose farms have subsequently become noted for the improvement effected.

The account of Extension work among Negroes is most interesting. The "school on wheels" is a striking testimony of what can be done with a backward people. It aims to place before farmers concrete illustrations of better methods of farming, housing etc., and by giving practical demonstrations convinces them of the advantages to be gained. The manifold activities of this work, sponsored by a college, are too numerous to mention. The book should be read to appreciate them, but this method would seem to be very appropriate to Indian village life. In America this work has—to quote on observer—changed a crying race to a trying race". "It may not be a school, but it is education—perhaps the most effective education in the world."

Dr. Krishnayya then proceeds to apply the lesson of these studies to India. The school with a changed curriculum adapted to the needs of the village community is to become the radiating centre of village uplift, "Failure to

*

Reviews

"The Rural Community and the School"

BY

G. S. KRISHNAYYA, M. A., Ph. D. (Columbia)

Educational Officer, British Administered Areas, Hyderabad

PUBLISHED BY THE ASSOCIATION PRESS, CALCUTTA.

Dr. Krishnayya's book comes at a very opportune time. As Mr. F. L. Brayne, I. C. S., says in his Foreword, " Rural Education in India is at the parting of the ways." Everybody is saying that something ought to be done to improve the village life of India, but how to do it? That is the question. The obvious way would appear to be to gather information as to what has been done to improve backward village life abroad and it is here that the value of this book is apparent. It lets us see how similar problems were met and solved in America and provides much food for thought to all interested in rural uplift in India.

The author first gives a picture of the background of village life in India and analyses the reason for its backwardness, and chief among these, he stresses the utter inadequacy of village education, and thus joins company with Mr. Mayhew in his book on Indian Education and Mr. McKee of Moga who emphasises the fact that "the teaching of the village school is entirely remote from the daily happenings of village life and therefore has little interest for the child and his parents."

Dr. Krishnayya attacks the Indian rural problem from the angle of community-emphasis in the school and draws on the experience and achievements of American institutions noted for this—viz. Penn School, The Berry Schools and Extension work amongst Negroes.

teaching and fellowship of the school afford us. If every teacher became, as it were, a propagating centre of friendliness and sympathy among his pupils of many races, who can measure the silent force for good thus exercised? For students instinctively catch their teacher's mind and readily adopt his attitude to many questions, hence our responsibility. In this connection we would commend to teachers the thoughtful words of that great historian Dr. Stubbs: "There are few lessons more necessary for men to learn, not merely those who are going to take to public life, but who are going to live and move as men among their fellows, than these:—that there are few questions on which as much may not be said on one side as on the other: that there are none at all in which all the good are on one side and all the bad on the other, or all the wise on one and all the fools on the other,....above all, that no material success, or energy of development, no eventual progress or consolidation, can atone for the mischief done by one act of falsehood, treachery or cruelty."

Ourselves.

With the publication of this issue, *The Hyderabad Teacher* enters on the seventh year of its life. The Editorial Staff, which had already been strengthened by the inclusion of Mr. A. R. Rahman, has now received a valuable addition by Dr. G. S. Krishnayya's kindly consenting to work on it. The latter hardly needs any introduction to our readers. As he has been recently appointed Educational Officer of the Administered Areas, we have no doubt that his association with *The Hyderabad Teacher* will help to further that co-operation between the schools in Secunderabad and Hyderabad which the Hyderabad Teachers' Association, of which this journal is the official organ, has always endeavoured to secure. We take this opportunity of thanking all those ladies and gentlemen who have helped us so far with their valuable contributions, and trust that they will continue to assist us in future.

followed up in India. Action has already been taken in the United States where a Committee is at work revising text books; in this particular case, with the idea of eliminating the anti-British bias which existed in a number of the history text books. It is, however, not only in the writing but also in the presentation of historical facts by teachers that much can be done, for history is a subject that lends itself easily to party interpretation. It is true there still exists a school of thought which considers that the chief aim of teaching history is to foster a national spirit and create in pupils a love of country; but even in Germany—the worst offender in pre-war days—the "spirit of international reconciliation" (the cultivation of which is enjoined by the Weimar constitution) is now to be encouraged.

After all, if History is a science, it is illogical for different parties to wilfully draw opposite conclusions from the same facts according as party spirit moves them. The value of every science consists in its being true, and the truth carries its own lessons to be applied in many ways by the sympathetic teacher whether for good or evil, and that should suffice without any distortion in order to emphasise our personal predilections. As Sir Akbar rightly says, "There can be no greater crime than the fomenting of communal rancour, for while a thief or a liar commits a crime against his neighbour, the fomenter of communal bitterness commits a crime against society and the nation."

Hence the responsibility of the teacher in this connection. The school gives us our opportunity of engendering a right attitude on this all-important question. Now is the time to begin, as we never know how soon those we teach may be called on to face some big racial issue. Demagogues may talk a great deal but that will never solve the problem. The real work is to be done through education, and teachers should see to it that prejudices are not fostered in the minds of the young, and above all, that a right "sentiment" on this question is developed by the many means which the

Editorial

SIR AKBAR HYDARI'S ADDRESS TO THE STUDENTS OF THE NIZAM COLLEGE

Sir Akbar Hydari in his recent address at the Nizam College on "Communal Unity," has indicated a practical way in which teachers may make their contribution to the solution of this all-important problem, viz. the correct teaching of History so as not to emphasise racial differences but using it as a means to bring about better understanding between races by showing the underlying forces making for unity and co-operation. Sir Akbar believes that communal differences are due to the consciousness which Indians have derived from the history which has been taught them. "The fault" he says, "lies with the time honoured wrong method of writing and teaching Indian History. The current text books lay undue emphasis on bloodshed and warfare and bigotry in the history of our country, but ignore the glorious and numerous instances in which Indian rulers of a bygone day had demonstrated their religious tolerance. When modern conceptions of history considered civilisation as a force making for unity and co-operation, why should our boys be made to dwell on incidents in which Hindus kill Mahommedans and Mahommedans kill Hindus. Such incidents were, perhaps, inseparable from the history of any country. They constituted nothing more than lapses, not a matter for exultation by one community or for condemnation by another." Sir Akbar went on to give historical instances to illustrate his point and urged a rewriting of Indian history from a more idealistic point of view.

There is no doubt that there is a great deal in our ordinary history text books which tends to perpetuate old rivalries and it is to be hoped that the action of the League of Nations in appointing a committee to investigate the proper method of teaching history in such a way as to promote international goodwill and understanding will be

" The Teachers' Federation Year Book 1927. The All-India Federation of Teachers' Association.

" Report of All-Asia Educational Conference, 1930" Edited by D P. Khattry.

" Report of the Imperial Educational Conference, 1927" by Syed Mohamed Husain Jafery and S. Ali Akbar.

" Report of the First Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association"

MISCELLANEOUS.

" The Art of Study" by T. H. Pear.

" Drama" by F. R. Williams.

" Elementary Physiology" by Bihari Lal Bhatia & Prem Nath Suri.

" Co-operation" by A. Honora Enfield.

" Primer of Co-operation" by H. L. Kaji.

" An Introduction to Philosophy" by Leonard Russell.

" School Libraries" by Ethel S. Fegan.

" An Outtine of Modern Knowledge" by William Rose.

" Ethics" by G. E. Moore.

" The Glorious Koran" by Marmaduke Pickthall.

" The Spirit of Islam" by Ameer Ali.

" The Work, Wealth & Happiness of Mankind" by H. G. Wells.

N. B.—A list of the Urdu books will be published in the Urdu Section of our next issue. Ed.

Magazines Received in Exchange for the "Hyderabad Teacher."

" South Indian Teacher."

" Educational Review."

" Education "

" Benares Hindu University Magazine."

" Progress of Education."

" Punjab Educational Journal."

"Geography in Education and Citizenship" by W. H. Barker.

" Six Lectures in Geography " by R. G. Grieve.

ENGLISH.

" How to read Literature " by G. E. Wilkinson.

" On the Writing of English " by George Townsend Warner

" On the Art of Reading " by Sir Arthur Quiller Couch.

" Modern English " by J. H. Jaggar.

" The Writing of English " by William T. Brewster.

SCIENCE AND MATHEMATICS.

" Rural Science " by J. J. Green.

" Introduction to Science " by J. Arthur Thomson.

" Science and the Modern World " by A. N. Whitehead.

" Elementary Hygiene " by Bhatia and Suri.

" The Elements of Algebra " by N. Panchapagesa Aiyar.

INDIA.

" Peoples and Problems of India " by T. W. Holderness.

" Promotion of Learning in India " by N. Law.

" India " by V. Chirol.

" The Power of India " by M. Pym.

" Album of Delhi Guide " by H A. Mirza & Sons.

" The State in India " by Maclean.

REFERENCE.

" A Cyclopaedia of Education " Vols. I to V Edited by Paul Monroe.

" Encyclopaedia Britannica " Vols. 1 to 24

" Thesaurus of English Words and Phrases " by Peter Mark Rogett.

REPORTS.

" The Proceedings of the All-India Federation of Teachers' Associations (4th Session 1928) " by M. R. Paranjpe, M. A., B. Sc.

" The Proceedings of the Fifth Conference of the All-India Federation of Teachers' Associations, 1928," Published by the South Indian Teacher, Madras.

" Work of Teacher " by Davis.
" Notes for the Guidance of Teachers " by Whitehouse.
" Instruction in Indian Secondary schools " by Macnee.

CHILD EDUCATION.

" Montessori and her Inspirers " by Fynne.
" Montessori Schools " by Jessie White.
" Child Nature and Education " by Corrie Gordon.
" Educational Ideas of Pestalozzi " by Green.
" Educate your Child " by Mckay.
" From a Kindergarten Window " by Corrie Gorden.
" From Locke to Montessori " by W. M. Boyd.
" Child Training " by R. K. Kulkarni.
" Dr. Montessori's Own Hand Book " by Maria Montessori.
" Education of Man " by Froebel.
" Froebel's Chief Educational Writings " by S. S. F. Fletcher and J. Welton.
" An Essay towards a Philosophy of Education " by C. M. Mason.
" Studies of Childhood " by Sully.
" Fundamentals of Child Study " by Kirkpatrick.
" The Study of the Child " by Tayler.
" Kindergarten Guide " by Lois Bates.
" The Child " Published the League of Parents & Teachers.
" From the Heaven World " Published by the League of Parents and Teachers.

HISTORY.

" A History of Europe " by A. J. Grant.
" History and its Place in Education " by J. J. Findlay.
" Akbar " by Lawrence Binyon.
" History of Our Time " by G. P. Gooch.
" The British Empire " by Basil Williams.
" A History of England " by Butler.

GEOGRAPHY.

" Modern Geography " by Marion.
" Geography and Other Sciences " by Thornhill.

"The Changing Schools" by P. B. Ballard.

"The Science of Education" by Herbart Felkin.

"Rousseau on Education" by Archer.

"Education, its Data and First Principles" by Sir T. Percy Nunn.

"School Education" by C. M. Mason.

"The Teacher's many Parts" by Sir John Adams.

"A Year in the Infant School" by Mabel Bloomer.

"Physical Development, a Discussion" by J. Nelson Fraser.

"Discipline without Brutality" Published by the League of Parents and Teachers, Adyar & Gwalior.

"Home Influence" Published by the League of Parents and Teachers.

"Instruction of the Young in the Laws of Sex" Published by the League of Parents and Teachers.

"Evils of Coercion" Published by the League of Parents and Teachers.

"Duty of Parents" Published by the League of Parents and Teachers.

"Physical Defects of Children" Published by the League of Parents and Teachers.

"Hints on the Care and Training of Children" published by the League of Parents and Teachers.

"Prevention of Cruelty to Children" Published by the League of Parents and Teachers.

"Sanderson of Oundle" by Chatto and Windus.

"A Pioneer School" by Bedales.

"Manual for Teachers of Primary Schools in India" by Richey.

"The Teacher's Guide" Published by The Gresham Publishing Co., Ltd. Volumes I to III.

"Mentally Defective Children" by Binet.

"Physical Training Programme" by Buchanan.

"The School" by Findlay.

"History of Education in Modern Times" by Graves.

"Introduction to Teaching" by Keith.

"Recreation for Teachers." by Curtis.

"School Discipline" by Hamley.

" Teaching of Mathematics" by Young.
" How to teach Geography" by Young.
" Teacher's Lessons" by Hamley

EDUCATION (GENERAL).

" The Student's Guide" by John Adams.
" The New Examiner" by Ballard.
" Moral and Religious Education" by Sophie Bryant.
" Errors in School" by Adams.
" Modern Development in Educational Practice" by Adams.
" A Brief Course in the History of Education" by Monroe.
" The History of Education" by Helen Wodehouse.
" Japan and its Educational System" by Syed Ross Masood.
" The New Education in the German Republic" by Alexander & Parker.
" The German School System" by S. Ali Akbar.
" Rural Education" by Ashby & Byles.
" The Remaking of Village India" by Brayne
" School Discipline" by Bagley.
" Indian School Organization" by Wren.
" Teaching and Organization" by P. A. Barnett.
" Principles of Secondary Education" by Inglis.
" Elementary Education for Indian Boys" by V. Varahanarasimham.
" Education" by Michael West.
" Education" by T. Rayment.
" Parent, Teacher and School" by Moore.
" Teaching in Indian Elementary Schools" by Miss Corrie Gordon.
" The New Education" by L. H. Guest.
" Education" by Thorndike.
" Aristotle on Education" by Burnet.
" The Nation's Schools" by H. Bompas Smith.
" Human Nature and Education" by Woodburne.
" Essays on Education etc." by Herbert Spencer.
" The Principles of Education" by Raymont.

" Psychology in the School Room " by Dexter & Garlick.
" The Psychology of Education " by Welton.
" Educational Psychology " by Peter Sandiford.
" Group Tests of Intelligence " by Ballard.
" Psycho-Analysis in the Class Room " by George H. Green.
" The Teacher's Handbook of Psychology" by James Sully.

EDUCATIONAL METHODS.

" Individual Work and the Dalton Plan" by A. J. Lynch.
" A New Manual of Method " by Garlick.
" Learning to read a Foreign Language " by Michael West.
" A Primer of Teaching Practice " by J. A. Green and C. Birchenough.
" Education on the Dalton Plan " by Helen Parkhurst.
" The Approach to Teaching " by Ward & Roogoe.
" The Dalton Laboratory Plan" by Evelyn Dewey.
" Exposition & Illustration in Teaching " by John Adams.
" Common Sense in Education and Teaching " by P. A. Barnett.
" The Principles and Practice of Teaching & Class Management " by Joseph Lander.
" Principles of Class Teaching " by Findlay.
" The New Teaching " by John Adams.
" The Direct Teaching of English in Indian Schools " by Percival Wren.
" The Play Way " by Coldwell Cook.
" School Management and Methods of Instruction " by Collar & Crook.
" Paper Modelling " By M. Swannell.
" Handicraft in the School " by J. W. Topham Vinall.
" Teaching Science in Schools " by John Brown.
" The Teaching of English in India " by H. Wyatt.
" Language in Education " by West.
" Principles and Methods of Teaching " by Welton
" Teaching of Drawing " by Morris.

Rules of the Library of the Hyderabad Teachers' Association.

1. The library shall be located in the Office of the Divisional Inspector of Schools, Head Quarters, Hyderabad, Deccan.

2. It shall be conducted by a committee contisting of 6 members elected annually by the Central Executive Committee of the Hyderabad Teachers' Association.

3. The use of the library shall be free to all members of the Teachers' Association.

4. No member shall be allowed to take out more than one book at a time or to keep a book in his possession for more than 15 days. In special cases where a book is required for a longer period, it will be lent again provided that there is no demand for it on the part of any other member.

5. Books shall be lent twice a week, Saturday and Tuesday between 4 and 4-30 p. m.

The following is a list of books which have been purchased so far :—

PSYCHOLOGY.

"An Introduction to the Study of Heredity" by E. W. MacBride.

"How We Behave" by A. E. Heath.

"Talks to Teachers on Psychology" by William James.

"A Text Book of Experimental Psychology Books I and II" by Charles S. Myers.

"The Elements of Psychology" by Edward L. Thorndike.

"Herbartian Psychology" by Adams.

the 13th and 14th instant. Mr. D. S. Reddy, Deputy Director of Public Instruction (Elementary Education) is the camp officer.

3. Sir, C. V. Kumaraswami Sastri, it is understood, has been requested to deliver the convocation address at the coming convocation of the Mysore University.

4. It is understood that the Director of Public Instruction, Madras is not in favour of permitting withdrawals from the Provident Fund account of teachers employed in aided schools for paying the premia on life policies. The Director, it is said, is of opinion that it will lead to several difficulties as the scheme of Provident Fund for teachers in non-government aided schools is different from the General Provident Fund, for which withdrawal for such a purpose is permitted.

5. The Mysore Government is reported to be contemplating a big reduction in their annual contribution towards the Indian Institute of Science, Bangalore.

---

on how this could be achieved. Some suggested the usual method of affiliation even for Post-graduate work; others held that affiliation for Post-graduate purposes was not contemplated under the new Act and that the University could control Post-graduate work only by recognising qualified persons to do the work. A reference was made to the Chancellor and his ruling was in favour of the latter group. An army of University Teachers (about 225 out of a total of about 550 college teachers) is recognised in all parts of the Presidency and many more will be added to the list when the names of University Teachers in Medicine are announced. This means practically every one who was doing some kind of Post-graduate teaching in the past will hereafter have the new designation of "University teacher" Whether this mere change in designation brings about the desired improvement or whether it only tends to create a new division among Professors and proves a source of friction can be ascertained only with the lapse of time.

MADRAS

1. The special conference of the Madras University to confer honorary Doctorate degree was held on the 3rd August. His Excellency, Sir George Fredrick Stanley, presided.

On the following day the annual convocation of the University was held. The Hon'ble Dewan Bahadur. S. Kumaraswami Reddiar, B.A., B.L., M.L.C., Minister of Education and Pro Chancellor of the University of Madras delivered the convocation address. His Excellency the Chancellor presided. 1247 graduates and Diploma holders took their degree and diplomas in person while 588 were allowed to take their degree *in absentia*. It is noteworthy that as many as 250 ladies took their degrees at this convocation.

2. The teachers in the employ of the corporation of Madras are running an Educational camp at Red Hills on

3. Government has effected a 10 p. c. cut in grants to School and Colleges.

4. The Calcutta University has offered the Chair of Bengali Literature to Dr. Rabindra Nath Tagore, which the Great Poet has accepted.

5. Lt.-Col. Sir Hasan Suhrawardy, the present Vice-Chancellor has been re-appointed Vice-Chancellor for another term of three years.

BOMBAY

The annual convocation of the University of Bombay is to be held on the 17th of August when Sir C V. Raman is requested to address the new graduates. As usual, the Syndicate has published its annual report to be submitted on this occasion. If all the graduates (Bachelors and Masters) of the last examination present themselves for receiving their degrees, 1,821 will be B.A's, 323 B.Sc's., 224 LL.B's., 75 B.T's., 46 B.Com's., 66 B.E's, and 68 M.B.B S's. Of the rest 75 will be M A's., 19 M.Sc's., 6 M. Ag's., 1 M.E., 2 LL.M's., 4 B.Hy's, 3 M.D's' and 6 M.S's. This shows great progress during the last ten years but in its annual output of graduates Bombay is probably still behind Madras and Bengal.

At the last Matriculation examination, of the 15477 candidates registered, 5806 or 37.5 per cent passed. Last year the percentage of passes was 57.2. This University allows candidates at the Matriculation to answer their (Indian) classical language and history papers in their mother-tongue. This permission was first granted in 1926 and advantage of the option is taken by the students every year in increasing numbers.

The organisation of Post-graduate instruction and research has been for some time past a much debated problem. That Post-graduate work needed greater supervision and guidance every body accepted but opinions widely differed

ment school teachers asking for the allowance. The circular of the D.P.I. was very much resented and the columns of *The Leader* were almost daily flooded with representations and resolutions of branches of the U.P. Secondary Education Association all over the province. Whether it was the effect of the pressure of the agitation or the result of the usual due deliberations, the Government have now ruled that the allowance that may be given to Games Teachers may be between Rs. 15 to 25.

Lucknow University.—Dr. R. P. Paranjpe, Ex-Principal of the Fergusson College, Poona, (1902-1920), Minister of Education, Bombay Government (1920-1923), and a member of the India Council, London, (1927-1932) has been unanimously elected Vice-Chancellor of the Lucknow University in place of Pandit Jagath Narain, who has resigned.

BENGAL

1. The Senate of the Calcutta University has passed the New Matriculation Regulations. The most important innovations are:—

(i) making Physics and Chemistry compulsory after the first five years;

(ii) making the vernacular as the medium of instruction and examination in all subjects except English;

(iii) providing a separate syllabus of studies for girl students;

(iv) opening a register for teachers of English;

(v) making Physical instruction and Vocational training compulsory; and

(vi) abolishing age restriction.

The Regulations now require the sanction of Government which, it is expected, will be obtained.

2. The Indian State Broadcasting Service at Calcutta has arranged for educational lectures by well-known educationists for School and College students.

during the previous 5 years. The authorities had told the managing committees of Anglo-vernacular schools that trained teachers alone should be employed. This had led to the situation that if an untrained permanent teacher had to sever his connection with the school where he was employed, he had no chance of getting another permanent employment elsewhere because he was untrained. The Department tried to solve this difficulty by issuing the circular of 1927. Now this solution was certainly no solution at all. The U. P. Secondary Education Association had, year after year, at its annual conference adopted resolutions suggesting that either the untrained teachers should be allowed to appear at the Training College examination as private candidates or they should be awarded some sort of certificate. The Government felt that unless teachers worked under the supervision of training college teachers for the full term of nine months, no certificate could be given nor could they be allowed to appear as private candidates. Now it is reported that after due deliberation the Government has arrived at the conclusion that teachers who were on permanent lists till 1930 should be exempted from training and certificate to this effect will be given individually to all such persons; and that those who have been in service since 1930 onwards would be asked to give 12 lessons at the training college, before they are exempted from the theory examination and awarded the newly created certificate of A.T.C. (Acting Teachers' Certificate).

Games Teachers' Allowance.—Some time back the D. P. I. caused a sensation here by his circular that no allowance should be given to games teachers out of the Games Funds. In private schools games teachers had been getting an allowance of Rs. 5 or 10 for the extra work of supervising and arranging the games. The Government schools had a grievance in this respect for there no such allowance was given. It is understood that the D.P.I's circular referred to was issued in response to an appeal by Govern-

Extracts from Educational News Bulletin

[Issued under the auspices of the All-India Federation of Teachers' Associations by the Association of Editors of Educational Journals, 41, Singarachari Street, Triplicane, Madras.]

PUNJAB.

Arrangements for holding the 8th Conference of the All-India Federation of Teachers' Associations at Lahore are being made. The Secretary of the All-India Federation of Teachers' Associations has already circularised secretaries of the affiliated associations calling on them to send their first nomination for the presidentship of the conference.

The Assistant Secretary of the Punjab Geographical Association took a party of about 36 students to Kangra, Dharmasala and Mandi Hydro Electric works. The tour lasted 5 days, 12th to 17th May 1932.

DELHI.

Several bungalows situated in the Viceregal Estate were handed over to the authorities of the Delhi University.

UNITED PROVINCES

Universities Committee Report.—This is now out. It recommends that the Vice-Chancellor may either be honorary or be paid such remuneration as may be determined. This recommendation expresses the view that the University should not be bound down to one course and the law should be elastic. Dr. Ganganath Jha, the present Vice-Chancellor of the Allahabad University, has protested against the proposal that the Vice-Chancellor should be honorary.

Untrained teachers.—In 1927 the Department of Education issued a circular that those teachers who were on permanent staff before December 1926 would be considered trained for the purposes of employment. This was the result of agitation carried on by teachers' conferences

Financial. As I stated in my last report, at the end of 1338 Fasli the Association had a balance of O.S. Rs. 987-2-3. The expenditure in 1340 Fasli amounted to O. S. Rs. 1,026-15-3. Thus the balance at the end of 1340 Fasli was Rs. 924-12-1.

Mr. S. Khairat Ali deserves the thanks of the Association for the services which he has continued to render as Honorary Treasurer of the Association.

"*The Hyderabad Teacher*," the quarterly journal of of the Association, has successfully completed the sixth year of its existence, though it has not become self-supporting yet.

The editorial staff consists of Mr. S Ali Akbar, Rev. F. C. Philip, and Mr. Ataur Rahman (on the English side) and Mr. S. Ali Akbar, Mr. S. Fakhurul Hasan and Mr. Abdul Noor Siddiqui (on the Urdu side). Recently, Dr. Krishnayya, Educational Officer, Administered Areas, has also very kindly consented to be a member of the Editorial Committee of the English Section of the magazine.

In December 1931, the Association suffered a heavy loss by the sad and untimely death of Mr. Syed Zahoor Ali, Principal, Darul Uloom High School and Vice-President of the Association. The late Mr. Zahoor Ali was a very enthusiastic member of the Association and the success of the last Annual Conference was very largely due to his efforts.

S. M. S. MUSHADI,
General Secretary.
Hyderabad Teachers' Association.

(6) How to make Manual Training successful in a school with limited resources.

(7) Correlation between Drawing & other Subjects.

(8) Correlation between History and Classical Languages.

(9) Correlation between Manual Training, Science and Drawing.

(10) School Hygiene.

(11) Development of leadership in students.

It will be seen that most of the subjects selected had a bearing on Drawing, Manual Training or the Classical Languages, that is, subjects to report on which Sub-Committees were appointed at the last Conference.

Public Meetings—No public meeting was held during the period under report.

The Library of the Association—The library of the Association is rapidly growing. Thanks to the monthly grant of Rs. 15/- which it receives from Government, the total number of books is over 250 now. The Library Committee has framed rules of the library which will be published shortly in the *Hyderabad Teacher* along with a list of books which have been purchased so far.

Miscellaneous—The Co-operative Society of the Divisional Inspector's Office has 110 members now as against 66 in the previous year.

Mr. Salim Bin Saeed, B. A , B. T., Head Master, Govt. High School, Darus Shifa and Mr. Abdul Noor Siddiqi, B.A., B.T., Head Master, Govt. Middle School, Shah Gunj, represented this Association at the Annual Conference of the All-India Federation of Teachers' Associations, which was held at Bangalore in December 1931. The reports prepared by them have already been published in the *Hyderabad Teacher.*

The question of starting a Central Association embracing all the schools in the Dominions has not been settled yet.

the teachers of the schools situated in the Administered Areas have continued to be members of the Association, although these institutions are no longer in the Hyderabad Division. The number of members who do not belong to the Hyderabad Division and have joined the Association under Rule IV B has increased from 36 to 37.

The Central Executive Committee.—During the period under report five meetings of the Central Executive Committee of the Association were held. The work done was as follows :—

(1) Preparation of a programme of monthly meetings.

(2) Nomination of members of the Classical Languages and Drawing Sub-Committees.

(3) Appointment of a Sub-Committee to reconsider the rules of the Association with a view to making the monthly meetings more successful from the point of view of attendance and discussion.

(4) Organisation of the Annual Conference and the Exhibition.

The suggestions of the Sub-Committee which was appointed to revise the rules of the Association, have been accepted by the Central Executive Committee and will be placed before the general body for its approval.

Monthly Meetings—During the period under report, the following subjects were discussed at the various centres of the Association :—

(1) Aims and Methods of teaching Drawing.

(2) Importance of the teaching of the Classical Languages.

(3) Importance of Manual Training in schcols.

(4) Drawing as a means of teaching pupils to appreciate nature.

(5) Methods of popularising the study of Classical Languages.

the living child at all, but with the dead image we have erected, or shall we give it play and satisfaction?"

The Hyderabad Teachers' Association

Summary of the General Secretary's Report for the Period June 1931—August 1932.

At the last Annual Conference three Sub-Committees were appointed to prepare reports on Drawing, Classical Languages and Manual Training respectively. As Manual Training was made a compulsory subject only last year, the Central Executive Committee deemed it advisable to postpone the preparation of a report on Manual Training until such time as the teachers should acquire more experience of teaching this subject. Consequently, only the reports of the Sub-Committees on Drawing and Classical Languages will be placed before the Annual Conference for adoption after they have been thoroughly discussed at sectional meetings.

The two reports adopted by the last Conference were duly submitted to the Director of Public Instruction and it is hoped that they will receive the same consideration as was given to the reports previously prepared by the Association.

Branches of the Association.—During the period under report the number of Branches of the Association was 14, as in the previous year.

Members of the Association.—The number of ordinary members increased by 20, thus bringing the total number to 1150. Thanks to the interest which Dr. Krishnayya, Educational Officer, Administered Areas, takes in the Association,

stand for a common cause. Their school is their nation and they are the nationals. The interests of the school are ever present in their hearts. One has only to watch a football or a hockey match played by a school team to appreciate the beneficial effects of outdoor games. One is struck not only by the efforts of the team to win honour and glory for the school, but also by the enthusiasm of boys who are spectators. It is a significant fact that in almost every school the teacher who takes part in games has greater influence upon the majority of the boys than any other teacher. Why is this so? Because he has succeeded in understanding their psychology and leads a common life with them, participates freely in their activities and is in immediate contact with them.

Play is not only conducive to physical fitness, but is the most potent agency for the promotion of healthy activities. But for the after-school games and sports, how many boys would go astray in their spare moments and how many of them would easily become a prey and succumb to temptations? Even now it is a common sight to find school children indulging in base activities and objectionable habits after the school hours, and this happens specially in cases where the students, instead of participating in the out-door activities of their school, drift away to the nauseous and dirty atmosphere of the streets and by-lanes, where unfettered urchins wander. Without this healthy check of play, how many would drift into the horrors of juvenile crime?

Play in fact is a great saviour of the adolescent. Every school should therefore provide adequate opportunities of play amidst healthy surroundings. Play promotes not only physical well-being but a healthy moral out-look. To conclude with an apt quotation from Professor Dewey, "The question of child life at bottom is this: shall we ignore this active setting or tendency, dealing not with

There is no desire to attain an end. It is not allied to any serious activities and the direct gain is an independent pleasurable effect.

The class-room does not present a social atmosphere. There a conventional attitude is adopted by the children because of the stern and unyielding figure of the teacher. It is on the field where they open their hearts to each other, move and behave like human beings, form friendships and indulge in easily forgiven and forgotten quarrels.

Play helps to build up character in a way which no amount of lecturing can do. In the class-room the child becomes an artificial creature where he is subjected to unmitigated scrutiny, and is conscious of his being watched. Field activity offers to him an outlet for self-expression. Here he has ample scope for the full display of his inmost thoughts, feelings and attitudes. The playground is a reformatory for the bad and recalcitrant spirits and an encouraging agency for the good. One mean action on the part of a culprit, and the whole force of the moral attitude of the majority sets him right for the future. Here the boys have their own judges, their own law courts, their own leaders and their own guides. The disapproval of the majority acts as a rectifying agency for the defects and shortcomings of the few. Play is an end in itself, and hence on the fields the whole atmosphere is free from selfish motives.

Such playful activities are not only conducive to the moral betterment of the pupil, but they bring about a spirit of harmony and concord, a brotherly feeling which remains with them even after they have left the school. Not only this, but such activities stimulate their sense of duty and help them to realize their responsibilities. Here are laid the seeds of discernment, right judgment and considerateness, leading them on to the higher spheres of concientious citizenship and righteous civic life. On the playground they learn to discriminate the virtuous from the evil. It is there that they come to understand and feel that they

school which plays a dominant part in this process of the growth of individuals.

The first and the foremost thing we need to realize is that a child fundamentally differs from an adult. He carries within himself a volcano of activities which tend to burst at any moment, but there are checks and restraints placed upon him. He is intensely active and therefore the question of teaching hinges on the all-important factor of taking hold of these activities and directing them into the proper channel. Humouring of the child's activity is to be preferred to its suppression. Activity, mobility, restleness—these are his legacy, a birthright which is inseparable from him during his childhood. Physical growth should be allowed to proceed with mental growth; mental and physical developments are like the two wheels of a cart; if one is out of order, the other follows suit.

Play-way in education is the present-day cry and slogan of the educationists. But, alas ! many parents and as many teachers regard this all-important and essential factor as something which is in contradiction to the aims of the school. The school to them appears and is quite conveniently deemed as a check to their vagrant and playful instincts; it is considered to be a place where they are primarily sent to be chained and cuffed for an impulse which is but natural to them. Play is therefore given a secondary place. A child's natural jubilance and his harmless and innate bouyancy appear as a red flag to a sternly minded teacher and are viewed as a sacrilege which deserves severe retribution. And if by the urge of nature a child gives vent to this natural instinct, then he is taken to task. All this because we fail to realize that to him play comes first in interest and real life.

Let us now see how far this play-spirit mars or makes his character. Play in itself does not carry any extrinsic objective in view; it is indulged in for its own sake and so does not carry with it any craving for mater alistic gain.

*

A Plea for Play-way in Education

BY

S. M. H. NAKAVI, B. A., Dip. Ed. (Leeds)

Head-Master, Nampalli High School, Hyderabad-Deccan.

It has been most significantly asserted that the Battle of Waterloo was won on the playing fields of Eton. But it has never even been suggested that the sober and serious looking walls of the classroom do really influence the formation of the child's character and that the class atmosphere does potentially tend to engender in him those real and solid traits of character which capacitate him to carry out, unselfishly and magnanimously, his social, moral and patriotic obligations, which are so necessary to the winning of battles at home or abroad.

Let us analyse the position as it stands before us. Take an average student. To him the class appears a. prison cell from which he, if circumstances were in his favour, would try to abscond. He remains more or less a passive listener to most of the facts with which the teacher tries to spoonfeed him by his age-old method of simple transference—a method which often proves contrary to the expectations of the teacher and the taught.

One would think that the sounding of the final bell would put an end to this scene of prolonged patience and forbearance, but No! the poor drudge must go home and again settle himself down to his studies for the following day and, in addition, do an abundance of homework set by his various masters.

This narrow outlook, which has hitherto judged the child by a stereotyped standard, needs revision. The school in fact is a miniature society. In it lies the germ of all further public progress and social development. It is the

language. Thorndike's word-book is the fruit of a thorough investigation in this field. There are other word-frequency lists, like Dewey's, but Thorndike's book is more comprehensive and more exact. It is idle, therefore, to remark that Thorndike's book should not have been consulted.

I must end. It is with great diffidence that I have ventured on a criticism of Dr. West's thought-provoking book. I have said and must say it again that he has made a very original, very constructive and very valuable contribution to educational theory and method. He has given us a series of Readers which must be of great value in the teaching of English, because, quite unlike other text books and Readers, these have been written after careful deliberation and with a constructive purpose.
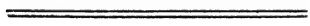
Jones or Henry Ainley on Indian boys. It is sufficient if the rhythm and the intonation are perfect.

Now, we must remember that it is more easy to acquire the sounds of the English language than to imitate the rhythm or reproduce the intonation of the English speech. With very little difficulty, we can train our children in the exact reproduction of vowel, diphthong and consonant sounds.

Dr. West wishes to build up a chosen vocabulary of the most useful words in a series of readers. The idea is splendid. It would certainly be useful to have an accurate measure of the vocabulary of the boy at every stage. From this point of view, the Readers written on an original plan and with a definite purpose are far better than the common Readers and text-books where neither plan nor conceivable purpose can be traced.

I have seen somewhere a criticism to the effect that a chosen vocabulary would defeat its own object, because it would not give the student access to other books which are not specially 'edited' so as to be within the limits of this vocabulary. I do not agree with this view. A vocabulary of 5,000 words of the greatest frequency and utility will certainly give the boy access even to other books which are not specially 'edited.' The boy who has gone through his school course with the New Method Readers is, I think, in a far better position than the boy whose vocabulary has not been accurately measured or carefully selected.

It has been said that Thorndike's Word-Book is not the best guide to the selection of vocabulary, *because* it is American. This criticism is silly. If our object is to select the vocabulary, it is useless to do it 'out of our head,' according to our own preconceived ideas of what is simple or what is difficult. We must have a guide in the form of a word—frequency list which will tell us what are the most useful words and what are the most common words of the

is " no impression without expression " is, I believe, a very sound one.

Dr. West asserts that the Direct Method imposes a heavy responsibility on the teacher of the lowest class who is usually ill-qualified, if not incompetent. The argument has equal force with regard to the New Method. I am convinced that the teachers who adopt the New Method must be men of great efficiency and ability and will need to be carefully trained in the principles and procedure of the method.

Dr. West says that scanning or skimming is the most useful and most common type of reading and urges that the silent reading ability should be carefully trained and developed. We may agree with him that reading, whether aloud or silently, is sadly neglected in our schools and that silent reading ability is of great value. We may admit that this ability should be developed and that some kind of test of this may be incorporated in our formal year-end tests. But there we come to the parting of the ways. Scanning or skimming is not the only or the most valuable type of reading. It is useful when we are reading the twenty four pages of the daily edition of a newspaper; it is useful in reading through a tedious three volume novel, but in all other situations it is of doubtful value. In reading literary works in prose or verse, in reading scientific, historical or philosophical works, the careful study of the pages is indicated. " You must cultivate the habit of looking intently at words," said Ruskin, and it is indispensable if we wish to enter the mind of the author. Rapid reading is, I am afraid, a dangerous habit to encourage in little children. To put the demon of speed before little children is perhaps misdirected enthusiasm. What is gained in speed is lost in power.

Dr. West attaches no importance to pronunciation. However, he quotes Lloyd James who says that it is not necessary or desirable to impose the pronunciation of Daniel

as the power to read and understand. A referendum to the parents who send their children to school to study English will show how eager they are that the children should have a knowledge of the language in all its aspects. After all, he who pays the piper, may call the tune. I differ from Dr. West with great diffidence; but the conclusion is inevitable that Reading Ability is not the only or the most urgent need.

Dr. West claims that reading ability may be isolated from speech and writing and points out many instances where people possess only one or the other of these powers. A person may speak a language with ease and fluency and yet may be ignorant of reading and writing it. He asserts that reading is a mere matter of vocabulary and that if a boy is introduced to the words he can read and understand without difficulty. But unless the boy is taught to use the vocabulary in his speech and writing, the words acquired from the Reader will never be fixed in the mind. If active use of the vocabulary is not encouraged, the development of reading ability pure and simple would have very little value. And this brings us to the Direct Method.

The emphasis laid in this method on speech is, I think, a right emphasis. Apart from the fact that the language is learnt in a natural way, through the medium of the spoken word, the words frequently heard are fixed in the mind and give to the child a sense of the language. Again, children learn through their senses and it is a sound pedagogical maxim that instructs the teacher to appeal to all the senses. The spoken and the written words appeal to different senses and are alike necessary and useful in the teaching of a language.

The passive vocabulary acquired in reading would have little value if the child is not encouraged to express himself in speech and writing. The pedagogical maxim that there

subject of the teaching of English is simply practical and utilitarian. English is a language useful and necessary for certain purposes; it is valuable in so far as it gives us access to scientific and technical knowledge. We have no concern with its cultural value.

It would be difficult to agree with Dr. West, when he presents so narrow an aim in the teaching of English.

Again Dr. West considers Reading Ability the most urgent and the most universal need. One is amused to hear that the Indian boy does not need to speak or write English. Of the value of speaking ability Dr. West is frankly contemptuous. "If ability to speak a foreign language is education, then waiters are the most highly educated class." Of course, Dr. West warns us that he is thinking only of the average Indian boy, and he suggests that special courses of instruction may be formulated and special schools opened for boys who have a higher intelligence or have a direct need to speak or write English. But even admitting that this separation of the sheep from the goats can be made, even admitting that several types of schools may be opened to give instruction on different lines according to different needs (and this will lead to administrative difficulties), even admitting all this, I am not convinced that the average boy does not need English to speak or to write, or that these abilities are beyond him. Even considering the question from a purely utilitarian point of view, the power to speak and to write is as valuable and necessary as the power to read. The administration of British India is carried on through the medium of English. Those who seek Government jobs must have facility in expression—oral and written. Those who enter the learned professions must have the power to speak and write. In our State, where the administration is in the vernacular, the case is slightly different, but that does not alter the main argument. All those who take up the study of English desire to cultivate a power of expression both in speaking and writing, as well

detailed study. Great emphasis is laid on pronunciation and the sounds of the language.

It is difficult to agree with Dr. West in his criticism of the Direct Method. But I shall return to this subject later, after I have considered other points.

First, with regard to the Aim in the teaching of English:—

The aim generally kept in view in the teaching of English is cultural—the refinement of feelings and tastes by contact with the thoughts and ideas of other people through their literature. Sanderson of Oundle, according to H. G. Wells, thought that 'the essential value of modern languages lies in the insight they give into the life and thought of foreign nations. Even with regard to the object and value of classical studies Matthew Arnold holds the same view: "When I speak of knowing Greek and Roman antiquity....I mean more than a knowledge of so much vocabulary, so much grammar and so many portions of authors in the Greek and Latin languages. I mean knowing the Greeks and Romans, and their life and genius and what they were and did in the world, what we get from them and what is its value." In the same way, the teacher of English Language and Literature should give a sincere and sympathetic interpretation of all that is noble and beautiful in the history, life and institutions of the English nation.'

Further, the English language has a wealth of noble poetry and good prose. Shakespeare and Milton, Wordsworth and Tennyson have 'sung to one clear harp in diverse tones'

> "Of Providence, foreknowledge, will and fate,"
> Fix'd Fate, free-will, foreknowledge absolute.

In the teaching of English, an appreciation of English Literature can hardly be ignored.

But Dr. West enters his emphatic protest against the cultural aim in the teaching of English. As he sees it, the

silent reading of passages with the purpose of finding the answers to questions may be begun very early. The reading material should be suited to the mental age and intelligence of the pupil and should give him at the earliest possible moment "a pleasure and a sense of power" in reading English books.

And Dr. West wrote the New Method Readers.

This is a brief and perhaps even inadequate summary of Dr. West's very interesting and instructive book. As Sir Michael Sadler has said "It is a book of creative power." It challenges attention to the problem of the teaching of modern foreign languages and offers very original and suggestive ideas. The constructive criticism of existing methods of modern foreign language teaching must interest and engage the serious attention of teachers of English. Dr. West raises questions of fundamental importance in educational theory and method. He differs from the accepted view with regard to the aim in the teaching of English, in the prominence he gives to Reading Ability isolated from speaking and writing, in his general criticism of the Direct Method, in his low estimate of the importance of pronunciation in the teaching of language, etc. A brief discussion of these points of controversy may be useful.

The method most commonly used and most widely accepted in the teaching of modern foreign languages is called the Direct Method. The idea is that the child should learn the second language as nearly as possible in the manner in which he learned his mother-tongue. Translation is avoided, the aim being to create in the mind of the child a direct bond between the word and the idea, thus leading him on "to think in English." The emphasis is laid on the oral aspect of the language and conversation is of supreme importance. There is one composite text-book and all reading, writing and conversation 'is based on the text.' Other books are prescribed for extensive reading or non-

first year of the intermediate course and a modification of the examination so as to encourage efficiency in reading would make a very marked difference. It is moreover desirable that something should be done in this respect before the boy reaches the intermediate stage and a simple reading test as a part of the matriculation examination would be a most reasonable innovation."

Other experiments and tests indicated that in respect of vocabulary, the Indian boy is six years behind the English boy of the same age For example, a boy in the class X, whose age is 16 has a vocabulary of 5,000 words; an English child has a mastery of the same vocabulary even before he is 10 years old. With this vocabulary, the boy can read with facility Fairy Tales or the stories of G. A. Henty, but any novel of Stevenson or Thackeray would be beyond his comprehension. The former material is not suited to his intelligence because it is of interest only to a child. The problem therefore is to compose or "edit" literature specially, so as to bring it within the limits of the vocabulary known to the boy.

Word-frequency lists, such as Thorndike's word-book, give us an idea of the most frequent and the most useful words of the language.

New Readers should be constructed with the object of giving the boys a reasonable ability in English Reading. The most important factor in reading is vocabulary and it would be possible to introduce the boy to a vocabulary of 5,000 words, carefully chosen with the help of Thorndike's book in a series of Readers. The criterion which should guide us in the selection of the words should be that the words should be the most useful and most common words of the language. New words should appear at regular intervals and occur freqently till they pass into the Recognition-memory of the boy. Stories and narratives should be introduced at the earliest possible moment and

knowledge which is contained in the richest of all languages."

The arguments on which this conclusion is based, may be given briefly. In the first place, English speaking persons are only an infinitesimal part of the population of India and the average boy is not likely to go outside the province. Ability to speak the language is therefore of doubtful utility to the great majority of children. Secondly, the success of education is measured not by the actual amount of knowledge gained at school, but by the extent to which the student is able to continue his studies after he leaves school. If he is given the ability to read English "with pleasure and a sense of power," it will be valuable, for, even if he leaves school early he will still be left with some power to read and understand English books, and he can, with very little effort and assistance, improve himself. Thirdly, reading is the easiest of the four language bonds. Speaking, writing and understanding are more difficult processes. "These may be taught later to those who wait for them, are better able to master them and more likely to need them." But in the case of the average child, it is a waste of time and money to teach him to speak or to write; what he needs first and most is the ability to read.

Thus he arrives at the interesting conclusion that the immediate and urgent need is to give the children reading ability. How is this to be done?

In part II of the volume, Dr. West describes a number of experiments conducted by him to test and to improve the silent reading ability of Bengali boys.

There are three main types of Reading—observational reading, purposive scanning or skimming and intensive study. Purposive scanning is the most valuable and the most common type of reading and the power to " tear the heart out cf a book " is a very valuable one. Dr. West says " suitable practice for two periods per week throughout the

The real disadvantage lies in having one of the minor languages of the world as the mother-tongue. Being born in a 'bilingual' country like India is a handicap to the child of average mental capacity and intelligence. He has to take up the study of a foreign language to supply the deficiencies of the mother-tongue. The second language is useful and necessary for certain purposes. The fact is illustrated by the child's need of English. The mother-tongue cannot give him access to the growing volume of knowledge in the field of science or technology. English is the key which will open to him a world of new ideas. In Mathematics, in Science and Technology vernacular reference books and text books cannot be obtained and the vocabulary of the vernacular is inadequate for the discussion of the subject. Translation of English books into the vernacular may be attempted, but mere school text-books do not constitute an education or a literature. And it would be impossible to translate all the hundreds of English books on science, history, economics or philosophy, embodying new researches and new discoveries, into the vernacular. English alone will give the boy access to all this information and so English has a practical value.

Dr. West proceeds then to an analysis of the Bengali's precise need of English. He quotes Palmer: " Modern language teaching has suffered much from lack of proper analysis of the purpose of the teacher or the need of the taught. Many desire a knowledge of the written language only. They wish to be able to read and write, not to understand the spoken language or to speak. Some may limit their attainment to a capacity for reading the language; they wish to have access to technical or other books. Such people, having entirely different aims, require entirely different methods."

Dr. West states that our "need is not English to speak, not English to hear, nor to write, but English *to read*, in order that we may enter that vast repertory of [scientific]

The phenomenon of multilingualism has a wide distribution—we may instance America, Ireland, Wales, Belgium and India. No nation, at any level of culture, can afford to rely on the mother-tongue alone for all purposes. Besides the mother-tongue, a second language useful and necessary for certain purposes must be acquired. That second language is the most useful which is also one of the major languages of the world, like English, and serves as a vehicle of communication in matters of commerce, industry, scientific thought and higher culture.

In spite of tendencies in the contrary direction, mankind will continue to be bilingual. The League of Nations and International Conferences for intellectual co-operation may attempt the task of imposing on the Nations of the World a universal language and of making mankind into one Great Society. But the different languages of the world will persist and the educationist is faced with the imperative need to solve the problem of bilingualism or multilingualism in some other way.

Now, what are the advantages or disadvantages of being born in a bilingual area?

It is claimed that the study of a second language assists the child in the acquisition of his own mother-tongue, develops his intelligence and in a general way improves his faculties of imagination, memory and judgment. But this claim is based on a faulty psychology. The Faculty Theory has now been rejected. These advantages of biligualism have been exaggerated.

The disadvantages of the "bilingual" child have also been magnified. It is asserted that the study of a second language leads to boredom, to lack of originality and to fatigue. There is a confusion of thought here between the study of a foreign language and the use of it as the medium of instruction in other subjects.

*

"Bilingualism" by Dr. Michael West

A Summary and a Criticism.

BY

M. S. DORAISWAMY, M. A., L.T.

"THIS is a book of creative power. It will touch the imagination and colour the judgment of all who read it. It is scientific, compassionate, practical. It brings a message to India and Britain and not to India and Britain only, but to all men and women in all countries, East and West."—
Sir Michael Sadler.

The Imperial Education Conference, which met in 1923, suggested the desirability of scientific investigation of the facts of Bilingualism with reference to the intellectual, emotional and moral development of the child. Dr. West, Principal of the Training College, Dacca, conducted the enquiry with special reference to Bengal, and his interesting volume on the subject is a comprehensive survey of the problem.

The problem of Bilingualism, or Multilingualism, arises when two or more languages are used in the same political or educational unit. For example, the child whose mother-tongue is Urdu, begins to learn English as soon as he goes to school; in addition to these languages, he may also learn Persian or Arabic. The various languages tend to fulfil different functions; a certain level of efficiency in each language is both valuable and indispensable. The mother-tongue is intimately bound up with his emotional life and is the perfect colour and vesture of his thought. English has a practical value as it gives him access to a world of new ideas. Persian and Arabic have the same value and importance for him that Greek and Latin have for the English child. Persian has a rich poetic literature and Arabic, besides being a classical language, gives him access to the Koran.

possible and available a public opinion which can enforce conformity to certain accepted and acceptable standards. It makes co-operative effort easy and natural. Self-control and discipline readily become matters of common concern. Such an attitude is an invaluable asset to the school.

Summarising, it may be said that through these activities, intelligently conducted, it is possible to secure the broader, social, civic, moral and avocational improvement so essential for a successful well-rounded modern life. The regular work of the school offers comparatively few opportunities for the development of desirable ideals, habits and attitudes. It is therefore necessary that attention be given to nation-building and citizen-making activities outside the curriculum. In countries and schools with well established traditions, many desirable things can be trusted to happen naturally, but in others, such things will largely have to be made to happen. Deliberate and detailed planning will have to take the place of happy blundering. Then and only then will the school have discharged its obligation to this and the succeeding generations, teaching people to practise fairplay, to live co-operatively, to shoulder responsibility, to think clearly and critically, to exercise initiative and independence, to build strong bodies and active minds and to serve their God by serving their fellowmen.
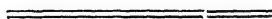
it is necessary that wholesome recreation, within reach of all, should be offered to our pupils under the right kind of supervision and environmental conditions. The inner discipline developed through practice in directing his own affairs will abide with the pupil long after he has ceased to be a school boy.

Proper Use of Leisure.—Too long has the school ignored its responsibility for stimulating interest in avocations. The purpose of education should include the increasing in the pupils of the ability to utilize the common means of enjoyment—music, art, drama, literature and social intercourse, games, picnics, excursions, scouting and other out-of-door pursuits. The problem of adequate and wholesome recreation is solved to a large extent by these activities. Apart from their direct and practical value, they are invaluable for the enlargement and enrichment of personality. 'Bookworms' rarely acquire a broad culture.

Development of Leadership.—Another badly neglected duty is the development of leadership. The regular curriculum is incapable of encouraging the qualities which leaders should possess. Every student, who gets the training that is to be obtained through leading his fellows in some school activity, is preparing himself for leading his fellowmen in the social, civic and vocational activities of later life. The least that the school can do to promote leadership is to furnish the necessary opportunities.

Conclusion

That the school stands to gain by the introduction of extra-curricular activities and the provision of citizenship-training should be obvious. Participation in the management of the affairs of the school tends to enlist the interest and co-operation of the pupil. This 'we-feeling' towards the members of the school—the head-master, the teachers and the fellow pupils—has far-reaching effects. It makes

Social efficiency is therefore an invaluable aspect of the training for life. If education is not primarily a matter of lessons and examinations, but of becoming acquainted with, and adjusted to the world of men and affairs, extra-curricular activities have a large part to play in achieving this very desirable educational objective. In the place of the old-time maxims and sermons on good social behaviour, actual practice in right social action is afforded. Unselfish service, co-operation, toleration and true democracy are ideals which are encouraged by being forced to function in actual social situations. The pupil has to exercise them if he is not to lose his place and standing in the different organisations.

Citizenship Training.—There is no better method of training pupils for their rights and responsibilities as citizens. It has been said that "the good citizen is one who has sense enough to judge of public affairs; discernment enough to choose the officers; self-control enough to accept the decision of the majority; honesty enough to seek the general welfare, rather than his own at the expense of the community; and public spirit enough to face trouble or even danger for the good of the community." Not only do these activities develop the mechanics and devices of government, but they also give opportunities for the development of the true spirit of good citizenship. The pupil learns many civic virtues. He also learns many valuable lessons in the art of ruling and of being ruled. Preparing a student for membership in a democracy by training him in an autocracy or an oligarcy (which is all too often the case in a school) is an incongruity.

Moral Training.—Experience has shown that there is no better way of teaching and applying lessons in ethics than through bringing about the participation of students in extra-curricular activities. Qualities such as justice, honesty fairplay are put to the test. "Every ounce of moral experience is worth a pound of ethical teaching." Besides,

contribution of the great secondary schools of England, Eton, Harrow, Rugby and Winchester. Such schools have an advantage over most of our high schools, in that the entire life of their students is under institutional control during the years of schooling. Though this advantage cannot be duplicated in day schools, a great deal can be done to overcome this handicap in some measure through the intelligent development of extra-classroom activities—clubs, societies, games, sports, scouting, dramatic performances, school magazines, excursions, student councils, social service leagues and the like. The most valuable lesson, perhaps, which we may learn from English and American schools is their recognition of the value of the more purely social activities as a means of training youth.

Nor can it be forgotten that the school is the best and most appropriate agency for the promotion and proper regulation of this side of the pupils' life. Thrown together intimately during a large part of their working hours, the pupils most naturally form themselves into groups, and find in extra-classroom activities wide possibilities for self-expression, self-realization and therefore real education. There is the added advantage of the presence of the teacher's authority which, if extended sympathetically to the social life of the pupils, assures a much better regulation of it than can possibly be secured in any other way. Besides, the social instincts of gregariousness, emulation, and altruism are especially strong during this period. These urges will cause students to form organisations, good or bad in their ultimate effect upon their life and character. And the school cannot escape the responsibility of determining whether the good or the bad effects of this social urge shall prevail.

The Necessary Discipline

Social Efficiency.—The student needs to be able to understand and judge other people and get on with them.

The 'regular' work of the school centres around knowledge, and comparatively few opportunities are provided for the practice of desirable ideals and attitudes. Education is usually treated as something stored up in text-books, certified by tradition, guaranteed by teachers, meant to be taken by children willy nilly in uniform fashion, in order that they may become good citizens! Or else, it is regarded as a process which can go on only in classrooms, under the supervision of school masters. But if man is to be considered as a whole, his well-being means the well-being of his body, the well-being of his spirit as well as the well-being of his mind. The curriculum in its almost exclusive attention to one aspect has neglected these others.

This comprehensive work therefore at the present time, cannot be carried out in the classroom, much less can it be left to chance. So long as the purpose of the school is supposed to be the teaching of 'examinable' subjects prescribed by the ubiquitous syllabus, so long as the mastery of book information takes the place of the building up of the whole æsthetic, intellectual, moral and physical life, so long must most activities calculated to introduce pupils to a world of broadly varied and significant education, be regarded as 'extra curricular.' It is this recognition that the school should seek not only to produce citizens who shall have acquired certain skills and abilities, but somehow to educate them so that they may take into life with them strong character, balanced judgment and robust physique, that has brought into existence, what are usually called 'extra curricular activities.'

What Can Be Done?

From the point of view of the development of attitudes, the 'life' of the school as distinguished from its courses of study has very large significance. This principle has long been recognised abroad. Indeed, the emphasis upon school life has probably been the chief factor in the unquestioned

to help her with her colonial expansion, commerce and administration, and so her outstanding schools set out to give an education which stressed courage, character and love of country. America, after her first struggle for liberty, shared with other countries of the nineteenth century an eager desire for material success, and therefore, the surest means of obtaining that treasure became the object of close study and effective practice.

India's Need

But in India, education has not consciously sought to meet the needs of the times, much less to respond to the ideals of the nation—and therefore her citizens are not found in possession of the many qualities which a progressive people should manifest. Our schools have yet to devise a system of training which will aim at correcting inherent and long-standing defects and drawbacks. If it is true, as we have often been told, that Indians do not co-operate with each other, that they lack initiative and practical-mindedness, that their critical faculty is never exercised, that a sense of responsibility is conspicuous by its absence, that enterprise, originality and independence are unknown—if they do not possess or exhibit these desirable and essential traits, it is evident that in India, the citizen-making institution has not yet begun to function effectively.

The Failure of the School

The Indian high school has yet to recognise its responsibility for this larger social control. Even when it gives comprehension, insight and perspective, and helps the student to become conscious of his ideals, it does little to relate them to the business of being good citizens. Unrelated to national thought, unresponsive to national needs, uninterested in home and community, our educational system seems to move on from one decade to another blessing neither him that gives nor him that receives.

his Middle School. Here in India in those schools where Latin has always been given a place of honour, the study of this language is commenced after the Middle School. Very few institutions teach it in lower forms.

MAKING CITIZENS [1]
WHAT THE SCHOOL CAN DO

BY

Dr. G. S. KRISHNAYYA, M. A. (**Madras**),
M.A., Ph.D. (**Columbia**)

Educational Officer, British Administered Areas, Hyderabad-Deccan.

No matter what the ideals of a particular people have been, the school has always been looked upon as the maker of citizens. History shows that nations have made their education a training for the attainment of the things they valued most. Athens, prizing beauty, symmetry and harmony, both physical and intellectual, sought through her great teachers to cultivate a love of the true, the good and the beautiful. Rome, exalting law, authority and conquest, instructed her youth in oratory, so that they might advocate the claims of law, and skilled them in war, so that they might introduce the Roman Eagle to the uttermost parts of the earth. The education of Monasticism was other-worldly, because the gaze of its adherents was fixed upon the hereafter. Training in arms, loyal and gallant service to the king and devotion to whatever was noble, brave and courteous, comprised the education of the Age of Chivalry, because these were the highest ideals of that period. And in our own time the same thing holds true. England needed patriotic sons, valiant heroes, and dependable representatives

1 A fuller treatment of this subject, and of the ways and means of enabling the school to fulfil this all-important function will be found in the author's book, *Citizen Training in School—A Handbook of Extra-Curricular Activities*, shortly to be issued by the Oxford University Press. Ed.

the average time required to acquire a fair grounding in Latin and Greek is about ten years. Why is the very same child who can learn an Indian vernacular or a foreign modern language in three or four years, obliged to give ten years and more to the learning of Greek or Latin?

In the opinion of the writer, the method followed by the classical school in the teaching of a dead language was responsible for the exaggerated length of time needed for the study of the language, and also for the distaste that the students in general have acquired for that study. If we wish, therefore, to foster in the student an interest in the study of classical language, the methods must be reformed and a process invented, which will enable an ancient language to be learnt as rapidly and as thoroughly as a modern language can be learnt. Let it be remembered that a language which is spoken is not a dead language. Now, to teach a language it is necessary to speak it. Therefore, from the point of view of teaching, there is no dead language.

Fourthly, special text books in Latin and Greek should be prepared on the same method as the books for other languages used in schools. The aim of the text books advocated should be not to proceed from word to word, but from sentence to sentence, doing the work of the author over again, not by translating it, but by composing in the language itself.

8. *Whether it is advisable to begin in the Lower Classes*:—It is but fair that the Indian pupil should be left free from the burden of learning a classical language till he has obtained a fairly good mastery of his own vernacular and of English, which means that the study of the Classical language should be postponed till after the Middle School. In European countries it has been found necessary to postpone the study of Latin and Greek till about the fourteenth year, that is, the age at which the average pupil completes

The fifth and a more important argument for the inclusion of Greek and Latin in the curricula for Indian schools is that no country can, without loss to itself, cut itself off from the cultural bonds of the West. Europe is the seat of what is highest in modern civilization, and as long as Europe holds this place, reverence for Greek and Latin must continue. In this respect, although we have stated above that Indian civilization is not connected with European civilization, yet, to-day after so many years of British administration of this country, the present Indian civilization has become so engrafted on the civilization of the West that it is to be expected that its influence will continue to be felt on the India of the future, carrying with it a good deal of the European traditions and cultural riches as bountifully bequeathed by Greece and Rome. From all points of view, India has everything to gain from the amalgamation of her own civilization with the Western civilization.

7. *Means to Popularize the Study of Greek and Latin*:- The first thing required to work out a scheme to popularize this study is to have capable teachers who are themselves conscious of the importance of the classical languages, and are skilful enough to handle them as "living" languages.

Secondly, the State should be ready to give all possible encouragement in the way of fostering the "humanities." Perhaps, this can be best obtained by giving the students facilities to take up a classical language as a substitute for any subject in which he happens to be constitutionally defective, and also by fixing a "moderate" standard. In trying to raise the standard with very good intentions, the results obtained are to create a general scare about the classical languages.

Thirdly, the chief means to revive the interest in the study of classical languages is, in our opinion, a suitable method whereby these languages become "living" to the student. At present in European schools and colleges

the attraction of foreign universities. Many Indian students go abroad to European universities for advanced studies, and these universities insist, at least for some branches of specialized studies, upon the student possessing a good knowledge of Greek and Latin. Thus the study of Greek and Latin may be required as an essential part of the education of those who desire to proceed to foreign universities. These languages have been and are an invaluable asset in the formation of cultured men.

A good knowledge of these languages is taken for granted in all the great men who have made a name in the field of literature, whereas ignorance of these languages is indeed considered a weak point in one's erudition.

Secondly, there is a modern tendency in the Indian artist of the present day to draw his inspiration from the Greek and Roman Arts. There is now a good deal of imitation of the Western models to be seen in the work of the present-day artists. The desire to imitate the Greek and the Roman Art is a factor in favour of the spread of the study of Greek and Latin.

Thirdly, the encouragement given to the study of Sanskrit, Arabic and Persian itself act as an impetus to the study of Greek and Latin. A profound knowledge of Sankskrit and Persian lore kindles an attraction for Greek and Latin, because of the similarity of their grandeur and beauty. In the student of the Indian classical languages there must necessarily arise a strong desire to know and compare his own classics with the famous classics of Rome and Greece. Thus the study of Sankrit and Persian indirectly encourages the study of Greek and Latin.

Fourthly, even the Indian Doctor, Surgeon, Chemist Botanist, Zoologist and the Lawyer, all find the technical terms of their profession in the inexhaustible storehouse of Latin and Greek. New words of a technical nature are continually being coined from Latin and Greek moulds.

themselves that are attacked, but the fact that the modern students cannot spare the length of time necessary to be given to them.

5. *Neglect in the case of India*:—When we come to consider the study of Greek and Latin from the point of the view of the Indian students, we have to admit that these languages cannot but have an even weaker appeal. The Indian vernaculars have hardly any relationship with either Greek or Latin. When the general trend of events in different parts of India is towards the adoption of a vernacular both as the first language and the medium of instruction in our schools, we must admit that Latin and Greek have a very poor chance of occupying a place in the school curricula. The schools and colleges of this country are easily made to recognise the importance of the study of their own classical languages, such as Sanskrit, Persian and Arabic. These are their ecclesiastical languages, and their literatures contain the record of their institutions—political, social and religious. The Indian students are naturally more interested in the study of Sanskrit, Arabic and Persian than in the study of Greek and Latin. Sanskrit and Arabic are to the Indian what Greek and Latin are to the European. Just as the Scientist, the Doctor and the Lawyer of the West turn to Latin and Greek for technical words, many Indian Scientists are turning to Sanskrit, Persian and Arabic for help in this direction.

Thus the most forcible arguments in favour of Greek and Latin applicable to Europe in general are not applicable to India. Moreover, the Indian civilization as such is not in any way indebted to either Greek or Latin traditions and culture.

6. *Relative Importance of Latin and Greek in the Case of India*:—Yet, in spite of the above unfavourable conditions, there are factors which encourage the study of Greek and Latin even among the Indian students. Firstly, there is

even now they have not ceased to receive the homage of great minds. No votary of the intellectual aristocracy feels that his education is complete until he has paid his visit to the shrines of wisdom in Greece and Rome.

And even in the field of Science they still preserve their usefulness in helping to form technical terms. The influence which Greek and Latin have exerted on many European languages is well known. They are so encrusted within the languages of our our own day that a thorough understanding of the European vernaculars is not possible without a knowledge of Greek and Latin. A "humanist" is certainly better qualified to appreciate the nice distinction of meanings of words in many of our modern languages.

4. *Cause of the Neglect of Greek and Latin:*—Latin and Greek can hardly find a place now in the modern life of the people of any European country. The industrial life of most nations demands an advanced technical training which forms the most important part of the equipment of the individual. When success in life measured in terms of money has become the ambition of the average man, Greek and Latin cannot have any attraction for him. He simply dismisses them with the scornful expression : "It does not pay." It is but natural that in these days of increasing foreign trade the need for a knowledge of modern European languages should be more keenly felt than for the knowledge of the dead classical languages. Life has become a struggle for existence, and any one who wishes to win in this struggle can ill afford to give any time to the study of dead languages. It is no wonder, then, that Latin and Greek are neglected and displaced by other subjects more useful in life.

The chief reason, therefore, why the study of Greek and Latin is now so much neglected is because all education has been placed on a utilitarian basis. If these languages have their adversaries, it is not in reality the languages

school where Latin was taught. Latin was then the language of the Universities. It was the language used in almost every part of Europe for literary, political and ecclesiastical purposes. Every man who laid claim to any degree of culture possessed a scholarly knowledge of Greek and Latin. Speeches in Parliament were not considered elegant without quotations from these languages. Milton was the State Latin Secretary. Bacon had his works translated into Latin, so that they might live for all time. In those days the Vernaculars were not considered to be the languages of the cultured, and therefore not the fit medium for great works. Greek and Latin were then rightly used as wonderful sources from which poets and authors drew their inspirations of all that is True and Beautiful.

The present civilization in the West is the daughter of the Renaissance, and the Renaissance was made possible by the joining of the Greek traditions with the Roman Law. For this reason the historical value of Latin and Greek is indeed immense. Even in politics, the European countries borrowed their political philosophy and institutions from them.

3. *Importance of the Study of Greek and Latin at the Present Time*:—Latin and Greek possess a literature unsurpassed by any other language, and so they still have their claim even from the point of view of utility. The study of these languages gives the highest literary pleasure. They open out a wonderful avenue of inspiration in the way of conceiving the form of a thought as well as in the manner of expressing it, and are therefore capable of rendering the greatest service to the classical writer and thinker in whatever language he may choose to give expression to the creations of his genius. It is true that their translations can be read, but they cannot replace the originals as they can never render the soul of the original composition.

Again Latin and Greek literatures gave models for poets, artists, philosophers and politicians in the past, and

*

The Study of Greek and Latin in Indian Schools

BY

Rev. FATHER A. J. STEFANETTI.

(Owing to ill-health, Rev. Father A. Stefanetti has recently retired after doing valuable work as Rector of All Saints' Institution, Hyderabad, Deccan, for nearly 6 years. He took a keen interest in the Hyderabad Teachers' Association, and as a member of the Sub-Committee appointed by the Association to report on the Teaching of Classical Languages in Schools, he prepared an instructive and interesting paper on "The Study of Greek and Latin", which we publish below—Ed.)

1. *Introduction*:—Greek and Latin are dead languages. As such, the place that is given to them in school curricula appears to be more a matter of concession than privilege. They are not totally denied a place in our schools, but their importance as a means of obtaining the full benefit of a liberal education is hotly challenged as being against the spirit of the age—the age that has given us a method of education entirely based on a utilitarian plan.

We do not wish to fight for restoring Greek and Latin to that place which they once occupied, nor do we even intend to maintain that they are to be classified as essential subjects in every form of education, but we want to stress the fact that these two languages have for centuries been adopted as the basis of a higher literary education by the more advanced nations, and, therefore, we recommend that they should be given a place in our school curricula.

2. *Importance of the Study of Greek and Latin in the Past*:—There was a time when education included the study of Latin and Greek. A Grammar School then meant a

*

THE HYDERABAD TEACHER.

CONTENTS.

PAGES.

THE STUDY OF GREEK AND LATIN IN INDIAN SCHOOLS BY REV. FATHER A. J. STEFANETTI. 1

MAKING CITIZENS. WHAT THE SCHOOL CAN DO BY DR. G. S. KRISHNAYYA, M. A. (MADRAS), M. A., Ph. D., (COLUMBIA). 8

"BILINGUALISM" BY DR. MICHAEL WEST *A Summary and Criticism* BY M. S. DORAISWAMI, M. A., L. T. 15

A PLEA FOR PLAY-WAY IN EDUCATION BY S. M. H. NAKAVI, B. A., Dip. Ed. (Leeds), Head-Master, Nampalli High School, Hyderabad. 27

THE HYDERABAD TEACHERS' ASSOCIATION *Summary of General Secretary's Report for the Period June 1931—August 1932.* 31

EXTRACTS FROM EDUCATIONAL NEWS BULLETIN 35

RULES OF THE LIBRARY OF THE HYDERABAD TEACHERS' ASSOCIATION. 41

EDITORIAL. 48

REVIEWS. 51

*

The Hyderabad Teacher.

ADVERTISEMENT RATES.

Space.	Whole year.		Six months.		Per Issue.	
	B. G.		B. G.		B. G.	
	Rs.	As.	Rs	As	Rs.	As.
Full page ...	12	0	6	0	4	0
Half page	6	0	3	8	2	0
Quarter page	3	0	1	12	1	0
Per line ...	0	10	0	8	0	6

SUBSCRIPTION RATES.

For the Nizam's Dominions O. S. Rs. 3 annually, (including postage).
For British India B. G. Rs. 3 a year (including postage).
Single copy O. S. As. 12 for H. E. H. the Nizam's Dominions
Single copy B.G. As. 12 for British India.

The Urdu Section is published separately also. Subscription Re. 1 As. 14 a year.

Members of the Hyderabad Teachers' Association can obtain back numbers of THE HYDERABAD TEACHER at a reduced price.

Apply to.

S. M. KHAIRATH ALI, MANAGER,
"**The Hyderabad Teacher**,"
Gun Foundry, Hyderabad-Deccan.

Vol. VII. REGISTERED ASAFIA NO. 47. No. 1.

THE HYDERABAD TEACHER

Quarterly Magazine of the Teachers' Association, Hyderabad-Deccan.

Under the Patronage of
Khan Fazl Mohamed Khan Esq., M. A.,
Director of Public Instruction.

JULY-SEPTEMBER, 1932

SECUNDERABAD-DECCAN
RINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.

1932.

Annual Subscription Rs. 3.

Vol. VII. No. 1.

THE

HYDERABAD TEACHER

JULY-SEPTEMBER, 1932

Editorial Staff:

S. ALI AKBAR, M. A. (Cantab.)
F. C. PHILIP, M. A.
M. ATAUR RAHMAN, B. A.
Dr. G. S. KRISHNAYYA, M. A., Ph. D., (Columbia.)

SECUNDERABAD-DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.

1932.

*

جلد (۷) شمارہ (۳)

زیر سرپرستی جناب خان فضل محمد خاں صاحب ایم۔ اے ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مجلس ادارت:- سید علی اکبر ایم۔ اے (کنٹب) مدیر مسئول
سید فخر الحسن ملا بی اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) مدیر
محمد عبد النور صدیقی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) شریک مدیر

مقاصد

(۱) طبقۂ اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدار کرنا۔
(۲) طبقۂ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا۔
(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔
(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔
(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

قواعد

(ا) رسالہ کا نام حیدرآباد ٹیچر ہوگا اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شایع ہوگا
(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔
اندرون و بیرون ممالک محروسۂ سرکار عالی تین روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ)
صرف اردو حصہ (عہ ۱۲/) سالانہ قیمت فی پرچہ اردو انگریزی (۱۲/) صرف اردو (۸/)
(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہو سکے گا۔
(د) صرف وہی مضامین درج ہو سکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔
(ر) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہیے۔
(س) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ہذا رہے گا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	٥ـ	عہ ۸/	ســے،
نصف صفحہ	عہ	عہ ۱۲/	عہ ۸/
ربع صفحہ	عا ۸/	عہ ۶/	۱۵/
فی سطر	۱۰/	۸/	۶/

اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن میں طبع ہو کر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر مہتممی تعلیمات بلدہ سے شایع ہوا

حیدرآباد ٹیچر

بابتہ ماہ آذر ۱۳۴۲ف م اکٹوبر ۱۹۳۲ء

فہرست مضامین

جلد ۷ شمارہ (۲)

نشان سلسلہ	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	خطبہ استقبالیہ انجمن اساتذہ بلدہ کی چھٹی کانفرنس	جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹیب) صدر مہتمم تعلیمات بلدہ	۲
۲	رپورٹ انجمن اساتذہ بلدہ	جناب سید محمد شریف صاحب مشہدی معتمد عمومی	۸
۳	خطبہ صدارت	جناب نواب سر نظامت جنگ بہادر (ایم اے) بیرسٹرایٹ لا سابق صدر المہام سیاسیات سرکار عالی	۱۱
۴	رپورٹ تعلیم ڈرائنگ	جناب مولوی شیخ ابو الحسن صاحب عنابی اے۔ یل۔ ٹی پرنسپال مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ دار العلوم بلدہ	۲۰
۵	تجرباتی تعلیمی نفسیات	جناب ابو المکارم مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے۔ ڈپ ایڈ (عثمانی) مددگار مدرس فوقانیہ دار العلوم بلدہ	۳۸
۶	رپورٹ السنہ مشرقیہ		۴۸
۷	روئداد ضمنی جلسہ السنہ قدیم	جناب مولوی سید حسام الدین صاحب فاضل معتمد کمیٹی	۶۰
۸	رپورٹ نمائش تعلیمی بابتہ ۱۳۴۱ف	جناب مولوی نظیر حسین شریف صاحب معتمد نمائش کمیٹی	۶۲
۹	شذرات		۶۴
۱۰	روئداد کانفرنس انجمن اساتذہ بلدہ		۷۱

خطبۂ استقبالیہ

انجمن اساتذہ مستقر بلدہ کی چھٹی سالانہ کانفرنس

ازمولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب) صدر نشین مجلس استقبالیہ

معزز خواتین و حاضرین جلسہ صدر نشین مجلس استقبالیہ کی حیثیت سے میں آپ تمام اصحاب کی اس انجمن اساتذہ حیدر آباد کی چھٹی سالانہ کانفرنس میں شرکت کا مخلصانہ خیر مقدم کرتا ہوں۔ نواب سر نظامت جنگ بہادر نے جو پر سکون گوشۂ عافیت سے نکل کر اس کانفرنس کی صدارت کو قبول فرمایا ہے۔ یہ ہمارے لئے باعث فخر و مباہات ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ نواب سر نظامت جنگ بہادر جیسے مبحر او ربلند پایہ قابلیت کا شخص ہماری کانفرنس کی کارروائیوں کی رہنمائی کر رہا ہے شاعر کی حیثیت سے آپ کا شہرہ چار دانگ عالم میں بلند ہے لیکن آپ محض شاعر ہی نہیں بلکہ ایک زبردست مفکر دائمی مطالعہ جاری رکھنے والے شخص ہیں جنہوں نے مغربی اور مشرقی فلسفہ علوم کے سرچشمہ سے گہرا فیض حاصل کیا ہے۔ اس امر کے اعادہ کی ضرورت نہیں کہ ایک فلسفی ایک مدرس کے مجمع کی کافی رہنمائی کر سکتا ہے۔ فن تعلیم کے آپ کس قدر ماہر کیوں نہ ہوں آپ صحیح معنوں میں مدرس نہیں ہو سکتے تا وقتیکہ آپ اپنا کوئی نصب العین قرار نہ دیں۔ اور نہ کوئی نظام تعلیم مکمل کہلایا جا سکتا ہے تا وقتیکہ اس کی فلسفیانہ بنیادیں مستحکم نہ ہوں۔ اٹھارویں صدی کے نصف آخر اور انیسوی صدی کے نصف اول میں جرمنی کی تاریخ تعلیم بیشتر ان اثرات کی تاریخ ہے جو کیانٹ اور ہیگل جیسے معرکتہ الآرا فلاسفہ نے اس ملک کے نظام تعلیمی پر مرتب کیا۔ لاک جے۔ یس۔ مِل اور ہربرٹ اسپنسر نے انگلستان کی تعلیمی نشو و نما میں جو حصہ لیا اس سے فن تعلیم کا ہر مطالعہ کرنے والا بخوبی واقف ہے ہم تعلیم کے علمی میدان میں گامزن ہیں، ہمارا تعلق محض اپنے شاگردوں کے جسمانی اور دماغی نشو و نما کی حد تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے ذمہ ان کی روحانی ترقی بھی ہے اس لئے ہمارا یہ فریضہ ہے کہ ہم اکثر و بیشتر فلاسفہ کے مشورہ و رہنمائی سے مستفید ہوں۔ ہندوستان کے تعلیمی مستقبل کے لئے میں اسے ایک نیک فال سمجھتا ہوں کہ اس سرزمین کے موجودہ دور کے فلاسفہ نے یہاں کے تعلیمی مسائل میں دلچسپی لینی شروع کر دی ہے۔

ایک زمانہ تھا جب کہ مدرسین کے جلسوں سے کسی کو دلچسپی نہ ہوتی تھی بجز ان اصحاب کے جن کا تعلق راست تعلیم سے ہوتا تھا بہت سے حضرات کسی نکتہ چیں کے اس قول کے ہم آہنگ تھے کہ "دنیا کا سب سے قابل رحم منظر مدرسوں کے اساتذہ کا اجتماع ہوتا ہے" اگرچہ اب بھی مدرسین کی اہمیت کو عوام نے اس حد تک محسوس نہیں کیا ہے جس حد تک کہ وہ اس اعتراف کی مستحق ہے تاہم یہ واقعہ ہے کہ عوام میں تعلیم سے روزافزوں دلچسپی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ اور لوگوں نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ تعلیم کا تعلق صرف مدرسین اور والدین سے ہی نہیں ہے بلکہ ان تمام اصحاب سے ہے جو اپنے ملک کی فلاح و بہبود کے دل سے خواہاں ہوں۔ اس زاویہ نگاہ میں تبدیلی کا نمایاں ثبوت یہ ہے کہ آج کے اجتماع کو معزز مہمانوں کی کثیر تعداد نے اپنی تشریف آوری سے مفتخر کیا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انجمن اساتذہ بلدہ کے اراکین ان اصحاب کے بیحد مشکور ہیں جنہوں نے ہماری دعوت قبول فرما کر ہمیں عزت بخشی ہے۔ ہمیں اس سے بجا طور پر بیحد مسرت حاصل ہے کہ آج ہم اپنے درمیان جناب مولوی فضل محمد خاں صاحب کو تشریف فرما دیکھتے ہیں۔ جنہوں نے اس انجمن کی سرپرستی اور اعلیٰ عہدہ دار تعلیمات کی حیثیت سے ہمیں بھی قیمتی مشورہ اور رہنمائی سے دریغ نہیں فرمایا۔

اب ہم کانفرنس کی کارروائی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے انجمن اساتذہ کے جنرل سکریٹری کی رپورٹ سے جس کو آپ ابھی سماعت فرمائیں گے اور کانفرنس کے پروگرام کے ملاحظہ کے بعد جس کا بیان آپ حضرات میں تقسیم کر دی گئی ہیں آپ کو انجمن کے کام کی نوعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ سابق ناظم تعلیمات نواب مسعود جنگ بہادر کی سرپرستی میں سات سال قبل جن اغراض و مقاصد کے تحت اس انجمن کی افتتاح کی گئی تھی حسب ذیل تھے۔

(۱) مختلف مدارس کے اساتذہ میں یگانگی اور ارتباط کی روح پھونکنا۔

(۲) تعلیم کے متعلق جدید خیالات اور طریقہ تعلیم سے ان کو واقف رکھنا۔

(۳) اتحاد عمل سے ان کی عام دقتوں کو حل کرنا۔

تعلیم کے مختلف علمی مسائل پر غور کرنے کے لئے ماہانہ مجلسوں کا انعقاد۔ نمونہ کے اسباق کا انتظام۔ نصاب کے مختلف مضامین پر رپورٹیں تیار کرنے کے لئے سب کمیٹیوں کا انعقاد سہ ماہی رسالہ اور کتب خانہ کا افتتاح اور سب سے زیادہ اہم سالانہ کانفرنس اور تعلیمی نمائش کا انعقاد یہ سب وہ ذرائع ہیں جن کو انجمن اساتذہ نے مذکورہ مقاصد کی تکمیل کی خاطر اختیار کیا ہے۔ سالانہ کانفرنس ہماری سالانہ مساعی کے انجام کو بہ خوبی سے واضح نہیں کرتی جس خوبی سے کہ وہ سال آئندہ کے لئے نظام العمل کا تعین کرتی ہے ہم سال آئندہ کے پروگرام کو قبل از قبل متعین کر لیتے ہیں سال آئندہ کی کانفرنس کے انعقاد تک حتی الوسع اس پروگرام کی خاطر خواہ تکمیل کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہر سال خاص طور سے دو یا تین مضامین پر اپنی توجہ مرکوز کر کے

اب تک نو رپورٹیں تیار کرلی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے

رپورٹ تعلیم انگریزی۔ تعلیم تاریخ۔ تعلیم ریاضی۔ تعلیم سائنس۔ تعلیم اردو۔ تعلیم اخلاق۔ پیشہ ورانہ تعلیم اور جسمانی تعلیم۔ تعلیم جغرافیہ۔

ان رپورٹوں کی تیاری میں انجمن کے اراکین کو ملکر کام کرنے کی خاصی مشق ہوگئی ہے۔ ان تمام رپورٹوں کو حیدرآباد ٹیچر میں شائع کردیا گیا ہے۔ ناظم صاحب تعلیمات نے ہماری کارگزاری کو بنظر استحسان دیکھا ہے اور ان رپورٹوں میں سے بعض کی خوبیوں کا اس طرح اعتراف کیا ہے کہ گشتیوں کے ذریعہ سے صدر مدرسین مدارس کی توجہ خاص طور پر ان کی جانب مبذول کرائی ہے۔

گذشتہ کانفرنس کے انعقاد کے بعد دو اور رپورٹیں مرتب ہوئی ہیں۔ ایک متعلق بہ تعلیم ڈرائنگ اور دوسری متعلق بہ تعلیم السنۂ قدیم۔ اول الذکر رپورٹ مولانا شیخ ابوالحسن صاحب و غیاث الدین صاحب کی مساعی سے اور دوسری رپورٹ مولوی حسام الدین صاحب۔ مولوی سید ہاشم صاحب۔ مولوی سعادۃ اللہ خاں صاحب۔ مسٹر چند رواکر اور ریورنڈ رفادر اسٹفنانی کی کوششوں سے تیار ہوئی۔ یہی ترمیمات کے ساتھ جو ضمنی اجلاس کانفرنس میں پیش ہوں گے۔ دونوں رپورٹیں کل آپ کے روبرو پیش کی جائیں گی۔ ڈرائنگ کے فن واری ضمنی جلسہ کی صدارت مولوی سید محمد حسین صاحب نائب ناظم تعلیمات فرمائیں گے۔ یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ صاحب موصوف نے ہماری امداد فرمائی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ تین سال قبل آپ نے ضمنی کمیٹی "پیشہ کی تعلیم" کے صدر نشین کی حیثیت سے بیش بہا کام انجام دیا تھا۔ اسی طرح ہم خود کو اس بارہ میں خوش قسمت سمجھتے ہیں کہ "السنۂ قدیم" کی ضمنی کمیٹی کی صدارت کے لئے ایک عربی کے عالم اور تجربہ کار استاد ڈاکٹر عبدالحق کی قابل قدر خدمات حاصل ہوئی ہیں ایسے معروف اور موزوں صدر نشینوں کی رہبری میں دونوں ضمنی جلسوں کی کامیابی یقینی ہے۔

امسال کی کانفرنس کا خصوصی پہلو ضمنی جلسوں کا انعقاد ہے۔ ڈرائنگ اور السنۂ قدیم کے ضمنی جلسوں کے علاوہ ہم نے انگریزی کا بھی انتظام کیا ہے۔ اس سے بیشتر ۱۹۲۹ء میں مسٹر لیف۔ سی فلپ کے زیر صدارت ایک سب کمیٹی نے تعلیم انگریزی کے متعلق ایک تحسین آفریں رپورٹ مرتب کرلی تھی۔ لیکن ان چند جدید مسائل پر غور کرنے کے لئے جو بعد از ترتیب رپورٹ جدید انگریزی کتب کے تحریک نصاب کرنے کی وجہ سے پیدا ہوگئے ہیں اس سب کمیٹی کے انعقاد کی ضرورت لاحق ہوئی۔ انجمن اساتذہ سے مخلصانہ ہمدردی اور مدارس میں انگریزی تعلیم کو ترقی دینے کا شوق مسٹر سید محمد اعظم میں اس قدر زبردست تھا کہ انھوں نے نہ صرف انگریزی کی ضمنی کمیٹی کی صدارت قبول فرمائی۔ بلکہ انگریزی کی تعلیم دینے

والے مدرسین کی سہولت کی خاطر مسٹر عطار الرحمٰن کے ذریعہ تعلیم انگریزی کے متعدد اسباق مظاہرہ کا انتظام فرمایا۔ مجھے اس امر کے اظہار سے مسرت ہوتی ہے کہ کانفرنس کے انعقاد کے ایک ہفتہ پہلے (۳۰) مدارس کے (۱۲۵) اساتذہ نے مختلف معینہ ایام میں ان اسباق سے فائدہ اٹھایا۔

مسٹر عطار الرحمٰن نے انکسار آ ان اسباق کو اسباق مظاہرہ کے نام سے موسوم کیا لیکن یہ فی الحقیقت نمونہ کے اسباق تھے جن کی تعلیم ایک ایسے شخص نے دی جن کو انگریزی تعلیم کا ایک خاص فن داں معلم تسلیم کیا جا سکتا ہے انجمن اساتذہ مسٹر اعظم کے ان اسباق کی تعلیم کے لئے مشکور ہے اس ابتدائی مرحلہ کے طے کرنے کے بعد ہم آج سہ پہر میں انگریزی کی تعلیم پر نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز مباحثہ کی توقع کر سکتے ہیں۔

انجمن اساتذہ کے مختلف مرکزوں میں ماہانہ جلسوں کے انعقاد سے اراکین میں ان تمام مدارس کے اساتذہ کی حاضری لازمی ہے جن کا تعلق قواعد انجمن منظورہ سرکار کے تحت ہے توقع کی جاتی ہے کہ انجمن کے ماہانہ مباحثہ میں اراکین زیادہ دلچسپی لیں گے تاکہ مختلف شاخوں کے معتمدین کو ان کی غیر حاضری کی سرکاری طور پر اطلاع دینے کی ناخوشگوار ضرورت لاحق نہ ہو۔ ہمارے معزز مہمان یہ سنکر شاید یہ معلوم کرنے کے لئے منتظر ہوں کہ آیا ہماری سالانہ کانفرنس نے مدرسین کی حاضری لازمی قرار دی ہے سالہائے ماسبق میں بیشک یونہی تھا لیکن امسال ایام تعطیل میں کانفرنس ہونے کی وجہ سے حاضری لازمی نہیں ہے انجمن اساتذہ کے مستقبل کے لئے یہ ایک امید افزا علامت ہے کہ موجودہ کانفرنس میں مدرسین کی اسی قدر تعداد حاضر ہے جس قدر کہ سابقہ کانفرنسوں میں تھی۔

انجمن اساتذہ کے کام کے ایک اور پہلو کی جانب آپ کی توجہ منعطف کرانی ہے۔ ہماری نوعیت کی انجمن کے لئے ایک اچھے کتب خانہ کی اہمیت ایک کھلی حقیقت ہے۔ ہم خان فضل محمد خاں صاحب ناظم تعلیمات کے مشکور ہیں کہ انہوں نے کتب خانہ کی توسیع اور قیام کی خاطر ہمارے لئے مالی امداد حاصل فرمائی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ کیانٹربری کے بڑے پادری نے کسی موقع پر یہ کہا تھا کہ "تعلیم کا حقیقی اندازہ اس سے نہیں ہوتا کہ مدرس اپنے مفوضہ کام کو کس طرح انجام دیتا ہے بلکہ اس سے کہ وہ اپنے فرصت کے اوقات کو کس طرح صرف کرتا ہے" کتب خانہ کے قیام سے انجمن اساتذہ، مدرسین کو اپنے فرصت کے اوقات کے صحیح استعمال کی ترغیب دے رہی ہے اس کے علاوہ کتب خانہ سے رپورٹوں کی ترتیب میں بھی بہت کچھ مدد ملتی ہے۔

ہمارے مشاغل کا ایک اور پہلو ہے جس کی طرف ہلکا سا اشارہ کرنا چاہتا ہوں وہ تعلیمی نمائش ہے جو کانفرنس کے ساتھ ہر سال رکھی جاتی ہے اور بلدہ حیدرآباد میں اپنی نوعیت کی ایک ہی ہے اس

نمائش کی تنظیم سے ایک مفید مقصد حاصل ہوتا ہے۔ یعنی اس سے ڈرائنگ اور دستی مشاغل کی تعلیم کو تقویت پہنچتی ہے اس سلسلہ میں مس مچل ہمارے پرجوش شکریہ کی مستحق ہیں جنہوں نے نمائش کمیٹی کے صدر نشین ہونے کی حیثیت سے اس کو کامیاب بنانے میں جس کا کہ ہم کو اعتراف ہے انتھک کوشش کی ہے اس سال نمائش کے بعض شعبوں میں لڑکیوں کو لڑکوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کا موقع دیا گیا ان شعبوں کے اکثر انعامات لڑکیوں کو ملے امید ہے کہ اس سے مدارس ذکور کو ڈرائنگ اور ہر قسم کے دستی کام کی جانب آئندہ زیادہ توجہ کرنے کی ترغیب ہوگی۔

۲۔ گذشتہ کانفرنس کے بعد ہماری انجمن میں ایک نہایت ہی محترم اور کار آمد رکن مولوی ظہور علی صاحب کی وفات سے کمی ہوئی انجمن کی جو خدمت انہوں نے کی ہے اس کی یاد آپ کے ذہن میں بالکل تازہ ہے اس کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں مولوی صاحب مرحوم پیدائشی طور پر مدرس اور عوام کے خادم تھے ان کے نزدیک ان کا فریضہ ان کی جان سے زیادہ قیمتی تھا انجمن کے سارے اراکین کو ان کی وفات کا شدید صدمہ ہے۔

۳۔ میرا خیال ہے کہ انجمن اساتذہ کے مشاغل کا میں نے کافی ذکر کر دیا ہے جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انجمن ایک حقیقی ضرورت کو پورا کر رہی ہے اور یہ کہ اس کا وجود محض باتیں بنانے کے لئے نہیں بلکہ ٹھوس کام کرنے کے لئے ہے۔ جن مقاصد میں ہم اب تک کامیاب ہو چکے ہیں ان سے ہمارے مساعی میں مستقبل کے لئے اور ترغیب و تندی پیدا ہونی چاہئے ذاتی اصلاح اور تعاون عمل کو اپنا شعار بنا کر ہم سر رشتہ کو مدد پہونچانے کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں اور یہی ہمارا خاص مقصد ہے مدرس کو چاہئے کہ ہر ممکنہ طریقہ سے پیہم کوشش کر کے خود کو بہتر بنائے تاکہ نہ صرف اس کی تعلیم خاطر خواہ ہو بلکہ وہ خود ان ساری صفات کی زندہ مثال ہو جو وہ طلبہ میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

۴۔ ہمارے جلالت مآب فرمانروا کے شاندار مہر آگیں عہد حکومت میں جن کی تعلیم سے دلچسپی اور ملک کے نوجوانوں کی فلاح کا خیال خوب آشکارا ہے اس ریاست کی تعلیم کو مستحکم بنیاد پر قائم کرنے کے لئے دو اہم کام ہوئے۔ پہلا جز جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے اور دوسرا جز مدارس کے نصاب کی اصلاح نئے نصاب تعلیم نے ہماری جد و جہد کے لئے نیا باب کھول دیا ہے جس کے لئے عالیجناب خان فضل محمد خاں صاحب ناظم تعلیمات قابل مبارکباد ہیں۔ اگر آپ اس نصاب کا بغور مطالعہ کریں اور اس کا مطالعہ کرنا ہر مدرس کا فرض بھی ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ نصاب ملک کے معاشرتی اور اقتصادی حالات کے مطابق ہونے کے علاوہ فن تعلیم کے چند جدید اصول پر مشتمل ہے میرے خیال میں اس نصا

کے اطمینان بخش خصوصیات میں سے سائنس کا لازمی مضمون کی حیثیت سے داخل کیا جانا اور
دستی مشاغل کی اہمیت اور جسمانی ریاضت کی تعلیم ہے لیکن نصاب کتنا ہی مکمل کیوں نہ ہو وہ تنہا تعلیمی
عمدگی کے معیار کو بلند نہیں کر سکتا جس طرح تیز سے تیز گھوڑا دوڑ میں اناڑی سوار کے ان کے نیچے بازی ہار جاتا
ہے اسی طرح دنیا کا بہترین نصاب بھی بے سود ثابت ہوگا اگر وہ ایسے مدرسین کے ہاتھ میں پڑے
جو اس کے اندرونی اصول کو نہ سمجھیں جن اصول پر یہ جدید نصاب مبنی ہے ان میں سے صرف ایک
امر کی جانب اساتذہ کی خاص توجہ منعطف کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ مدرسہ کی زندگی اور تعلیم کو جہاں تک ممکن ہو
زندگی کے حقائق کے موافق ہونا چاہئے۔ ہمارے مدارس کے اساتذہ اس اصول کی اہمیت کو کافی
طور پر ذہن میں نہیں لاتے اور جو اس کی اہمیت کو جانتے ہیں ان میں عملی طور پر اس کو وسیع الخیالی اور
اُپج کے ساتھ کام میں لانے کا مادہ نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے مدارس کی تعلیم بڑی حد تک باوجود
تبدیل نصاب کتابی بن جاتی ہے اس کی تشریح کے لئے میں بہت سی مثالیں دے سکتا تھا لیکن سردست
دو ہی پر اکتفا کرتا ہوں کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ایک مرتبہ ایک مدرسہ کے معائنہ کا اتفاق ہوا جو رود
موسیٰ سے بمشکل دو گز کے فاصلہ پر ہوگا میں نے یہ دیکھا کہ جماعت چہارم کے طلبا نے کبھی اس پر غور
نہیں کیا تھا کہ ندی کس سمت کو بہ رہی ہے دوسرے مدرسہ میں جو فوقانیہ تھا مجھے اس سے بڑھکر
حیرت ہوئی جب میں نے یہ دیکھا کہ جماعت ہشتم کے طلبا نے کبھی جنوب مغربی اور شمالی مشرقی موسمی
ہواؤں کے زمانہ میں بادل کی حرکت کا مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ تعلیم بالکل بے نتیجہ ہے اگر وہ بچہ میں اپنے
ماحول کے سمجھنے کی لیاقت نہ پیدا کرے۔ اس قسم کے ملکہ کو ترقی دینے کے لئے مدرسہ کی تعلیم کو عملی
زندگی سے متحد کرنے کے لئے سب سے سودمند چیز بچہ کے لئے جد وجہد کے طریقہ کو کام میں لانا ہی جرمنی
میں ان طریقوں کی اہمیت اتنی ہے کہ وفاقی حکومت کے آئین میں جو دفعہ تعلیم سے متعلق ہے وہ
دوسری چیزوں کے علاوہ یہ لازم گردانتا ہے کہ سارے مدارس میں تعلیم ذاتی جد وجہد کے اصول پر
دی جائے گی۔ انگلستان میں اس اصول پر کاربند ہونے کی شہادت اس سے ملتی ہے کہ آپ کو جوق
در جوق طلبہ بڑے شہروں کی سڑکوں پر اپنے اساتذہ کے ساتھ عجائب خانہ نباتی اور حیوانی باغ
کارخانوں اور تاریخی اہمیت رکھنے والی عمارتوں کو جاتے ہوئے نظر آئیں گے۔ مدرسہ کی زندگی اور
مدرسہ کے باہر کی زندگی میں ہندوستانی مدارس میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ اسی وقت نابید
ہوگا جب کہ مدرسین تحریر و تقریر کے ذریعہ نہیں بلکہ تجربہ کے ذریعہ تعلیم دیں۔

۵ خواتین و معزز حاضرین اگر میں نے اساتذہ کی خدمت میں کوئی مشورہ پیش کیا ہے تو اس

کا سبب یہ ہے کہ مدارس مہتم کے لئے یہ امر ناگزیر ہے جب کہ وہ اساتذہ کے مجمع میں تقریر کرے اور مشورہ کا ذریعہ اس میں پیدا نہ ہو۔ لیکن کچھ ہی ہو مجھے ختم کرنا چاہئے کیونکہ اساتذہ کا اس کثیر تعداد میں یہاں جمع ہونا اس لئے نہیں کہ وہ مجھ سے مشورہ یا فیض حاصل کریں بلکہ اوروں سے جو مجھ سے کہیں زیادہ فضیلت رکھتے ہیں بالخصوص ان ہستیوں سے جیسے کہ فاضل صدر اور ڈاکٹر کرشنیا سے جو کل اس عنوان پر تقریر کریں گے کہ "ہم مدرس کی حیثیت سے کس طرح خود کو بہتر بنا سکتے ہیں" اور میرے دوست مسٹر کیتھال سے گو ان کی تقریر کا عنوان "کاہل لڑکا" ہے نہ کہ "کاہل مدرس" فقط۔

رپورٹ انجمن اساتذہ متعلقہ بلدہ حیدرآباد دکن

بابتہ شہریور ۱۳۴۰ف لغایتہ مہر ۱۳۴۱ف

صدر محترم معزز حضرات و خواتین کرام

خدا کا شکر ہے کہ برخلاف سال گزشتہ زمانہ زیر رپورٹ میں کسی مرض متعدی کی وجہ سے انجمن کے کام میں خلل واقع نہیں ہوا گذشتہ کانفرنس میں جو طریقہ کار اختیار کیا گیا تھا وہی اس مرتبہ بھی اختیار کیا گیا۔ بلکہ اس میں اس قدر اور اصلاح کردی گئی ہے کہ مقررہ مضامین پر جو رپورٹیں اس کانفرنس میں پیش شدنی ہیں اُن پر مضمون متعلقہ کے مدرسین اور اس مضمون سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو علحدہ علحدہ جلسوں میں بخوبی غور و خوض اور مباحثہ کرنے کا موقع دیا گیا اس کے بعد عام اجلاس میں وہ رپورٹیں بغرض منظوری پیش ہوں گی۔

حضرات آپ کو یاد ہوگا کہ گذشتہ کانفرنس میں اعلان کیا گیا تھا کہ اس کانفرنس میں ڈرائنگ، السنۂ قدیم علمی اور دستی مشاغل پر رپورٹیں پیش کی جائیں گی مگر بعد میں مرکزی انتظامی کمیٹی نے اس خیال سے کہ ابھی دستی مشاغل کو نصاب میں شریک ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے یہ مناسب خیال کیا کہ حضرات مدرسین کو اس مضمون کے متعلق کافی تجربہ حاصل ہونے کے بعد دستی مشاغل کی رپورٹ مرتب کی جائے لہذا اس کانفرنس میں صرف السنہ علمی اور ڈرائنگ کی سب کمیٹیوں کی رپورٹیں پیش ہوں گی۔ گذشتہ کانفرنس کی منظور شدہ دونوں رپورٹیں بتوسط دفتر صدر مہتمی تعلیمات بلدہ صد

میں پیش کی جا چکی ہیں امید ہے کہ ان پر مناسب کارروائی ہوا کرے گی۔

شاخہائے انجمن۔ سال زیر رپورٹ میں انجمن کی شاخوں کی تعداد میں جو (۱۴) ہیں کوئی کمی نہیں ہوئی

اراکین انجمن۔ انجمن ہذا کے اراکین کی تعداد میں بمقابلہ سال گذشتہ تقریباً (۲۰) کا اضافہ ہوا ہے اور اس طرح کل اراکین کی تعداد ساڑھے گیارہ سو کے قریب ہوگئی ہے۔ مدارس سکندرآباد و ریزیڈنسی کے دفتر صدر مہتممی تعلیمات بلدہ سے علیحدہ ہوجانے کی وجہ سے تعداد اراکین میں خاصی کمی ہوجاتی مگر علاقہ مذکور کے ایجوکیشنل آفیسر جناب ڈاکٹر کرشنیا صاحب کی انجمن ہذا سے خاص دلچسپی کی وجہ سے مدارس مذکورہ کا انجمن ہذا سے تعلق برقرار رہے گا انجمن ہذا کے قواعد دفعہ (۴) ضمن (ب) کے لحاظ سے اراکین کی تعداد میں صرف ایک اضافہ ہوکر اب ان کی تعداد (۳۷) ہوگئی ہے۔

مرکزی انتظامی کمیٹی کے جلسے زمانہ زیر رپورٹ میں جس کی مدت (۱۴) ماہ ہے حسب ضرورت مرکزی انتظامی کمیٹی کے (۵) جلسے منعقد ہوئے جن میں قبل از وقت ماہانہ جلسوں کا پروگرام مرتب کرنے اور دوسرے معمولی امور کے انتظام کے علاوہ ڈرائنگ کی کمیٹی۔ السنہ علمی کی کمیٹی اور اراکین کے ماہانہ جلسوں میں پابندی سے حاضر رہنے اور بحث مباحثہ میں کافی حصہ لینے کے تدابیر پر غور کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی مقرر کی گئی چنانچہ قواعد انجمن میں جو ضروری ترمیم کمیٹی مذکور نے تجویز کی اور مرکزی انتظامی کمیٹی نے اس کو منظور کیا ہے وہ اس کانفرنس میں پیش ہوگی امید کہ آپ حضرات اس کو منظور فرمائیں گے۔

معمولی ماہانہ جلسے زمانہ زیر رپورٹ میں انجمن کے جملہ مرکزوں میں حسب ذیل گیارہ مضامین پر مباحثے ہوئے (۱) ڈرائنگ سکھانے کے مقاصد اور طریقے (۲) السنہ علمی کی تعلیم کی اہمیت (۳) دستی مشاغل کی اہمیت (۴) ڈرائنگ طلبہ میں مناظر قدرت کی قدر کرنا سکھانے کا ذریعہ (۵) السنہ علمی کی تعلیم کو ہر دلعزیز بنانے کے طریقے (۶) دستی مشاغل کو مدرسہ کے محدود ذرائع کے لحاظ سے کیسے کامیاب بنا سکتے ہیں (۷) ڈرائنگ اور دوسرے مضامین کا باہمی تعلق (۸) تاریخ اور السنہ علمی کا باہمی تعلق (۹) دستی مشاغل سائنس اور ڈرائنگ کا باہمی تعلق (۱۰) اسکول ہائی جین (۱۱) طلبہ میں لیڈرشپ کی تربیت۔

مذکورہ بالا مضامین سے اکثر سب کمیٹی کے ہر مرکز کے مباحثہ کے خلاصہ کو پیش نظر رکھکر ہر سب کمیٹی نے رپورٹ مرتب کی ہے۔

ایک بات قابل اظہار اور لوکل سکریٹری صاحبان کی توجہ کی محتاج میرے خیال میں آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر ماہانہ جلسہ کی کارروائی کا اقتباس اس تاریخ تک معتمد عمومی یا میر مجلس صاحب انجمن کے پاس وصول ہونا ضروری ہے جو پروگرام کے ساتھ مقرر کی جاتی ہے۔

عام جلسے زمانہ زیر رپورٹ میں کوئی عام جلسہ منعقد نہیں ہوا۔

انجمن امداد باہمی دفتر صدر مہتمم تعلیمات مستقر بلدہ کی انجمن امداد باہمی کے اراکین کی تعداد جو رپورٹ گذشتہ میں (۶۶) بیان کی گئی تھی اب (۱۱۰) تک پہنچ گئی ہے۔

دیگر زمانہ زیر رپورٹ میں آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرز اسوسی ایشنز (کان پور) کی سالانہ کانفرنس جو بنگلور میں بزمانہ کرسمس ۱۹۳۱ء منعقد ہوئی اس میں انجمن ہذا کی طرف سے مولوی سالم بن سعید صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ اور مولوی عبدالنور صاحب صدیقی بی۔اے۔بی۔ٹی صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ شاہ گنج شریک ہوئے۔ ہر دو حضرات کے مشاہدات کے نوٹ رسالہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان ہر دو حضرات کے مصارف آمد و رفت انجمن سے ادا ہوئے کیونکہ سرکار عالی سے اس مرتبہ اس غرض سے امداد عطا نہیں ہوئی۔

انجمن ہذا کی لائبریری زمانہ زیر رپورٹ میں انجمن کی لائبریری کے لئے قواعد مرتب کئے گئے اور اب اس میں تقریباً (۲۵۰) کتب موجود ہیں جن کی مکمل فہرست بھی زمانہ زیر رپورٹ میں تیار کی گئی ہے جو زیر طبع ہے اس کی اشاعت کے بعد مدرسین بلدہ کو اس لائبریری سے مستفید ہونے میں بہت سہولت ہوگی۔

زمانہ زیر رپورٹ میں صدر انجمن اساتذہ ممالک محروسہ کے قیام کا مسئلہ گو طے نہیں ہوا مگر اس کے قواعد مرتب ہو کر دفتر صدر مہتمم تعلیمات بلدہ سے صدر میں پہنچ چکے ہیں

مالی حالت گذشتہ رپورٹ میں عرض کیا گیا تھا کہ ختم ۱۳۳۹ف پر خزانہ انجمن میں (مبلغ ۵ روپے ۲/۲) موجود تھے ۱۳۴۰ف میں سالانہ چندہ آل انڈیا فیڈریشن و مصارف نمایندگان آل انڈیا کانفرنس کے علاوہ امداد رسالہ و الونس صادر پر (الـ ۵ روپے ۱۵/۲/۱۲) صرف کرنے کے بعد ختم ۱۳۴۰ف پر خزانہ انجمن میں مبلغ (۵ روپے ۱۲/۱/۱۲۰) موجود تھے خزانچی کے فرائض کی ادائی میں جناب مولوی سید خیرات علی صاحب ابتدائے قیام انجمن سے جو ایثار فرما رہے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔

رسالہ حیدرآباد ٹیچر انجمن کے رسالہ نے اپنی عمر کے ساڑھے چھ سال پورے کر لئے ہیں اور اب بھی اسی آن و بان سے نکل رہا ہے جو ابتدا میں تھی مگر جیسا کہ ہر سال عرض کیا جاتا ہے ابھی تک یہ رسالہ انجمن کی مالی امداد سے مستغنی نہیں ہو سکا۔ اس رسالہ کی ادارت کے اہم فرائض جناب مولوی سید علی اکبر صاحب جناب ریورنڈ فلپ صاحب۔ مولوی سید فخر الحسن صاحب اور مولوی عبدالنور صاحب صدیقی ادا فرما رہے ہیں اور حال میں مولوی عطاء الرحمن صاحب مددگار سٹی کالج اور جناب ڈاکٹر

کرشنیا صاحب نے بھی اس کام میں شرکت فرمائی ہے

حضرات — اب میرے ذمہ ایک نہایت اندوہ ناک واقعہ کا اظہار باقی رہ گیا ہے جس کے بعد میں اپنی اس رپورٹ کو ختم کروں گا اور وہ یہ ہے کہ جس زمانہ کی بابتہ یہ رپورٹ عرض کی گئی ہے اس میں مولوی سید ظہور علی صاحب جیسا قابل فرد جن سے آپ سب واقف ہیں افسوس ہے کہ ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگیا۔ مرحوم کے زور قلم اور موثر و دلچسپ طرز بیان کو آپ گذشتہ کانفرنس میں سن چکے ہیں۔ مرحوم کو انجمن سے جو دلچسپی تھی وہ محتاج بیان نہیں سال گذشتہ کی کانفرنس صاحب موصوف ہی کی دلچسپی کا نتیجہ تھی ان کے علاوہ اور بھی چند حضرات اراکین انجمن نے دائمی مفارقت کا داغ دیا۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور ان کے پسماندگاں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

حضرات — اب میں آخر میں عالیجناب الحاج نواب سر نظامت بہادر کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جناب والا نے باوجود اپنی عدم فرصتی کے اس کانفرنس کی صدارت کو قبول فرما کر ہماری عزت افزائی فرمائی اب میں تہہ دل سے یہ دعا کرتے ہوئے اس رپورٹ کو ختم کرتا ہوں کہ جس طرح انجمن تقریباً سات سال سے اپنے مقاصد کی تکمیل میں منہمک ہے اسی طرح آئندہ بھی مدت دراز تک نونہالان ملک کو ملک و مالک کے سچے خادم بنانے کی کوشش میں کامیاب ہو اور ہمارے آقائے ولی نعمت قدر قدرت حضور پرنور سلطان العلوم .... خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کا سایہ عاطفت ہمارے سر پر تا دیر قایم رہے اور شاہزادگان والاشان و شہزادیان ہمایوں فال حضور کے سایہ عاطفت میں شاد و خوش حال رہیں۔

خطبہ صدارت

ازجناب نواب سر نظامت جنگ بہادر

خواتین و حضرات — اس کانفرنس کی صدارت کی مجھ سے درخواست کرکے آپ نے جو میری عزت افزائی فرمائی ہے اسکی وجہ سے مجھے آپ تک ایک اہم پیام کے ایک ایسے پیام کے پہنچانے کا موقع مل رہا ہے جو گذشتہ چند سال سے برابر میرے دل میں آرہا ہے۔ اس کا تعلق تعلیم کے حقیقی مقصد

اور اساتذہ کے عمل سے ہے۔ مگر مجھے آپ کو متنبہ کرنا ہے کہ اس کو تعلیم و تدریس کے ظاہری کل پرزہ سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ وہ معیاروں اور امتحانوں، نصابوں، نصاب ناموں اور طریقوں سے متزا ہے۔ یہ معاملات ماہرین کے لئے محفوظ ہیں۔ مجھ جیسا نامحرم اسرار تعلیم انسانی واقعات کا ایک خاموش ناظر، دنیا کا ایک حد تک بے تعلق شہری، محض اس سوال سے دلچسپی رکھتا ہے کہ "ہماری تعلیم ہمیں کہاں لے جا رہی ہے" اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جواب اس سوال میں مضمر ہے کہ "وہ ہمیں کہاں لے جا چکی ہے۔

جب میں اس مہذب دنیا کی طرف جیسی کہ وہ آج ہے دیکھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ ہمیں خوش ہونے کی کوئی بڑی وجہ نہیں ہے۔ اپنی ساری ترقی اور خارجی معاملات میں اپنی ساری فتوحات کے باوجود ہماری دلی کیفیت کچھ ایسی ہوگئی ہے جس سے دنیا میں امن ناممکن ہوگیا ہے کیا تعلیم نے ہمیں اس نوبت کو پہونچا دیا ہے؟ یا اس نے ایسے نتیجہ کو روک دیا ہے؟ یہ سوال مجھے ایذا پہنچا رہے ہیں اور مجھے ان کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ میں یہ محسوس کرتا ہوا اندھیرے میں ٹٹول رہا ہوں کہ ہماری تعلیم میں کچھ کمی ضرور ہے اس قوت کی کمی جو انسان کے اندر عمیق گہرائی میں پڑی ہوئی، چھپی ہوئی اخلاقی قوت محرکہ پر اثر ڈال سکے۔ میرے خیال میں تعلیم، شائستگی، تہذیب، اخلاق اور مذہب کی صورت میں ہماری مساعی جمیلہ کا حقیقی، اگرچہ ہمیشہ نہ سہی مسلم مقصد یہ ہے کہ فطرت انسانی کے حیوانی و روحانی جانبوں کے مابین توازن پیدا کر دیا جائے۔ میں اس چیز پر مستحکم اعتقاد رکھتا ہوں مگر بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو افادت کا مذاکرہ کرتے ہیں۔ مجھے شعور اصول افادت سے کوئی مناقشہ نہیں ہے اور اس اصول کی میری توضیح یہ ہے "اس افادت" سے بڑھ کر کوئی اور چیز کارآمد نہیں ہو سکتی جو ہمارے ظاہر کی بہ نسبت باطن کو بہتر بنا سکتی ہے اس واسطے کہ ہمارا باطن جس طرح کا ہوگا اسی کے مطابق ہمارے کام کا نتیجہ رہے گا۔ ہم اپنی دنیا کے بنانے والے ہیں اور احکام الٰہی کے بموجب قرار پایا ہوا ہمارا یہ فریضہ ہے کہ اس کو ایک اچھی دنیا بنائیں۔ کیا آپ نے اس بات پر غور کیا ہے کہ بنی نوع انسان کی اس مجموعی بڑی دنیا کے اندر مگر اس سے بالاتر ہمارے ہی اندر ہم سے بہت قریب ہر شخص کی خفیف سی، ناقابل فنا خودی کی ایک زیادہ اہم دنیا ہے۔ سارے متعلقین کو اس عالم صغیر سے بڑی تکلیف و پریشانی لاحق ہوتی رہتی ہے۔ مگر سچا استاد ہمیں اس قابل بنا دیتا ہے کہ اس دنیا کو اس کے مناسب مقام میں رکھیں۔

اب میں آپ سے منصبی اساتذہ ہونے کی حیثیت سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس پر

غور کریں اور اپنی زندگی کا پورا زمانہ اس بات پر غور کرنے میں صرف کردیں تاکہ آپ آخرکار امتحانوں سے کسی قدر بہتر چیز پر پہونچ جائیں یعنی امتحان ذات، تزکیہ ذات پر، اور اس طرح اس اندرونی قوت کو حاصل کرلیں جس کے بغیر دوسروں کے قلوب پر اثر ڈالنا اور انہیں حرکت میں لانا ناممکن ہے۔

معلم کا واسطہ زندگی کے ایک نہایت اہم فریضے سے ہوتا ہے۔ اس کو دنیا کی تہذیب کو ڈھالنا پڑتا ہے۔ اس کا کام مقدس ہے، وہ فطرت انسانی کا اعلیٰ پروہت ہے۔ کیا وہ اس کو فراموش کرسکتا ہے اور اپنے اعلیٰ مراتب پر فائز رہ سکتا ہے؟ بس اس پر غور کیجیے اور کئے جائیے اور آپ کو روشنی ورہنمائی مل جائے گی۔

سماج میں استاد کا موقف حال حال میں توجہ حاصل کرنے لگا ہے اور میں اس سے خوش ہوں۔ مگر معلم کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قدرت نے اس کو وہ مرتبہ دے رکھا ہے جو سوسائٹی سے اس کو ملنے والے ہر مرتبے سے بالاتر ہے۔ بنی نوع انسان کے سب سے بڑے معلم کون ہوئے ہیں؟ ان عظیم الشان ناموں میں سے چند ایک کا ذرا تصور کیجیے اور اپنے سر خم کر دیجیے۔ کیا وہ دولت مند تھے یا مفلس وغریب؟ کیا آپ ان کے نقش قدم پر چلیں گے یا اجتماعی حرص و آز کو ترجیح دیں گے۔ اب میں جان رہا ہوں کہ آپ کا جواب کیا ہوگا۔ ایسے بعض امور پر جن کا تعلق آپ سے، ہم سے اور سب سے ہے اپنے بعض بھٹکے ہوئے خیالات کا آپ پر اظہار کروں گا۔

ایک مدت مدید سے میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر ہماری تعلیم ہمیں اپنی خواہشات کو پاک کرنے اور ان پر قابو حاصل کرنے کے قابل نہیں بناتی تو وہ اپنے مقصد میں ناکام رہتی ہے۔ ہماری دلیل اور ہماری آرزوؤں میں ایک دوامی محاربہ ہے۔ دماغ کی ایسی مکمل تربیت ہماری تعلیم کا کام ہے کہ وہ ہمیشہ فتح مند رہے مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس کے آگے ایک مسلمہ اخلاقی مقصد ہو نہ کہ کچھ اور۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ تعلیم کے اہم فرائض میں سے ایک ہماری آرزوؤں اور خواہشات کی تربیت ہے

کیا دنیا اب یہ محسوس نہیں کرنے لگی ہے کہ اس کی ہر چیز اس لئے بے ڈھنگی ہے کہ ان میں اپنے اخلاقی توازن کو ٹھیک کرنے کی صلاحیت نہیں ہے؟

انسان اس طرح بنا ہے کہ وہ اس اخلاقی علت و معلول کی غیر مرئی آہنی زنجیر کو توڑا کر نہیں نکل سکتا جو اس کو ایک مرکزی نقطہ سے جو اشیار کی عالمگیر اسکیم کا ایک ضروری حصہ ہے باندھے ہوئے ہے۔ اس بات کو محسوس کرنا اپنے تعلقات کو اپنے ماحول کے ساتھ ہمدردانہ موانست کے

ذریعہ ٹھیک کرنا دانائی ہے۔ استاد کو اپنے شاگرد کو یہ سکھانا ہے کہ ایسا کس طرح کیا جائے۔ اسے اپنے شاگرد کو یہ یقین دلانا ہے کہ دانائی کی حقیقی مشق کے بغیر اس کی محبت کرنی ایسی بے ربطی ہے جیسے کہ مذہب عمل نیک کے بغیر خود فریبی یا ریا ہے۔ محض علم دانائی نہیں ہے۔ انسان کی روح کو ارادے یا مرضی کی پاکی وصفائی کے ذریعہ نشو ونما وسعت اور اضافۂ طاقت کی ضرورت ہے اور صداقت کی راہ میں اس کو اپنی سرگرمی جاری رکھنی ہے۔ معلم کو چاہیئے کہ اپنی زندگی کے ہر لحظہ میں اس بات کو اپنے ذہن میں رکھے اس واسطے کہ اس کو تاریکی کی روشنی کی جانب رہبری کرنی ہے۔ وہ صداقت تک پہونچانے والا رہنا ہے۔ مگر پہلے اس کو اپنا ہی دل صداقت کے لئے کھلا رکھنا چاہیئے اور ہم جانتے ہیں کہ صداقت کئی راہوں سے دل میں داخل ہوسکتی ہے بشرطیکہ دل اس کے استقبال کے لئے مفتوح رکھا جائے۔ غلط ہدایت یافتہ جذبات اور خطا کار وہم وخیال وہاں تک اس کی رسائی روک نہیں سکتے۔

میں خیال کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں کہ تعلیم بعض قدرتی اسقام کو درست کر کے ادراک انسانی کو ایک اعلیٰ سطح تک پہونچا دیتی ہے۔ مگر اب میں اس کی نسبت شبہات میں پڑنے لگا ہوں۔ خواہ فطرت اپنی بدخوئی وضلالت میں بہت زیادہ مضبوط ہو یا ہمارا انتظام تعلیم ناکافی ہو۔ نتیجہ اطمینان بخش ہونے سے بہت دور ہے۔ مدرسہ سے نکلا ہوا اوسط درجہ کا جوان ہمیشہ ایک ایسا نمونہ نہیں ہوتا جس پر فخر کیا جاسکے۔ اس کی مدرسی تعلیم ہمیشہ اس کے بدمیلانات کو روکنے اور اس کی فطرت کے شریف ترمحرکات کو ظاہر کرنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ اس کی اخلاقی نظر نہ تو تیز ہوتی ہے اور نہ لطیف ونازک۔ وہ مدرسے یا کالج سے ایک ایسا دماغ لے کر نکلتا ہے جو متفرق سی الہضم علم کے ٹکڑوں سے بھرا ہوا ہے اور اگر وہ کتابوں کے پڑھنے میں زیادہ ہوشیار رہا ہے تو وہ کسی طرح ڈگری حاصل کر لیتا ہے مگر عام طور پر وہ اپنے باطن میں غیر ترقی یافتہ اور لطیف انسانی فضائل میں ناکمل ہی رہتا ہے۔ اس کے لئے معلم کس حد تک ذمہ وار ہے؟ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ اگرچہ استاد کا تعلق محض الفاظ اور ان اعداد واشکال کے ساتھ ہوتا ہے جو کتابوں میں مرتب کردیے گئے ہیں۔ تاہم اس کا محض یہی فرض نہیں ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو مدرسے کے اوقات میں ان الفاظ واشکال واعداد پر ٹکنیکی طور پر گزار دے۔ اس کا حقیقی کام ایک بلند تر میدان میں ہوتا ہے اور وہ بہت زیادہ غیر محسوس ہے۔ اگر یہ درست ہے کہ تھوڑا سا علم خطرناک چیز ہے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تھوڑی سی تعلیم بھی خطرناک ہوسکتی ہے اس واسطے کہ ممکن ہے کہ اس سے یہ تھوڑا سا علم آئے اور اس کے ساتھ ہی جیسا کہ علی العموم ہوتا ہے بہت سا ادعا پیدا ہو جائے۔ استاد کو یہ دریافت کرنا ہوگا ہے کہ آیا شاگرد کے دماغ میں علم کا حقیقی مادہ

راہ پاگیا ہے اور اگر ایسا ہے تو کتنا عمیق اترا ہے۔ اس نے کیا اثر چھوڑا ہے اور کیا میلانات پیدا کر دئے ہیں۔ اس کو اپنے شاگرد کے ذہنی اور اخلاقی صفات کا جائزہ لینا پڑتا ہے اور وہ سب کچھ کرنا ہوتا ہے جو شخصی اثر کے ذریعہ شاگرد کے کردار کو ڈھال سکتا ہے۔ میرا دل اس قدیم ....
وضع کے اتحاد پر بڑے اشتیاق سے لگا ہوا ہے جس کی انگریزی زبان کی ناواقفیت کا بہت زیادہ معاوضہ اس کے دل کی صفات سے ہو جایا کرتا تھا، جس کا لائق احترام ظاہر خوف و احترام پیدا کرتا تھا اور جس کے بہروپ میں ایک محبت کرنے والا خالص خیر سگالی و ہمدردی سے بھرا ہوا دل چھپا رہتا تھا۔ اس کے دل سے کوئی چیت پاک کن قوت کا دھارا بہہ کر نکلتا اور ان شاگردوں کے دلوں میں داخل ہو جاتا تھا جو اس کے پیرو ہوتے تھے۔ یہ کوئی ایسی چیز تھی جس کا تعلق کتابوں سے نہ ہوتا مگر جو شدت کے ساتھ شخصی اور خیر سگالانہ ہوتی۔ یہ ایک روحانی موج تھی جس کے ذریعہ سے علم پہونچایا جاتا تھا اور وہ شاگرد کے دماغ میں پہونچتے ہوئے، ایسی ساری کثافتوں سے پاک ہو جاتا تھا۔ وہ ایک "روحانی قوت" ہوتی تھی جس کا استعمال موثر طور پر کیا جاتا تھا۔ اور اگر آپ بھی اس کی کاشت اپنے اندر کریں گے تو اچھا ہوگا۔

شرارت آمیز اور خودغرضانہ خیالات و محرکات کو کس طرح ہمارے لڑکوں کے دماغوں سے باہر رکھیں، یہ اس اضطرابی دور میں زیادہ سے زیادہ شدید مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔ مگر ہم سب جانتے ہیں کہ وہ لڑکا جس نے اچھے لوگوں میں پرورش پائی ہو اس لڑکے کی بہ نسبت جس کی ابتدائی زندگی قابل اعتراض صحبتوں میں گذری ہو ایسے میلانات پر آسانی سے غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ اوائل عمر ہی میں مناسب رہنمائی ملی ہو تو ان کے دل پر اس کا دیرپا نقش بیٹھتا ہے۔ لہذا آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ یہیں سے ایک استاد کا حقیقی کام شروع ہوتا ہے۔ جو شخص محض کتابی تعلیم تک محدود ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ادنیٰ ہونے کا اعتراف کرتا ہے وہ محض روزمرہ کا کسل آور کام کر سکتا ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ مگر وہ استاد جو اعلیٰ اور نازک ذمہ داری کو سمجھتا اور اس کی قدر جانتا ہے اور جو کافی احساس ضمیر رکھتا ہے اس سے ہرگز مطمئن نہیں ہو سکتا اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنے شاگردوں کے اخلاقی شعور کو حساسیت کے بلند تر درجہ تک پاک اور مرتفع کرے اور یہ وہ اس کے کانوں کو نطق کی کثرت سے بہرا بنا کر نہیں بلکہ حسن تدبیر کے ساتھ ایسے ایماؤں اور اشاروں کے ذریعہ کرتا ہے کہ شاگرد ایک اخلاقی وجود کی حیثیت سے اپنی اہمیت کو سمجھ لے اور اپنے اور اوروں کے اندر اسے میں اونچا دکھائی دے۔ مجھے یقین ہے کہ اخلاقی اصول سنانے اور دہرانے کی بہ نسبت ایما کے ذریعہ

بہت سا ایسا کام ہو سکتا ہے جو کسی لڑکے کی مناسب خود قدرتی وجس فضیلت کو بیدار کرنے کا اثر رکھتا ہو۔

یہاں مجھے آپ حضرات سے یہ کہنا چاہیئے کہ ایک مشہور شاگرد نے اپنے آپ پر اپنے استاد کے اثرات کی نسبت کیا لکھا ہے۔

"رسٹی کسی سے میں نے یہ اثر حاصل کیا کہ میرے کردار کو اصلاح و انضباط کی حاجت ہے اور یہ لکھا کہ بیراہ ہو کر سوفسطائی مجادلے کی طرف رہنمائی حاصل کروں نہ وہمی معاملات پر سکون نہ خفیف پند آمیز خطبے دوں، نہ اپنے آپ کو ایک ایسا آدمی ظاہر کروں جو بہت زیادہ انضباط پر عمل پیرا ہے، یا نیکی دکھا دینے کی غرض سے کرتا ہے اور بیان و بلاغت و شاعری اور تحریر لطیفہ سے مجتنب رہوں اور گھر میں اپنے لباس بیرون خانہ میں پہروں اور نہ اسی قبیل کے اور کام کروں اور اپنے خطوط ایسی سادگی سے لکھوں جیسے کہ وہ خط جس کو رسٹی کسی نے سوا سا سے میری ماں کے نام لکھا تھا اور ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے مجھ کو الفاظ سے تکلیف پہنچائی ہے، یا میرے ساتھ برائی کی ہے آسانی کے ساتھ آشتی و مصالحت برتوں اور توجہ کے ساتھ پڑھوں اور کسی کتاب کے سطحی افہام سے مطمئن نہ ہو جاؤں، نہ ان لوگوں کے آگے جلد رضامندی ظاہر کر دوں جو بہت باتونی ہوتے ہیں، اور میں ان کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھ کو ایک ٹیٹس کے رسائل سے جن کو انہوں نے اپنے ہی مجموعے سے نکال کر دیا تھا، مجھے روشناس کرایا۔

"اپولونیس سے میں نے مختار کی آزادی اور نہ بھٹکنے والی التوائے مقصد سیکھی اور ایک لمحہ کے لئے بھی سوائے دلیل کے کسی اور کی طرف نہ دیکھنا اور سخت درد دکھ میں، بچے کی اہلیت کے موقع پر اور طویل علالت میں ہمیشہ ایک ہی حال پر رہنا سیکھا، اور زندہ نظیر میں یہ دیکھنا کہ ایک ہی شخص بے حد ارادے کا پکا اور بات مان لینے والا ہو سکتا ہے اور اپنی ہدایت دیتے ہوئے چڑچڑا نہیں ہوتا، اور اپنی آنکھوں سے میں ایک ایسا شخص دیکھ چکا ہوں جو فلسفیانہ اصول کی توضیح و تشریح میں اپنے تجربے اور مہارت کو اپنی خوبیوں میں کمترین جانتا تھا اور اس سے میں نے سیکھا کہ کس طرح اپنے احباب سے وہ حاصل کروں جو عنایات سترگ کہلاتے ہیں بغیر اس کے کہ ان سے ذلت محسوس کروں یا بلاوجہ انہیں گذر جانے دوں۔

"سکسٹس سے ایک خیر اندیشانہ طبیعت، اور ایک ایسے خاندان کی نظیر جو پدرانہ طور پر چل رہا ہے اور فطرت کی مطابقت میں زندگی بسر کرنے کا خیال، اور بے تصنع متانت اور احباب

کے مفاد کا حزم و احتیاط کے ساتھ خیال رکھنا، جہلا اور ان لوگوں کی باتوں کا تحمل جو بے سوچے سمجھے رائے قایم کر لیتے ہیں اس میں یہ قوت تھی کہ سب سے اپنے آپ کو موافق کر لیتا تھا حتیٰ کہ اس سے بات چیت کسی خوشامد سے زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی تھی اور اس کے ساتھ وہ لوگ اس کی بے حد عزت کرتے تھے جو اس سے ملتے تھے اور اس میں زندگی کے لئے ضروری اصول کی فہمیانہ اور باقاعدہ طور پر دریافت و ترتیب دونوں کی صلاحیت تھی، اور اس نے غصے یا کسی اور جذبے کا کبھی اظہار نہیں کیا اور بہت محبت کرنے والا تھا، اور وہ بغیر کسی پر شور نمایش کے اظہار پسندیدگی کر سکتا تھا اور اس کا علم بہت بڑا تھا جس کو وہ ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔

"الگزنڈر قواعدی سے خطا جوئی سے اجتناب، اور ان لوگوں کو غیر ملامت آمیز انداز میں سرزنش جو کوئی گنواروں کا سا یا بے محاورہ یا اجنبی معلوم ہونے والا جملہ بولیں، بلکہ ہوشیاری کے ساتھ وہی جملہ جس کا استعمال ہونا چاہیئے تھا بطور جواب یا تصدیق کرتے ہوئے یا اس شئے کی نسبت دریافت میں شریک حال ہوتے ہوئے نہ کہ اسی لفظ کی نسبت، لے آنا یا کسی اور مناسب ایما، کے توسط سے۔

"فرانٹو سے میں نے یہ دیکھنا سیکھا کہ کسی ظالم بادشاہ میں حسد دو رنگی اور ریا کیا چیزیں ہیں اور یہ کہ علی العموم ہم میں سے وہ لوگ جو امرادیا پاٹرلیشنز کہلاتے ہیں پدرانہ محبت میں کچھ کمی ہی رکھتے ہیں۔

یہ شاگرد مارکس آرلیس تھا اور جو کچھ اس نے اپنے اساتذہ سے حاصل کیا تھا وہ قواعد اور معانی و بیان و بلاغت سے کچھ زیادہ تھا، وہ علی اخلاقیات کی حقیقی روح تھی۔

جب میں آپ سے یہ کہوں کہ استاد کو نہ صرف کامیاب طلبہ پیدا کرنا ہے بلکہ نیک لوگ تو شاید آپ مجھ سے دریافت کریں کہ آیا اس مقصد کا حصول ممکن بھی ہے۔ ہاں صداقت اور اخلاص کے ذریعہ ان کی اتباع کیجئے اور آپ غلطی سے بچ جائیں گے۔

تجربے نے بار بار یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ اور اک انسانی کی فطری تحدیدیں اس کی خود فریبی و شعور قابلیت و تمیز کے ساتھ ملکر اکثر اس کو غلط راہ پر چلانے کا سبب بن جاتی ہیں وہ اکثر غلط نتائج پر پہنچتا اور انہی کو صداقتیں یقین کر لیتا ہے اور وہ اکثر غلطی یا تعصب سے قبل از قبل رائے قایم کر لیتا ہے، جو چیز ثابت شدنی ہے، اکثر وہ اس کو ثابت شدہ سمجھ لیتا ہے اور صرف وہی ثابت کرتا ہے جس کا اس نے قبل ہی فیصلہ کر لیا ہے فرقہ واری تعصب کی تنگ نظری سے ہٹ کر جس کے

بعض دل بری طرح عادی ہو رہے ہیں اور اس خاص قسم کی کوتاہ دلی سے علیحدہ ہو کر جو نسلی یا قومی خود داری کا نتیجہ ہے ایک ایسی جانبداری بھی ہے جو اس خیال و احساس کی نظری قدامتوں سے پیدا ہوتی ہے یہ سب باہم ملکر کسی قدر غیر مفید ذہنی فضا پیدا کر دیتے ہیں اور ہمارے ذہنی اعمال پر چپکے ہی چپکے عمل کرتے ہوئے ہماری رائے اور ہمارے اعتقادات کو متاثر کر دیتے ہیں تنگی، غیر جانبدار دل بھی ایسے اثرات سے آسانی سے نہیں بچ سکتے لہذا یہ چیز سب سے زیادہ اہم ہے کہ ہم صداقت کی تحقیقات کے لئے ایسا دل لئے ہوئے بڑھیں جو ایک معرّا صفحہ کے مانند ہو اور ہم اس پر سب سے پہلے صرف ایسے واقعات تحریر کریں جو شک و شبہ کی گنجایش نہ رکھتے ہوں، ایسے واقعات جو فی الحقیقت زمانۂ ماضی میں واقع ہو چکے ہیں یا جو اب دنیا میں پیش آ رہے ہیں یا جنہیں ہم اپنے حواس کے ذریعہ فطرت میں دوامًا موجود پاتے ہیں یہاں تک تو کام مقابلتاً آسان ہے لیکن جب ہم ان کی نوعیت اور ان کی معنی خیزی کو سمجھنے ان کی قدر و قیمت جاننے اور ان کے باہمی تعلقات کی قدر پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں تب ہی کام زیادہ دشوار اور زیادہ پریشان کن ثابت ہوتا ہے۔ اس منزل میں یہ ضروری ہے کہ سطحی رائے سے اجتناب کریں اور دل کے پورے خلوص کے ساتھ تہ تک اتر جائیں تاکہ صداقت تک پہنچ سکیں صداقت اور خلوص باہم پیوستہ ہیں اور ان کی پیوستگی ناقابل انفکاک ہے۔ ان خصائص کے بغیر کوئی عظیم الشان کام نہیں ہو سکتا اور کوئی عظیم الشان کام دنیا میں کبھی ان کے بغیر ہوا بھی نہیں خواہ کوئی پیغمبر دنیا میں کوئی نیا مذہب لایا ہو یا کسی فلسفی نے دنیا کو فلسفے کا کوئی جدید طریقہ دیا ہو یا کسی فاتح عالم نے اپنے ممالک محروسہ میں کسی جدید بر اعظم کا اضافہ کیا ہو اس نے ضرور خلوص قلب کے ساتھ کام کیا اور کامیابی حاصل کی ہے۔ استادوں اور شاگردوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے اور کسی جلیل القدر انسان کی تصنیف کو سمجھنے اور اس کی قدر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ روح کے اس شوق و اخلاص کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دیں جن کے بغیر اس کی ساری مساعی بے سود رہتیں۔

سب کو میری یہ نصیحت ہے۔ رجال جلیل و نیک کی زندگیوں کا مطالعہ کیجئے اور جب کبھی آپ کسی ایسے شخص کی تصنیف اس کو سمجھنے کی غرض سے اٹھائیں تو اس کا اندازہ لگانے میں روح کے اتنے زیادہ اخلاص پر قابو حاصل کر لیجئے جتنے پر آپ کر سکتے ہیں اور اپنے دل کو احترام سے بھر لیجئے یہ وہ احساس ہے جس کے بغیر انسان کی فہم حیوانی فطرت کے سطح سے بلند نہیں ہو سکتی۔

میرے لیئے یہ ایک دل خوش کن خیال ہے کہ انجمن اساتذہ نے پہلے سے کچھ اچھا کام

کیا ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ وہ بہت سا مفید کام انجام دینے کے لئے باقی رہے گی اور ہر وہ اوستاد جو اس میں شریک ہوگا اپنی روح کا کچھ حصہ اس میں بھرے گا۔ ترجیحاً اس کا بہترین حصہ۔ یہ میری نصیحت ہے، اس واسطے کہ مجھے یقین ہے کہ ادارے انسان کو اس کے نصف کے برابر بھی اچھا نہیں بنا سکتے جتنا کہ انسان اداروں کو بناتے رہتے ہیں۔ ان دنوں ہیں جب کہ انسانی ذہن کا عام میلان اس کی ضد کو سچ باور کرنے کی جانب ہے، اکثر مجھ کو اس کی یاد آتی رہتی ہے۔ ادارہ سازی انسان کی عمرانی یا اجتماعی عادات کے نتائج میں سے ایک ہے اور اس کی جدید تحریکوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی قوت وتاثیر پر ایمان بڑھ گیا ہے۔ ادارے اپنی نوبت پر اجتماعی تحریکات کو آگے بڑھاتے رہتے ہیں۔ اور یہی ان کی سب سے بڑی افادت ہے۔ وہ انسان کی تحریکات کو یکساں اور جدید بنانے میں مدد دیتے رہتے ہیں، اور اس طرح ہمنوائی اور تعلقات کی مناسب درستی کا ظہور ہونے لگتا ہے مگر ان کی رہنمائی کے لئے مضبوط صحیح الارادہ ارواح کی ضرورت رہتی ہے پس اس انجمن میں اتحاد کا سب سے پہلا کام اس روح کے ایک حصہ کی ایسے طور پر فراہمی ہے کہ اس کا حصہ خواہ کتنا ہی قلیل ہو اس کے کام کے لئے کل کو زیادہ توانا بنا دے جس کو میں ایک برتر نمونے کے انسان کی آفرینش خیال کرتا ہوں۔ اس وقت تک اس انجمن نے جو کامیابی حاصل کی ہے اس کی نسبت میں تمام متعلقہ اشخاص کو مبارکباد دیتا ہوں اور اس ساری کامیابی کا آرزومند ہوں جس کی یہ تحریک سزاوار ہے

چند سال کی مدت میں ممکن ہے کہ یہ اپنے کام کے برتر اور زیادہ روحانی نتائج ظاہر کرنے کے قابل ہو مگر ان میں اشیائے نمائش کی صورت میں نہیں جنھیں ہم آج دیکھ چکے ہیں بلکہ ان کے شاگردوں کے اس شریف کردار کی شکل میں جس کے ساتھ ذہنی کارنامے بھی متحد ہوں گے اس طرح مجھے امید ہے وہ حقیقی خیر سگال بن سکتے اور ثابت کر سکتے ہیں کہ اتحاد پس منظر ہی بنی نوع انسان کا حقیقی قائم ہے۔

مرتبہ و مصححہ جناب مولوی ابوالحسن صاحب بی۔ اے۔ ایل ٹی پرنسپل مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم بلدہ

محترم صدر، معزز خواتین و حاضرین جلسہ

اظہار تشکر مجلس ذیلی تعلیم ڈرائینگ کی رپورٹ و روئداد گوش گزار کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اس کانفرنس کے روح رواں اور اس کے ہر شعبہ میں عمل اور شوق کا جذبہ پیدا کرنے والے جناب مولوی سید علی اکبر صاحب کا دلی شکریہ خاص طور پر ادا کیا جائے کہ انجمن و کانفرنس ہذا کے بانی مبانی بلکہ اس کے ناخدا بھی ہیں۔ چنانچہ ذیلی مجلس ہذا کی تشکیل مضامین کا انتخاب اور ان کی مناسب حال تقسیم ضروریات مدارس کا احساس، عہدہ داران و ارکان مجلس کا انتخاب اور طریقہ کار وغیرہ سب کچھ ان ہی کی مساعی جمیلہ۔ حسن تدبیر۔ دیرینہ و وسیع تجربہ۔ علمی شوق۔ جدید الجدید معلومات فراست و مشورت کا حقیقتاً رہین منت ہے۔

تشکیل کمیٹی ہذا گزشتہ کانفرنس انجمن اساتذہ بلدہ منعقدہ ۲۶ و ۲۷ امرداد ۱۳۴۰ف میں آئندہ کانفرنس کے موقع پر رپورٹیں پیش کرنے کے لئے منتخب شدہ مضمون "ڈرائینگ" کا اعلان کیا گیا تھا۔ چنانچہ منجملہ (۱۴) مراکز کے اکثر شاخہائے انجمن ہذا موقوعہ بلدہ نے بدفعات دوران سال میں جلسے منعقد کر کے جو تقریریں تعلیم "ڈرائینگ" کی نسبت کی تھیں اور جن امور پر مختلف خیالات کا بہ اتفاق رائے اظہار کیا تھا ان کی نقول روئداد معتمد عمومی کانفرنس ہذا کے پاس وصول ہوئی تھیں۔ ان رپورٹوں پر غور کر کے ان کی مدد سے ایک اقتباسی رپورٹ تعلیم "ڈرائینگ" کے اغراض و مقاصد، اس کے حالیہ نصاب طریقہ تعلیم۔ دوسرے مضامین نصابی سے اس کے تعلق ضروریات مدارس کے متعلق تیار و پیش کرنے کے لئے صدر مجلس انتظامی کانفرنس ہذا نے اپنے اجلاس منعقدہ ۱۵ اسفندیار ۱۳۴۱ف میں ایک سب کمیٹی کا انتخاب کیا تھا جس کے ارکان حسب ذیل مقرر کئے

گئے تھے۔

(۱) مولوی شیخ ابوالحسن صاحب بی۔اے۔ بی۔ٹی پرنسپل مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم بلدہ میر مجلس کمیٹی۔

(۲) مولوی غیاث الدین صاحب ڈرائینگ ماسٹر مدرسہ فوقانیہ نامپلی معتمد۔

(۳) مولوی سید نثار علی صاحب ڈرائینگ ماسٹر مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم بلدہ رکن۔

(۴) مسٹر گنگا دھر پھاٹک ڈرائینگ ماسٹر دارالشفا رکن۔

(۵) مولوی سید زین العابدین صاحب ڈرائینگ ماسٹر مدرسہ وسطانیہ کاچی گوڑہ رکن۔

محولہ روئدادہائے وصول شدہ پر مکرر غور کرنے کے بعد اس سب کمیٹی نے جو اقتباسی رپورٹ پیش کی ہے وہ اس جلسہ میں پیش کی جا رہی ہے لیکن اس اصل رپورٹ کے پیش کرنے کے قبل مختصراً موجودہ تعلیم ڈرائینگ کی کیفیت اس کے نتائج اور ملکی ماحول کا ذکر و اعادہ ضروری ہے تاکہ رپورٹ ہذا کی ضرورت و اہمیت کما حقہ واضح ہو سکے۔

انگلستان، فرانس، امریکہ، جرمنی اور جاپان کے ماہرین اصول تعلیم اور اصول کنڈرگارٹن کے موجد مسٹر فروبل وغیرہ نے ابتدائی تعلیم کی بنسبت جو تحقیقات کی اور جو ہدایات دی ہیں وہ ہمارے بھی پیش نظر ہیں ان کی تحقیقات میں یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ بچوں کی ذات میں نقالی کا جذبہ قدرةً ودیعت کیا گیا ہے اور خوشنما و خوش رنگ پھول پتوں کے کھلونوں اور جانوروں یا ان کی تصویروں سے بچوں کو فطرتی لگاؤ ہوتا ہے اس لئے بچوں کی مشاہدوں میں ایسی ہی چیزیں پیش کی جائیں جو مقتضائے فطرت ہوں اور جن کی نقالی بچوں کو قابل قدر انسان بنا سکے۔ ابتدائی مشاہدات ہی کو حقیقی تربیت اطفال کہا جا سکتا ہے کیونکہ بچے انھیں جذبات کے تحت اپنے ماحول سے متاثر ہوا کرتے ہیں۔ پس بچوں کی فطرتی دلچسپیوں کا لحاظ ابتدائی تعلیم میں شعبہ ڈرائینگ کے سوا کسی اور شعبہ میں کافی طور پر رکھا نہیں جا سکتا۔ اس لحاظ سے "تعلیم ڈرائنگ" کو بالکلیہ بچوں کی فطرت کے مطابق کہا جا سکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی یافتہ ممالک میں ابتدائی تعلیم کے لئے اصول کنڈرگارٹن اور ڈرائینگ کو نہایت اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں اس مثال سے بھی ملتا ہے کہ ہر ملک کی صحافت کے خواہ ادبی ہو یا اقتصادی تجارتی ہو یا صنعتی ہو ہر شعبہ میں نفس مضمون کو ڈرائینگ اور مصوری سے بطور خاص نمایاں کیا جاتا ہے اور یہی ان کی کامیابی کا بڑا راز ہے اس طریق تعلیم کو اس وجہ سے بھی اہمیت دیجاتی ہے کہ بچوں کو ڈرائینگ سے فطرتی لگاؤ ہوتا ہے۔

اور بچے ڈرائینگ سیکھنے میں خاص دلچسپی سے کام لیتے ہیں اگر اس فطرتی جذبہ کے مدنظر بچوں کو ابتدار
میں ہی تعلیم ڈرائینگ دی جائے تو امید ہے کہ بہت جلد ان میں اپنے ماحول سے استفادہ کرنے
کی صلاحیت پیدا ہوجائے گی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ آئندہ جس شعبہ علوم وفنون میں حصہ لیں گے
اسکے متعلقات سے بآسانی بہرہ ور ہوسکیں گے اور نونہالان ملک اصولی وفطرتی تعلیم سے بہرہ ور ہوناہی ملکی ترقی کا باعث ہے۔

مقاصد و قواعد تعلیم ڈرائینگ

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ بچے زمین کاغذوں یا سلیٹوں پر کسی کے سکھائے بغیر
کوئلے سے بے ڈھنگی لکیریں کھینچتے یا منڈیریں بناتے پھرتے ہیں ان کے
اس فطرتی جذبہ سے اکثر دیواریں سیاہ نظر آتی ہیں ان کا یہ جذبہ ان کو مجبور کرتا ہے کہ کاغذ ہو یا
دیوار من مانی لکیروں سے سیاہ کردیں یا ریت مٹی سے مکانات یا قلعہ وغیرہ کی شکلیں بنائیں یا گھروندے
بنائیں۔ بچوں کے اسی فطرتی جذبہ کے مشاہدہ واحساس نے ماہرین تعلیم کو پروجکٹ متھڈ کے ایجاد
کی جانب مائل کیا۔ پھر وہ آدمیوں اور جانوروں کی غیر موزوں شکلیں بناتے ہیں حالانکہ ان کے
سرپرست اور مہذب انھیں اس کام سے اکثر روکتے ہیں مگر وہ باز نہیں آتے گھنٹوں اس کھیل میں
مصروف رہتے ہیں اور اگر ان کو معمولی رنگ وغیرہ ملجائے تو رنگ آمیزی سے بھی باز نہیں آتے اور
جب ہی بچے تعلیم پاتے ہیں تو اساتذہ کا مشاہدہ ہے کہ بچے ڈرائینگ کے مضمون میں جس قدر دلچسپی
کا اظہار کرتے ہیں کسی اور مضمون میں نہیں کرتے اس سے ظاہر ہے کہ بچوں کو ڈرائینگ سے فطرتی
تعلق ہے ان ہی تجربات اور مشاہدوں کی بناء پر یورپ وامریکہ میں ڈرائینگ کو اساس تعلیم قرار
دیا گیا ہے۔ ڈرائینگ کے ساتھ کھیلونوں اور با اصول کھیلوں کو بھی ذریعہ تعلیم قرار دیا جا کر کنڈرگارٹن
کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اور یہ محض اس لئے کہ بچے ابتدا میں علم وعمل کی حد تک فطرتاً نقال رہتے
ہیں اور تعلیم پانے اور مہارت پیدا کرنے کے بعد بلحاظ تہذیب وتمدن جدت پسند بنجاتے ہیں۔

ف۔ انسانی معلومات کے دو اہم ذرائع ہیں۔ ایک مطالعہ۔ دوسرا مشاہدہ جو بصارت
کے دو شعبے ہیں اور دماغی نشوونما ان کے ہی ذریعہ سے ممکن ہے۔ مطالعہ سے متعلق کتب بینی اور
مشاہدہ سے متعلق مناظر قدرت وجذبات فطرت ہیں اسی طرح اظہار معلومات کے وسائل بھی
دو ہیں۔ ایک تقریر دوسری تحریر۔ تقریر کا تعلق سماعت سے ہے اور تحریر کا بصارت سے۔ ظاہر ہے
کہ اندھا سن سکتا ہے لیکن ماحول سے استفادہ نہیں کرسکتا اس کے بہ نسبت بینا دیکھ سکتا ہے اور
حظ اٹھا سکتا ہے۔ مشاہدہ ہی ترقی کا ایک اہم ذریعہ ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ "شنیدہ کئے بود
مانند دیدہ" لہذا نظر سے تعلق رکھنے والی اشیاء کے اظہار کیفیت کا تعلق ڈرائینگ سے ہے خواہ

وہ ارضی ہو یا سماوی۔ اس لحاظ سے انسانی دماغ کی داخلی پیداوار یعنی معلومات کو علم اور خارجی اثر کو عمل یا ڈرائینگ کہنا درست ہوگا جس کا ایک نمایاں شعبہ تحریر ہے۔ ڈرائینگ بھی ایک خاص قسم کا طرز تحریر ہے جس کو ایک جاہل بھی بخوبی اس کی نزاکتوں اور باریکیوں کے ساتھ نہیں تو بھی کسی قدر تو ضرور پڑھ اور سمجھ سکتا ہے تعلیم ڈرائینگ کا حقیقی مقصد یہی ہے کہ طلبار اپنے ماحول سے بخوبی واقف ہو جائیں اور اس سے استفادہ کرنے کی صلاحیت اپنے میں پیدا کرلیں۔ ڈرائینگ کا تعلق اس میں شک نہیں کہ زیادہ تر آنکھ یعنی بصارت سے ہے لیکن یہ قوت محض دماغی نشو ونما کا ذریعہ ہے پس ڈرائینگ ماسٹر کو یہ امر بخوبی ذہن نشیں کرلینا چاہئیے کہ وہ حقیقت میں بچوں کی دماغی نشو ونما میں حصہ لے رہا ہے جو ایک نہایت اہم چیز ہے۔ ماحول سے کماحقہ استفادہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک قدرت کا مشاہدہ اور جذبات فطرت کا مطالعہ کافی طور پر نہ کیا جائے اور عام نصابی مضامین میں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی البتہ ڈرائینگ ہی ایک ایسا مضمون ہو سکتا ہے جس کے ذریعہ سے بلحاظ جامعیت کائنات کا حقیقی تصور دلایا جا سکتا ہے اور اسی لئے ڈرائینگ ایک ایسا مضمون ہے جس کا تعلق کم وبیش ہر نصابی مضمون سے ہے۔ اجرام فلکی کا نظام۔ اور معدنیات ارضی کا انکشاف اسی سے ہوتا ہے دیگر مضامین کا اثر دل و دماغ پر عارضی ہوتا ہے لیکن ڈرائینگ کا اثر جاذب نظر ہی نہیں بلکہ دل پر ایسا نقش ہو جاتا ہے جو بچوں کے لئے دماغی نشو ونما کے ہر طریقہ میں معاون ہے۔

ف تخیل کو عملی جامعہ پہنانے اور اختراعات میں حسن و موزونیت پیدا کرنے کا احساس اسی مضمون کا اثر ہے۔

ف ڈرائینگ کے ذریعہ طلبار کی ذہنیت اور ان کے رجحان طبعی کا علم ہو سکتا ہے جو ان کی آئندہ زندگی کی تشکیل میں کارآمد ہے۔

ف گونگوں کو بھی ڈرائینگ کے ذریعہ تعلیم دی جا سکتی ہے اور مہذب ممالک میں ان کے خاص مدارس بھی قائم و جاری ہیں۔

ف ڈرائینگ و مصوری کے ہمہ گیر اثرات کے مدنظر یورپ میں ابتدائی تعلیم میں ڈرائینگ ہی کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے تاکہ طلبہ مناظر قدرت اور مشاہدہ فطرت کے شائق ہو کر تحقیق کے عادی ہو جائیں اور اپنے ماحول سے خود مستفید ہو کر ملک اور ابنائے ملک کو مالا مال کر سکیں اور خود بھی اپنی محنت کا ثمرہ پا سکیں۔

ف۔ غرض ڈرائنگ کے مقاصد وسیع ہیں اور تعلیم ڈرائنگ سے مذکورہ فوائد کے علاوہ طلباً کے لیئے مفید ترین فوائد یہ بھی ہیں کہ ڈرائینگ کی تعلیم سے طلبار کی جسمانی تربیت و دماغی پرورش باحسن وجوہ ہوتی ہے۔ قوائے تخیلہ۔ باصرہ۔ حافظہ۔ متصورہ۔ مدرکہ اور غور و امتیاز میں پختگی اور ترقی ہوتی ہے تجسّس اور تحقیق کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ عمل و انہماک کی عادت ہوجاتی ہے محسوسات قوی تر ہوجاتے ہیں۔ جذبۂ تنقید و فیصلہ کی نشوونما ہوتی ہے۔ حسن پسندی اختراع اور جذبات کا احساس پیدا ہوتا ہے یہی وہ اسباب ہیں جو نونہالان ملک کو کاہلی سے باز رکھ کر میدان عمل میں پہنچاتے ہیں اور ترقی کی شاہراہ پر گامزن کرتے ہیں یہی جذبہ ملکی سرسبزی و ترقیات کی روح رواں اور امن و اطمینان کا سرچشمہ کہلاتا ہے۔

ف۔ ڈرائینگ کا ایک اور وصف بھی طلبار کے حق میں نعمت غیر مترقبہ ہے وہ یہ ہے کہ جب ڈرائنگ کا طالب علم بہترین تصویر بنانے میں منہمک رہتا ہے اور اپنی کوشش میں کامیاب ہو کر اپنی بنائی ہوئی تصویر کو اصل سے بالکل مطابق پاتا ہے تو اس کو جو حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے وہ اس حد اور اندازہ سے کہیں سوا ہے جو کسی کروڑپتی انسان کو محض دولت کی ترقی و فراوانی سے حاصل ہوسکتی ہے اس کی بھی مسرت اس کے لئے حوصلہ افزا ثابت ہوتی ہے۔ حقیقی مسرت جیسی بے اختیارانہ طور پر اس فن لطیف کے ذریعہ بارہا حاصل ہوتی ہے کسی اور فن کے ذریعہ نہیں ہوتی۔ ڈرائنگ سے نظر میں مرکزیت اور ہاتھ میں قوت عمل پیدا ہوتی ہے۔ یہی وہ آلہ ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد انسان افلاس و محتاجی کے خار دار درخت کا استعمال کرسکتا ہے اور حقیقی مسرت و شادمانی حاصل کرسکتا ہے۔

طریقۂ تعلیم ڈرائنگ

موجودہ طریقۂ تعلیم اس موقع پر اگر موجودہ طریقۂ تعلیم ڈرائینگ کے نسبت کچھ عرض کیا جائے جو تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہے تو غالباً بیجا نہ ہوگا۔ اس سے کسی پر اعتراض مدنظر نہیں ہے بلکہ مقصد اصلاح کار ہے۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ ڈرائینگ ماسٹر صاحبان معمولی ہدایت کے ساتھ کسی ایک نقشہ یا تصویر یا مطبوعہ ڈرائنگ وغیرہ کو لے کر طلبار کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور ان کو ہدایت دیتے ہیں کہ وہ اس کی نقل یا تصویر اتاریں۔ دوران تعلیم میں ماسٹر صاحب کرسی پر بیٹھے رہتے ہیں یا

اور بعض شوقین لڑکے اپنی کاپیاں ماسٹر صاحب کو بتا کر ضروری اصلاح لیتے رہتے ہیں باقی لڑکے بہت کم دلچسپی لیتے ہیں سادی آڑی ٹیڑھی لکیریں کھینچتے رہتے ہیں یا ڈرائینگ کاپی کے آڑ میں اپنا ہوم ورک یا سبق یاد کرتے رہتے ہیں اسی کا نام فری ہینڈ ڈرائینگ ہے اگر سبق ماڈل ڈرائینگ ہو تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ کمرہ اور آلات و ماڈلس وغیرہ نہایت غیر موزوں و بے ڈھنگے و بیکار ہوتے ہیں۔ طلباء ایک دوسرے کے پیچھے بیٹھے رہتے ہیں صرف سامنے کے چند طلباء ماڈلس کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ حالانکہ جملہ طلباء کی نشست ایسی ہونی چاہیئے کہ ہر طالب علم کو ماڈل کا کوئی نہ کوئی رخ بخوبی نظر آسکے۔ طلباء کو ان ماڈلس کی شکلیں بنانے کی تاکید کی جاتی ہے لیکن اس کے بنانے کو معمولی اصول و قواعد نہیں سمجھائے جاتے جن سے اکثر یہ مدرسین خود ہی لاعلم ہوتے ہیں یا ان کو بھولے ہوئے ہوتے ہیں۔ اصل اصول ماڈل ڈرائینگ کا یہ ہے کہ ایسی شکلیں فطرتی طور پر دنیا کے مناظر قدرت میں پائی جاتی ہیں اور ان سے استفادہ کرنے اور ان کو سمجھنے کی اہلیت ماڈل ڈرائینگ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں جامیٹریکل ماڈل ڈرائینگ کی مدد سے اکثر پیچیدہ عبارتی سوالات ایسے ماڈل کے متعلق حل ہو سکتے ہیں بہت کم مدارس میں فری آرم بلیک بورڈ ڈرائینگ۔ اور کلرنگ۔ برش ورک کی تعلیم دیجاتی ہے اور جہاں ہوتی ہے وہاں بلا سمجھے بوجھے اس کی تعلیم ہوتی ہے جس کی وجہ سے بچے تعلیم ڈرائینگ کو محض تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ ملک سرکار عالی کے اکثر مدارس میں ڈرائینگ محض نقل کے طور پر سکھائی جاتی ہے اس کے حقیقی مقصد و فوائد کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ بچوں کی دماغی نشو ونما۔ قوت مشاہدہ کی ترقی ہر قسم کی خوبصورتی کا احساس اور غور و خوض کی عادت ڈالنے کا بہت کم خیال کیا جاتا ہے اور بچوں کے طبعی رجحان سے انکی آئندہ زندگی یا اس کے فطری لگاؤ کے نسبت کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جاتا۔

بعض مجوزہ طریقہ تعلیم تعلیم ڈرائینگ کو اساسی اور ابتدائی تعلیم کا اہم ذریعہ سمجھا گیا ہے اس اہمیت کے مد نظر معلم ڈرائینگ کو امور ذیل کا ہر وقت لحاظ رکھنا چاہیئے۔

(۱) ڈرائینگ سکھانے کے لئے طلباء کی مناسبت سے مقام تجویز کیا جائے جس میں ہوا اور روشنی کا کافی انتظام رہے چونکہ طلباء دیگر مضامین کی بہ نسبت ڈرائینگ میں زیادہ دیر منہمک رہتے ہیں اور خصوصاً امتحان میں شریک ہونے والے طلباء مدرسہ کے وقت کے بعد بھی اکثر مشق کرتے رہتے ہیں اس لئے مقام نشست مرطوب ہونے اور صاف نہ ہونے سے ان کی صحت پر برا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے جس کا ازالہ لازمی ہے۔

(۲) طلباء کی نشست کا کافی لحاظ رکھنا چاہیئے تاکہ دیر تک پڑھنے سے ان کے کسی حصۂ جسم

پر زیادہ بار نہ پڑے تاکہ دوران خون رک کر خرابی صحت کا باعث نہ ہو۔ ماڈل ڈرائنگ کی تعلیم کے وقت نشست طلبار ایک ایسی نصف دائرہ کی شکل میں ہونی چاہیئے کہ جس سے تمام طلبار ماڈل کے کسی نہ کسی رخ کو بآسانی دیکھ سکیں۔

(۳) ہمہ قسم کے ماڈل اصولی نمونہ جات۔ خاکے۔ نقشے اصلی اشیاء پورے اور ڈرائنگ کا ضروری سامان مہیا رکھنا چاہیئے جن میں سے اکثر اشیاء و نمونہ ڈرائنگ ماسٹر صاحبان خود ذراسی محنت سے تیار کر سکتے ہیں۔

(۴) مقاصد ڈرائنگ کے تحت طلبہ کی تفہیم اور نگہداشت ایسی شفقت و ہمدردی کے ساتھ کی جائے کہ طلبار پر گراں نہ گزرے۔ اور ڈرائنگ سے ان کو دلچسپی پیدا ہو اور ان کا فطری شوق مزید ترقی کرے۔

(۵) طلبار کی غلطیوں کی اصلاح نہایت ہمدردی و احتیاط اور صحت کے ساتھ اس حد تک کی جائے جو ان کی عمر اور مذاق یا جماعت کے مطابق ہو۔

(۶) اشکال کی نقل کے لئے طلبار کو ڈرائنگ کاپی ایسے کاغذ کی دی جائے جس پر سے پنسل کے خطوط بآسانی مٹ سکیں اور کاغذ میں دھبے نہ پڑنے پائیں۔

(۷) پنسل متوسط سرمہ کی ہونا چاہیئے سرمئی حصہ نہ زیادہ سخت نہ زیادہ نرم تاکہ کاغذ پر خط ہلکے کھنچیں اور ربڑ بھی اس قسم کی ہو کہ ذراسی رگڑ سے خطوط مٹ جائیں اور کاغذ گھسنے نہ پائے اور اگر رنگ کیا جائے تو پھیل نہ سکے۔ پنسل کو لب سے مسلسل تر کرنے کی خاص کر ممانعت کی جائے یہ نہایت مذموم و مضر صحت عادت ہے۔

(۸) کل جماعت کے لئے بورڈ پر ایک ہی شکل اکثر نہ بنائی جائے بلکہ مختلف مقامات پر مختلف نمونے رکھے جائیں یا ایک ہی بورڈ پر مختلف شکلیں بنا دی جائیں تاکہ طلبار اپنے اپنے مذاق کے بموجب نقل اتاریں اس طریقہ تعلیم سے یہ فائدہ ہوگا کہ طلبار کو اپنے طبعی رجحان کے مطابق عمل کرنے کا موقع ملے گا اور معلم طلبار کے طبعی میلان سے واقف ہو سکے گا جو تعلیم ڈرائنگ کا حقیقی مقصد ہے طالب علم کا ذوق دریافت ہونے کے بعد اس کے مذاق کا لحاظ رکھا جائے تو یقیناً اس میں اپنے فطرتی جذبات بخوبی ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی یہی عمل درآمد طلبار کو مہارت و تکمیل کا شوق دلاتا ہے ایسی صورت میں طلبار خاطر خواہ دلچسپی لیں گے۔ جس سے عملی جذبہ بھی ترقی پاتا رہے گا۔

(۹) کبھی طلبار کو بلاقید خاکہ و نمونہ اپنے مشاہدے اور شوق کے تحت اشکال بنانے کی

ہدایت کرے اور کبھی غلط شکل بورڈ پر کھینچ کر صحیح شکل آتارنے کی ہدایت دی جائے تاکہ طلبا اپنے معلومات اور مشاہدے کے ذریعہ غلطیوں کی اصلاح بھی کر سکیں اس طریق تعلیم سے طلبا کو حسب خواہش عمل کرنے کی عادت بھی ہوگی اور امتیاز کی صلاحیت بھی پیدا ہوتی جائے گی اس کے علاوہ معلم کو طلبا کی ذہنیت کا بھی علم ہوتا جائے گا۔

(۱۰) طلباء کو وقت کی مناسبت سے اشکال نقل کے لئے دی جائیں تاکہ وقت کے اندر نقل کی جا سکے اور اسی عرصہ میں تفہیم وصحت بھی ممکن ہو۔

(۱۱) طلباء کے مذاق کی مناسبت سے ایسی آسان شکل دی جانی چاہیئے جس کی نقل بآسانی ہو سکے اور تفہیم دلچسپ و موثر الفاظ میں ہو کہ طلباء سمجھ جائیں اور نقل کرنے کا ان کو حوصلہ ہو نقل کا نتیجہ طلباء کے لئے مسرت بخش ہونا چاہیئے اس وجہ سے کہ نقل جس قدر اصل کے مشابہ ہوگی اسی قدر طلبہ کو اپنی کامیابی کا یقین اور مسرت ہوگی ورنہ ڈرائینگ ان کے دماغی بار کو ہلکا کرنے کے بجائے بار گراں ہو جائے گی ایسی صورت میں ان کا شوق بجائے ترقی پانے کے گھٹتا جائے گا۔

(۱۲) طلباء کو جس نمونہ کا مشاہدہ کرایا جائے اس کی مجموعی حالت قد و قامت۔ جسامت کا تناسب۔ رنگ اور اشیاء کا تصور عام فہم الفاظ میں دلانا چاہیئے تاکہ نمونہ کی مختلف اور ضروری کیفیات طلباء کے ذہن نشین ہو جائیں۔

(۱۳) رنگ کے اقسام اور ان کی آمیزش کا اصول برش کی گرفت اور رنگ کا استعمال اصولی طور پر سمجھایا جائے اور ایک بار نمونتاً بتا کر پھر خود انسے بنوایا جائے۔

(۱۴) پنسل کی گرفت ہلکی رکھنے کی نسبت ہدایت کی جانی چاہیئے اور صحیح گرفت کی عادت ہونے تک طلباء کی مسلسل تفہیم کی جایا کرے۔ چھوٹی چھوٹی اور خراب پنسلیں استعمال نہ کرنے کی مسلسل تاکید کی جایا کرے اور اس کی کافی نگرانی رکھیں

(۱۵) نشست میں طلباء کو عادی کرایا جائے کہ وہ ڈرائینگ کے وقت اپنا سینہ اور کندھے میز کے متوازی رکھیں اور میز پر جھک نہ جائیں۔ سیدھے بیٹھا کریں ڈرائینگ بورڈ میں میز کے وسط میں رکھے جائیں۔

(۱۶) ڈرائینگ کرتے کے وقت طلباء کو میز پر کہنی نہ ٹیکنے اور صرف کلائی گھما کر کام کرنے کی ہدایت کی جائے اور حسب عادت ہونے تک نگرانی رکھی جائے ہاتوں کو میز پر پھیلا کر کام کرنا چاہیئے اور ڈرائنگ کرتے وقت پیروں کو سیدھا رکھنا چاہیئے بل دے کر ایک پیر دوسرے پیر پر نہ رکھنا چاہیئے

اور نہ میز یا اسٹول کے پایہ کے گرد لپیٹنا چاہیئے کسی طالب علم کو تختہ سیاہ کے بالکل قریب کھڑے ہونے کی اجازت نہ دینا چاہیئے۔

(۱۷) پنسل یا برش کا طول اس قدر ہو کہ استعمال کے وقت وہ ہتیلی کے اندر نہ رہ جائے یعنی کم ازکم پانچ یا چھ انچ ہو ورنہ بصارت پر مضر اثر پڑنے کا اندیشہ ہے۔

(۱۸) کاپی اور سلیٹ بھی میز کے متوازی رکھی جائے اور ڈرائنگ کرتے وقت کاپی یا سلیٹ کو گھمایا نہ جائے۔

(۱۹) پہلے خاکہ بنانے کا اصول سکھایا جائے اور پھر اس کو مکمل کرنے کا طریقہ تاکہ ڈرائنگ سیکھنا بچوں کو آسان ہو۔ توضیح ایسے الفاظ میں کی جائے جو مختصر آسان اور زود فہم ہوں۔

(۲۰) سیمٹریکل اشکال بنانی ہوں تو پہلے بیچ کی لکیر کھینچیں اور اس کے بعد بائیں جانب سے شکل شروع کی جائے اور جس وضع کا خط اس جانب بنائیں ساتھ ہی سیدھے جانب اس کا جواب بنایا جائے عملی خطوط جو امدادی طور پر کھینچے جائیں گے اور اصلی خطوط جو شکل کو ظاہر کریں گے ہلکے بنائیں جائیں تاکہ مٹنے میں آسانی ہو۔

(۲۱) نیچر ڈرائنگ میں پہلے بڑی ڈنڈی پھر پتوں کے ڈنٹھل اور پھول کا خاکہ بنائیں اس کے بعد احتیاط سے ہر ایک شکل مکمل کرنا چاہیئے اگر رنگ کرنا ہو تو رنگ ملا کر اول علحدہ ایک کاغذ پر اس کا ایک نمونہ دیکھ لیا جائے اس کے بعد اصل ڈرائنگ کی رنگ آمیزی کرنا چاہیئے۔

(۲۲) میوے یا جانوروں کی شکلیں بورڈ پر بنا کر ان کے نام اور دیگر کیفیات طلباء سے دریافت کی جائیں اور مشابہ اشیاء کا تصور دلایا جائے تاکہ وہ دو مشابہ اشیاء کا فرق ذہن نشین کرسکیں۔

(۲۳) جیسے مخروطی گول مستطیل بیضوی مثلث وغیرہ ہندسی اشکال کی تفہیم نمونوں۔ ترکاریوں پھولوں کی مطابقت اور مشاہدے کے ذریعہ کرائی جائے تاکہ طلباء ہندسی اشکال کو خطوط ہی کی حد تک محدود نہ کریں بلکہ ان کی ضرورت و فائدہ بھی سمجھ سکیں۔

(۲۴) مبتدیوں سے اصلی اشیاء کا مشاہدہ کرانے کے بعد مشاہدہ کی ہوئی شکل کی نقل کھینچوائی جائے تاکہ ابتداء ہی سے اصل شئے کے مشاہدہ کا ان کو شوق پیدا ہو جو مشاہدہ قدرت کا ابتدائی زینہ ہے۔

(۲۵) ابتداءً خطوط کی صحت پر زیادہ زور دینا مناسب نہیں کیونکہ مبتدی صحیح خطوط نہیں کھینچ سکتا اس لئے صرف دی ہوئی شکل کی شبیہ نقل میں آنا کافی ہے جب طلباء میں ڈرائنگ کی صلاحیت و ذوق ایک حد تک پیدا ہو جائے تو صلاحیت کے لحاظ سے خطوط کی صحت اور مطابقت کی طرف توجہ کیجائے

اس کے بعد مہارت کے بموجب لائیٹ۔ شیڈ اور رنگ بھرنا سکھایا جائے۔

(۲۶) طلباء کی مہارت اور جماعت کے لحاظ سے مختلف اوزاروں اور آلات کی ڈرائینگ بتائی جا سکتی ہے۔ جو مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہوں یعنی زراعت کے آلات۔ تعمیری آلات۔ طباعت صحافی۔ نجاری وغیرہ فنون کے آلات تاکہ طلباء کو آلات سے واقفیت حاصل ہو۔

(۲۷) پرندوں۔ بری و بحری جانوروں۔ دلچسپ مناظر مشہور مقامات کی رنگین تصویریں نمونے اور مجسمے مہیا کئے جائیں تاکہ بچوں کو وسیع معلومات عامہ حاصل ہوں لیکن ملکی پیداوار اور خصوصیات کا لحاظ رکھا جائے تو نہایت مناسب اور مفید ہوگا۔

(۲۸) اساتذہ صاحبان کو بھی ضروری اسباق کی تشریح بورڈ پر اشکال کے ذریعہ کرنی چاہیئے تاکہ سبق جلد ذہن نشیں ہو جائے۔

(۲۹) ڈرائینگ کے ایسے نمونے جو طلباء کی اصول مہارت کا ثبوت ہوں محفوظ رکھے جائیں تاکہ نمائش گاہ میں پیش کئے جا سکیں۔

ڈرائینگ کا تعلق دیگر مضامین کیساتھ دیگر مضامین کے درس میں ڈرائینگ سے بہت مدد مل سکتی ہے۔ اساتذہ صاحبان کو اس جانب کافی توجہ کرنے کی سخت ضرورت ہے

ڈرائینگ کا تعلق ادب اردو یا دیگر ملکی السنہ عربی۔ فارسی و تلنگی وغیرہ سے اردو ادب کے مقاصد جس طرح الفاظ و عبارت کی صحت اور مافی الضمیر کو خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرنا ہے اسی طرح تحریر میں قوت کا پیدا کرنا بھی اس کے مقاصد میں داخل ہے۔ الفاظ کی نشست اگر مخاطب پر اثر ڈالنے کے لئے ایک ضروری چیز ہے تو تحریر میں کتابت کی خوبصورتی بھی ناظرین کے رجحانات کو جذب کرنے کے لئے لازمی ہے اور یہ صنعت ڈرائینگ کے اصول سے کھلا ہوا تعلق رکھتی ہے۔

اردو ادبیات اکثر و بیشتر محسوسات کے بیانات پر مشتمل ہوتی ہیں شہروں۔ دریاؤں جنگلوں پہاڑوں وغیرہ کے تذکروں سے بحیثیات مختلفہ پُر اور لبریز ہیں اور بعض اوقات اس امر کی ضرورت واقع ہوتی ہے کہ نقشہ کھینچکر اس کا صحیح تصور طلباء کو کرایا جائے جو ڈرائینگ کی واقفیت پر موقوف ہے موصوفہ درسیات ادبیہ میں اکثر مختلف اشیاء کی اشکال بھی دی جاتی ہیں ان کے حسن و قبح پر روشنی ڈالنے کے لئے بھی ڈرائینگ کے اصول سے واقفیت من قبیل واجبات ہے اس سے طلباء میں دلچسپی پیدا ہونے کے علاوہ فہم مطالب میں بھی کافی مدد ملتی ہے۔

ڈرائینگ جو مناظر قدرت کی نقل ہے ان اصل مناظر کی جانب ہماری رہنمائی کرتی ہے جن کا

ذکر اور ادب کی کتابوں میں موجود ہے اور اسی طرح دلوں میں قدرت کی عظمت و شان پیدا کر دیتی ہے قدیم زمانے کی کتب میں بھی اس کا پتہ چلتا ہے کہ ادبی تعلیم کو نقشہ کشی سے کچھ نہ کچھ تعلق رہتا تھا اور قدیم زمانہ کی ادبی کتب بالتصویر ہوتی تھیں جواب زمانہ حال میں معدوم ہیں۔

عربی کی تعلیم میں بھی ڈرائنگ سے مدد لی جا سکتی ہے فن ادب خواہ کسی زبان کا ہو ایک بحر زخار ہے جہاں اس میں تخیلات و جذبات مذکور ہوتے ہیں محسوسات بھی آتے ہیں حیوانات و نباتات جو ملکی خصوصیات رکھتے ہیں ان کا تصور طلبہ کے ذہن میں ڈرائنگ ہی کے ذریعہ سے کرایا جا سکتا ہے۔

فارسی ادب کے قصص و حکایات ذہن نشین کرانے کے لئے برموقع ڈرائینگ سے مدد لی جائے تو واقعات دل نشین ہو جاتے ہیں مثلاً عمر خیام کی بادہ پیمائی اور مئے نوشی کا سامان (جام۔ صراحی۔ ساقی۔ کباب وغیرہ) کسی شاداب سبزہ زار میں ایک دلکش نہر کے کنارے ڈرائنگ ہی کے ذریعہ نمایاں کئے جا سکتے ہیں۔ قدیم فارسی کتب میں اشعار کے ساتھ ڈرائنگ کے ذریعہ اشکال بھی دی ہوئی ہیں مثلاً ۔ "بر مزار ما غریباں نے چراغ و نے گلے۔ نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے" فارسی ادب میں تخیلات درجہ کمال کے ساتھ ظاہر کئے گئے ہیں خصوصاً تغزل کی جان تخیلات ہی ہیں اس کا ثبوت اس طرح ملتا ہے کہ لیلیٰ کی یاد میں مجنوں کی محویت کا اثر چغتائی صاحب کی ڈرائنگ دیکھنے پر موقوف ہے

سائنس۔ چونکہ سائنس اظہار و توضیح کا محتاج ہے اس لئے توضیح و تشریح کے لئے ڈرائنگ بنانا پڑتی ہے۔ ورنہ نفس مضمون مبہم رہ جائے گا۔ مثلاً آکسیجن کی تیاری۔ اگر طالب علم آلہ کی شکل بنا کر ہر جزو کا نام تیروں کے نشانات کیساتھ لکھ دے۔ اور ایک دفعہ عمدگی سے سمجھ جائے تو وہ خود محسوس کرے گا کہ ڈرائنگ کی کس قدر ضرورت ہے۔ اسی نقطۂ نظر کے تحت طبیعات۔ کیمیا وغیرہ مضامین میں بھی مطالب کو پورا پورا ظاہر کرنے، تجربات دکھانے اور آلات کی ترتیب ڈرائنگ کے بغیر ناممکن ہے خوردبین کے ذریعہ جو بھی جدید انکشافات ہوتے ہیں ان کا اظہار ڈرائنگ ہی کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ تحریر سے حقیقی کیفیت کا اظہار جہاں ناممکن ہوتا ہے وہاں ڈرائنگ سے مدد لی جاتی ہے ورنہ مقصد کی کماحقہ تکمیل نہیں ہوتی۔

حفظان صحت۔ اس کو اچھی طرح سے حفظان صحت سے وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ حفظان صحت میں جس وقت جسم انسانی کا ذکر آئے انسانی ڈھانچہ اتروایا جا سکتا ہے یا جب مکانات تالاب وغیرہ کا بیان آئے تو ان کے نقشے کھنچوائے جا سکتے ہیں۔

ریاضی۔ کسی اور مضمون کا تعلق ریاضی سے اتنا زیادہ نہیں ہے جتنا ڈرائنگ کا ہے ریاضی کے تمام شعبوں، مثلاً حساب۔ الجبرا۔ ترسیمات۔ علم ہندسہ مساحت وغیرہ میں ڈرائنگ کی ضرورت پڑتی ہے

علم ہندسہ کے وہ مسائل جو مجسمات کے متعلق ہوتے ہیں اچھی طرح اسی وقت سمجھائے جاسکتے ہیں جب کہ ڈرائنگ سے امداد لی جائے۔ اسی طرح مساحت میں بھی مجسمات کے سوالات کی تفہیم میں ڈرائنگ مدد معاون ہوتی ہے۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ریاضی کے تمام شعبوں کا مقصد ذہنی تصورات کا صحیح اندازہ اور اپنے تصورات کے مختلف جذبات کے تعلقات کی ٹھیک ٹھیک مدلل اور معقول پیمائش ہے یا پھر عام مشاہدات زندگی یا قوانین قدرت پر غور کرنے کے بعد ان کے پوشیدہ اصولوں کو اخذ کرنا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ ریاضی کی تعلیم ادھوری بلکہ ایک حد تک ناممکن ہوجاتی ہے اگر بچہ قوت متصورہ میں کمزور رہو۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے علم الریاضی کی باریکیاں اور دقتوں کو سمجھیں گے۔ تو ہمیں ابتدائی جماعتوں کی تعلیم کا بہت بڑا وقت تعلیم ڈرائنگ ہی میں صرف کرنا چاہیئے۔ خطوط وسطوح وغیرہ کی ابتدائی پیمائش وغیرہ اور مختلف قسم کی چیزوں کی تصویریں کھینچوا کر بچے کی قوت متصورہ کو عملی طور پر ترتیب دیا جائے اور اس کے بعد پھر اس کو ریاضی کے تخیلی میدان میں چھوڑ دیا جائے تو وہ بھٹکا ہوا مارا مارا نہیں پھرے گا۔ بلکہ اس کا ہر قدم ایسے اٹھیگا گویا کہ اس کے سامنے ایک خاص مقصد ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو ایسے عملی عبارتی سوالات جن میں کسی باغ کے اندر درخت اور پھر درختوں کی قطاریں اور پھر قطاریں درختوں کی تعداد وغیرہ یا اس قسم کے اور سوالات کرائے جاتے ہیں جن کا صحیح تصور ایک چھوٹے بچے کے چھوٹے دماغ میں آنا بہت مشکل ہے تاوقتیکہ اس کے دماغ میں تصوری شکلوں اور ذہنی آثار کو قائم کرنے کی صلاحیت ڈرائنگ کے ذریعہ پیدا نہ کردی گئی ہو۔ سکہ جات۔ پیمائش اور وزن وغیرہ کے عبارتی سوالات اگر عملی طور پر کر دیئے جائیں تو اس سے بہت زیادہ مفید نتائج مترتب ہوسکتے ہیں الغرض ریاضی و ڈرائنگ کا فطرتی تعلق ہے اور ان دونوں کے تعلیم کا مقصد بھی ایک حد تک ایک ہی ہے علم المساحت۔ ہندسہ وغیرہ میں تو اس کا استعمال لازمی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ ریاضی کا ایک جزو لاینفک ہے عملی علم ہندسہ خود اصلی تعلیم ڈرائنگ کا ایک اہم جز ہے۔

جغرافیہ۔ تعلیم ڈرائنگ و تعلیم جغرافیہ کے درمیان قریبی تعلق ہے جغرافیائی نقشہ کشی ایک قسم کی فری ہائینڈ ڈرائنگ ہے۔ طبعی جغرافیہ کی تعلیم میں اشکال کے ذریعہ وضاحت کی جاسکتی ہے۔ مثلاً نظام شمسی۔ نظام قمری تبادلہ موسم وغیرہ کا تصور ڈرائنگ کے ذریعہ دلایا جاسکتا ہے سیاسی جغرافیہ میں بغیر نقشہ کے تعلیم محال ہے اس لئے کہ اس کے ذریعہ مقامات حدود طبعی حالات وغیرہ کا صحیح تصور دلایا جاسکتا ہے۔ دنیا کے قدرتی اقطاع اور وہاں کے باشندوں کی بود و باش اور معاشرت کا تصور ڈرائنگ کے ذریعہ دلایا جاسکتا ہے مثلاً۔ ٹنڈرا یا ریگستانی علاقہ کے باشندوں کا تمدن۔

طلباء کو طبعی حالات ملک اور زمین کی نوعیت کے متعلق معلومات بہم پہونچانے کے بعد ماڈل رلیف میاپ کے ذریعہ اس کی وضاحت کی جا سکتی ہے اور طلباء سے اسی نوعیت کے نقشے مختلف رنگوں سے اور کھنچوائے جا سکتے ہیں جغرافیہ کی تعلیم ایک زمانہ میں نہایت مشکل ۔ دقیق اور خشک سمجھی جاتی تھی لیکن اب ڈرائنگ کے نقشہ کشی کی مدد سے نہایت آسان، دلچسپ وباعث فرحت و دلبستگی اور موجب وسعت معلومات بن گئی ہے ۔

تاریخ ۔ تعلیم تاریخ کا تعلق ڈرائنگ کی تعلیم کے ساتھ نہایت قریبی ہے تعلیم تاریخ سے اسی وقت کامل استفادہ کیا جا سکتا ہے جب کہ ڈرائنگ کی اعانت حاصل کی جائے اس کے حسب ذیل طریقے ہیں ۔

(۱) نقشہ کشی ۔ حدود سلطنت اہم تاریخی مقامات کو نقشہ کشی کے ذریعہ واضح کیا جا سکتا ہے ۔ فاصلہ اور اسمات کا تصور اور بادشاہوں کے حدود سلطنت کا مقابلہ صرف نقشہ سے واضح ہو سکتا ہے محض بیان سے تفہیم نہیں ہو سکتی اسی طرح بادشاہ کے فتوحات کا تسلسل یا لڑائی کا نقشہ واضح کیا جا سکتا ہے ۔

(۲) ۔ تاریخ کے اسباق کو دلچسپ بنانے کے لئے سکون مساجد اور قدیم عمارات وغیرہ کے کتبات بتلائے جا سکتے ہیں سکون کا فراہم کرنا یا ان کی تصاویر جمع کرنا بالخصوص دور ہنود کے نہایت مشکل ہے اس لئے یہ ہو سکے تو سکون اور کتبات کو کاغذ پر منقوش کرنا چاہیئے اور اس کی مطبوعہ نقلیں طلبا ر کو بتلائی جائیں تو بے حد سہولت ہو سکتی ہے ۔ عربی جاننے والے طلبار کے لئے کتبات کی نقل دلچسپ ثابت ہوئی ہے ۔

(۳) تعلیم تاریخ کے وقت چھوٹی جماعتوں میں ڈرائنگ کے لئے متعدد مواقع ہیں مثلاً اگر کسی جنگ کا ذکر ہو تو اوزار اور آلات جو اس عہد میں استعمال کئے جاتے ہیں تختہ سیاہ پر بتلائے جا سکتے ہیں یا ان کے کاغذ کے نمونہ بنا کر طلبہ کو دئیے جا سکتے ہیں ڈرائینگ کا علم ایسی صورتوں میں بھی مفید ہوگا اسی طرح قدیم عمارات اور بادشاہوں کو بھی کہیں کہیں نقشہ کے ذریعہ دکھلایا جا سکتا ہے یا کسی عہد میں عوام کی معاشرت اور طرز زندگی کے نقشہ کے ذریعہ مفید نکات پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے ۔

(۴) تاریخی ٹائیم چارٹس کے ذریعہ وقت کے مفہوم کو نہایت خوبی سے واضح کیا جا سکتا ہے عہد ہنود کی تاریک و نامعلوم تاریخ سے عہد برطانیہ تک جہاں واقعات کا ہجوم ہے چارٹس نہایت مفید ہو سکتے ہیں ۔ عہد لامرکزیت کی تاریخ اور ایسے تاریخی واقعات جن کا تعلق دوسرے ممالک سے ہو تاریخی چارٹس کے ذریعہ واضح کئے جا سکتے ہیں ۔

ڈرائنگ کا تعلق انگریزی ادب سے انگریزی کی تعلیم میں ڈرائنگ کی ضرورت یہ ہے کہ سب سے پہلے تعلیم حروف نویسی میں دینی پڑتی ہے انگریزی حروف کا صاف و

صحیح بنانا ایک نہایت ضروری بات ہے خط برا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ لوگ اس طرف کم توجہ کرتے ہیں اچھے خیالات کے لئے اچھے الفاظ کا ہونا ضروری ہے اسی طرح اس کی ظاہری شکل یعنی تحریر بھی عمدہ ہونا ضروری ہے۔ ڈرائنگ کے مدرس کو خوش خط انگریزی حروف کے سکھانے کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ جس کو لیٹر رائٹنگ ولیٹر پنٹنگ سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔

انگریزی مضمون نویسی

لڑکوں میں اشیاء کا تصور آنکھ کی بدولت ڈرائنگ ہی کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے نیز مشاہدہ۔ حافظہ اور قوت استدلال کی بھی ترقی ہوتی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ڈرائنگ کی بدولت نہ صرف مضمون کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ انگریزی قصے۔ نظم اور پراگراف کے سمجھنے اور یاد کرنے میں بہت سہولت ہوتی ہے مدرس کے لئے اس کی ضرورت نہ صرف چھوٹی جماعتوں میں ہی ہوتی ہے بلکہ بڑی جماعتوں میں بھی اس کی ضرورت ہے تاکہ لڑکوں کا تصور درست ہو جائے اور دیکھی ہوئی چیزوں کو بیان کرنے کی قوت پیدا ہو سکے۔ تصور خیالات و واقعات کو الفاظ میں ادا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے وہ مدرس جو (Direct Method) کے ذریعہ تعلیم دیتا ہو اس کے لئے ایسی توضیحی تصویروں کا ہونا ضروری ہے کیونکہ یہ الفاظ کے اظہار کا مادی ذریعہ ہیں انگریزی قصہ گوئی اور مضمون نگاری میں جو ایک بہت ہی مشکل مضمون خیال کیا جاتا ہے اچھی تصویر یا تصاویر کے ذریعہ ادبی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ لڑکوں کو تصویر دیکھ کر ان چیزوں کا حال بیان کرنا پڑتا ہے جو اس میں دکھائی گئی ہیں اس طریقہ تعلیم سے اظہار و قوت بیانیہ کو ترقی ہوتی ہے بہ نسبت قدیم طریقہ کے جو صرف سبق کا خاکہ الفاظ میں پیش کرتا تھا جدید طریقہ اس سے کہیں بہتر ہے۔

انگریزی مضمون نگاری کے لئے پکچر کارڈس اور کتابوں سے مدد لی جا سکتی ہے صرف کارڈ اور تصاویر پر تکیہ کرنا نہیں چاہیئے بلکہ ایک ہوشیار مدرس اس اصول کی بدولت جس سے اظہار بیان کی تربیت ہوتی ہے کام لے کر ایک قصہ کے متعلق سلسلہ وار تصاویر سے کام لے سکتا ہے مثلاً ایک پیاسے کوے کی کہانی کا خاکہ پیش۔ اسی طرح ہر ایک کہانی یا قصہ میں تصاویر یا ڈرائنگ کو مضمون نگاری کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ مثلاً سارس اور بھیڑیا۔ انگور کھٹے ہیں۔ بیر اور انڈر ورلکس۔ اخبارات اور رسالہ جات کے لئے اہم واقعات یا تاریخی اشخاص و عمارات کی تصاویر جمع کرنا مثلاً کسی واقعہ کا افتتاح جنگ اور تاجپوشی وغیرہ۔ ہر جماعت میں ڈرائنگ بہت ہی ضروری اور کارآمد ہے اس کے ذریعہ اچھی تصویر آنکھوں کے راستے دل میں گھر کر سکتی ہے اور اس کی خاص طور سے ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب ہم بیرونی ممالک کے حالات پڑھتے یا سناتے ہیں۔

قصہ گوئی۔ قصہ گوئی کی تعلیم کے وقت قصہ کے مختلف حصوں کی توضیح طلباء کے سامنے بشکل تصاویر پیش
کی جائے تو قصہ سننے اور واقعات قصہ کو ڈرائینگس کی صورت میں دیکھنے کا ان پر ایسا گہرا اثر ہوگا کہ
وہ سنا ہوا قصہ کبھی نہیں بھولیں گے اور ان کو عمدہ تصاویر کی وجہ مزید قصے سننے کا شوق پیدا ہوگا مثلاً ایک
شخص اور ترکی ٹوپیوں کی پوٹلی کا قصہ وغیرہ۔

نیچر اسٹڈی ڈرائینگ کو سبق الاشیاء سے راست طور پر متعلق کیا جاسکتا ہے ڈرائینگ میں عام طور پر
پھول پتے اور جانوروں کی نقشہ کشی ہوتی ہے ان کو رنگ کرنا پڑتا ہے اور ان کے مخصوص
حصوں کا اظہار بھی ضروری ہوتا ہے سبق الاشیاء میں جس وقت درختوں اور جانوروں کا بیان کیا
جائے اس وقت سائینٹفک تشریح کے ساتھ اگر ان چیزوں کے حصوں کے نقشے بھی اتروائے جائیں تو
نہ صرف ڈرائینگ کی مشق ہوگی بلکہ متعلقہ مضمون کی جزئیات کے گہرے گہرے اور دیرپا ہوں گے سبق الاشیاء
کے سبق میں مدرس پہلے تو حتی الامکان حقیقی اشیاء پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن بعض ایسی ناگزیر
صورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ اصل اشیاء کا پیش کرنا مدرس کے لئے ناممکن ہوتا ہے ایسی صورت میں تختہ سیاہ
پر ڈرائینگ ہی کے ذریعہ بیان کی توضیح کرنی پڑتی ہے اس طرح سبق الاشیاء کے مضمون کو ہم ڈرائینگ سے
وابستہ کرکے دونوں میں ایک غیر محسوس طریقہ پر طلباء کی دلچسپی کو بیدار کرسکتے ہیں۔

مناظر قدرت چونکہ مطالعہ فطرت اور مشاہدہ قدرت یقین کامل حاصل کرنے کا ایک عمدہ اور بہترین وسیلہ
ہے اور کسی شئے کا تناسب بغیر ڈرائینگ کے ذہن نشین نہیں ہوسکتا اس لئے اصل شئے کے
مشاہدہ کے بغیر صحیح نقل یا تصویر نہیں لی جاسکتی ہے لیکن اصل شئے اگر نہ ہو سکے تو اس کا صحیح نمونہ پیش کیا
جاسکتا ہے جو صرف ڈرائنگ کے ذریعہ ہی ممکن ہے اگر نمونہ بھی موجود نہ ہو تو رنگین یا عکسی مشابہ تصویر
کام میں لائی جاسکتی ہے تصویر بھی نہ ہونے کی صورت میں صرف معمولی خاکہ یا تفہیم کے ذریعہ تعلیم دی جائے
تو اس طرز عمل سے تعلیم کا مقصد تو حاصل ہو جائے گا البتہ تکمیل تعلیم کے لئے اصل شئے فراہم ہونے کے بعد
مطابقت کا تصور ضرور دلایا جائے تاکہ طلباء اصلیت کی اہمیت کو جو مشاہدہ قدرت کا حقیقی ماحصل ہے
نظر انداز کرسکیں۔

مینول ڈرائینگ مینول ڈرائنگ میں ہر نمونہ کی تیاری سے پہلے ڈرائینگ لازمی ہے تاکہ خاکہ کے بموجب
پیمائش کی جاکر نمونہ تیار کیا جاسکے اور نمونہ کی تیاری سے قبل اس کو بخوبی سمجھایا
جاسکے۔ ڈرائینگ کا تعلق مینول ٹرینگ سے ایسا ہے جس طرح لکھنے کا تعلق پڑھنے سے ہے۔

مصوری۔ ڈرائنگ کے ذریعہ ان مختلف جذبات کا اعادہ کیا جاسکتا ہے جن کا اظہار ایک طویل

مضمون سے بھی نہیں ہوتا مصوری ڈرائنگ کا انتہائی کمال اور نمونہ اثر ہے جو خیالات کی یکسوئی کا نتیجہ ہو
نقاویر اور سین سنیری کے ذریعہ کائنات کے لطائف واضح ہو سکتے ہیں اور گھر بیٹھے مناظر قدرت کا مشاہدہ
کیا جا سکتا ہے لیکن کسی واقعہ یا منظر کی کیسی ہی تصویر الفاظ میں کھینچنے کی کوشش کی جائے وہ مصوری یا
ڈرائینگ کے رتبہ کو نہیں پہونچ سکتی۔

قدیم مصوری ہندی قدیم مصوری کے اعلیٰ نمونے ایجنٹہ۔ ایلورہ کے غاروں اور ورنگل نلگنڈہ کے
دیولوں وغیرہ میں اپنے ان صناعوں اور مصوروں کی یاد دلاتے ہیں جنہوں نے اپنی
بے مثال دستکاری اور رنگ آمیزیوں سے گزشتہ ہزاروں سال کے واقعات کو زندہ جاوید اور محفوظ
کردیا ہے۔ اسلامی دور ترقی سے نہ صرف صنعت طغرانویسی و نقاشی اور خطاطی کو معراج کمال پر پہونچایا
بلکہ ایسا نقش ونگار چھوڑا کہ یادگار زمانہ بن کر ہنوز سبق آموز ہیں۔ گزشتہ واقعات کی تصاویر جیسی
موثر ثابت ہوتی ہیں الفاظ وہ اثر پیدا نہیں کر سکتے۔ ڈرائینگ اور مصوری میں ایسی وسعت موجود
ہے کہ ان کے ذریعہ سے ایک دنیا نظر کے سامنے پیش کی جا سکتی ہے۔

دیگر سررشتہ جات۔ مذکورۂ بالا مضامین کے علاوہ انجنیرنگ۔ ڈاکٹری۔ صنعت وحرفت وتعمیرات
زراعت۔ جنگلات۔ تجارت۔ وغیرہ سررشتہ جات میں بھی ڈرائنگ کی ضرورت داعی ہوتی ہے۔

نصاب تعلیم ڈرائنگ

جدید نصاب ڈرائنگ جماعتواری جو آغاز سال تعلیمی ۱۳۴۰ف سے جاری کیا گیا ہے درج ذیل
ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نصاب نہایت کامل غور وخوض کے بعد بنایا گیا ہے لیکن تفصیل نہیں ہے عنوانات
متذکرہ کی مزید تفصیل کی ضرورت ہے تاکہ ڈرائنگ ماسٹر صاحبان کے لئے باعث ہدایت وسہولت تعمیل ہو جیسا
کہ دستی مشاغل کا تفصیلی نصاب ضمیمہ نصاب میں دے دیا گیا ہے۔

جماعت اول۔ رکھلے بازو اور بلا آلات کی نقشہ کشی۔ رنگین کھریا سے نقشہ کشی۔ (بیضوی شکلوں کی
مدد سے)

جماعت دوم۔ کھلے بازو اور بلا آلات کی نقشہ کشی۔ رنگین کھریا سے نقشہ کشی۔ تیلوں کی نقشہ کشی
(نسبتاً مشکل بیضوی شکل کی مدد سے) پیمانے کی مدد سے نقشہ کشی۔

جماعت سوم۔ نسبتاً مشکل اشیاء کی پنسل سے نقشہ کشی۔ تیلوں کی نقشہ کشی

اور برش کا کام ۔ آسان قدرتی اشیاء کی ڈرائنگ ۔

جماعت چہارم ۔ بے جان اشیاء کی نقشہ کشی ۔ پتیوں کی نقشہ کشی (زیادہ مشکل اشیاء) برش کا کام (قدرے مشکل) ذہنی نقشہ کشی ۔

جماعت پنجم ۔ بے جان اشیاء کی نقشہ کشی (معمولی ترکاریوں اور عام اشیاء کے خاکے اتارے جائیں) پیمانہ کی ڈرائنگ ۔ آسان اشیاء کے خاکے اتارنا ذہنی نقشہ کشی (ان اشیاء کی جن کی مثالی نقشہ کشی کی گئی ہو) برش کی نقشہ کشی ۔ بلاآلات کی نقشہ کشی ۔

جماعت ششم ۔ بے جان اشیاء کی نقشہ کشی (تشتریاں پیالے وغیرہ) پیمانہ اور نمونہ کی نقشہ کشی جو مساوی الاضلاع مثلث پر مبنی ہو ذہنی نقشہ کشی برش کی نقشہ کشی ۔ بلاآلات کی نقشہ کشی (نسبتاً مشکل اشیاء کی) تناسب کی وضعیں ڈیزائن (DESIGN) اور کشیدہ کی وضعیں

جماعت ہفتم ۔ بے جان اشیاء کی نقشہ کشی (آسان نمونوں Models مع Light & Shade) کی نقشہ کشی کی اس جماعت سے ابتدا کی جائے) زیادہ مشکل اشکال کے پیمانہ اور نمونہ کی نقشہ کشی ۔

ذہنی نقشہ کشی ۔ برش کی نقشہ کشی ۔ کتاب درسی کی کہانیوں کی تصاویر کی بلاآلات کی نقشہ کشی آسان جغرافیائی نقشہ کشی Map Drawing مناظر قدرت کی نقشہ کشی اور رنگ سازی

جماعت ہشتم ۔ میقات اول ۔ فلاٹ ڈرائنگ ۔ جامٹریکل ڈرائنگ ۔ جامٹری آئی ۔ ایچ مور کی پرابلم ۱ سے ۲۰ تک ۔ میموری ڈرائنگ ۔

میقات دوم ۔ ماڈل ڈرائنگ ۔

جماعت نہم ۔ میقات اول ۔ فری ہنڈ اور ماڈل ڈرائنگ (بالترتیب) آٹھویں جماعت سے مشکل شکلیں ۔ جامٹریکل ڈرائنگ مسئلہ علی (۱۰۰ سے ۲۰۰ تک)

میقات دوم ۔ نیچر ڈرائنگ اور رنگ کاری ۔

جماعت دہم ۔ میقات اول ۔ فری ہنڈ ڈرائنگ نسبتاً مشکل جماعت نہم سے ۔ جامٹریکل ڈرائنگ اور مکانیکل میژرمنٹ ۔ مسئلہ علی (۲۰۰ سے ۲۲۳ تک)

میقات دوم ۔ اعادہ جماعت ہشتم و نہم و میقات گزشتہ ۔

افسوس ہے کہ اردو میں فن ڈرائنگ کی بہت کم کتابیں موجود ہیں حالانکہ انگریزی میں اس مضمون پر کافی مواد موجود ہے اس کی سخت ضرورت ہے کہ ہمدردان قوم و ملک و محبان تعلیم اس جانب فوری

توجہ فرما کر اس خامی کو جلد سے جلد دور فرمائیں

خاتمہ ونتیجہ

ہم نے تعلیم ڈرائنگ۔ اس کی ضرورت۔ طریقہ تعلیم اور اس کے مختلف پہلوؤں اور دیگر مضامین نصابی سے اس کے تعلقات اور اس کی اہمیت پر کافی غائر نظر ڈالی ہے جس سے ہمیں معلوم ہوا کہ نصاب تعلیم میں دوسرے لازمی مضامین کے مساوی تعلیم ڈرائنگ کو بھی کافی اہمیت دی جانے کی ضرورت ہے تاکہ اس کا خوشگوار اثر طلبا کی ذہنیت کو ماحول کے موافق اور اس سے متاثر کر سکے اور ان کی آئندہ زندگی کو خوش حال و کامیاب بنانے کا سبب ہو۔

خوشی کی بات ہے کہ جدید نصاب تعلیم میں اس جانب کافی توجہ کی گئی ہے اور عثمانیہ میٹرک کے امتحان سے قبل درخواستہائے شرکت امتحان میں اس کی تصدیق لازمی گردانی گئی ہے کہ درخواست گذار نے نصاب تعلیم ڈرائنگ کی تکمیل کرلی ہے اس طرح سے امتحان تفرڈ فارم (جماعت ہفتم) میں بھی اس کے مقررہ نصاب کی تکمیل کے بغیر ترقی نہ دینے کی شرط لگائی جانا مناسب ہوگا ورنہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جو طلبا جماعت ہفتم کامیاب کر کے آتے ہیں اکثر ڈرائنگ سے نابلد رہتے ہیں۔

تعلیم ڈرائنگ کو فروغ دینے کے لئے ارباب صدر کی توجہ مبذول کرانا ہمارا فریضہ ہے ہمیں امید ہے کہ ہمارے ان مساعی کو حکام ذی اقتدار ضرور مشکور فرمائیں گے۔

ہماری استدعا ہے کہ تعلیم ڈرائنگ کی راہ میں جو دقتیں اور مشکلات حائل ہیں ان کو جلد از جلد دور کر دیا جائے اور ہر مدرسہ وسطانیہ اور فوقانیہ کو ڈرائنگ کے ضروری آلات وسامان نقشہ جات سے مکمل کر دیا جائے ڈرائنگ کی تعلیم کے لئے ایک خاص کمرہ ہر مدرسہ فوقانیہ و وسطانیہ میں علحدہ کر دیا جائے ان امور کی نگرانی و ترقی کے لئے ایک ماہر فن ناظر ڈرائنگ و دستی مشاغل کا تقرر بھی مثل ناظر صاحب دینیات اور صدر مہتمم صاحب ورزش جسمانی فرمایا جائے تاکہ موجودہ تعلیم ڈرائنگ اور دستی مشاغل کا خود اختیاری عمل جس پر معلمین ڈرائنگ کا عمل درآمد ہے اصولی طریقہ پر تنظیم پاسکے اور تعلیم ڈرائنگ و دستی مشاغل کے حقیقی مقصد کی تکمیل ہو اوس کی کماحقہ نگرانی و تنقیح ہو سکے جیسا کہ دیگر صوبہ جات ہند میں عمل ہے۔

اس کے علاوہ منجانب سررشتہ تعلیم ڈرائنگ کی خصوصی سالانہ نمائش کا انعقاد فرمایا جائے اور سردست موجودہ ملحقہ نمائش کانفرنس ہذا کے نمائش مذکور میں شعبہ ڈرائنگ کو سال آئندہ سے علحدہ کر دیا جائے تو مناسب ہوگا تمام ممالک محروسہ سرکار عالی سے عمدہ نمونہ جات ڈرائنگ ہمہ قسم فراہم کئے جائیں تاکہ

طلباء کو تبادلہ خیالات کا موقع ملے اور معلومات میں وسعت ہو اور اپنی کامیابی کا احساس اور ڈرائنگ کی خصوصیات سے واقف ہو سکیں پسندیدہ نمونوں کے لئے مناسب انعامات عطا فرمائے جائیں تاکہ طلباء کو ایسی ڈرائنگ سیکھنے کا شوق ہو جو اختراعات و ایجادات کا گہوارہ ہے۔

چونکہ ہمارے ملک میں خود اپنی ایک یونیورسٹی کا قیام بھی عرصہ ہوا عمل میں آچکا ہے اور مختلف قسم کے امتحانات کا انتظام بھی منجانب سرکار عالی ہو رہا ہے اس کی سخت ضرورت ہے کہ ڈرائنگ کے مختلف گریڈوں کا امتحان بھی جس کی تعلیم کے لئے ہر مدرسہ میں ڈرائنگ ماسٹر صاحبان کا تقرر ہے اپنے ہی ملک میں ہوا کرے اور ڈرائنگ ماسٹران کی ٹریننگ کا بھی انتظام اپنے ہی ملک میں موجودہ ٹریننگ کالج میں ہو کرے جیسا کہ فزیکل ٹریننگ کا انتظام کیا گیا ہے۔

اگر ہماری علم پرور اور فیاض سرکار اور ارباب اقتدار اور ذی ثروت ہمدردان تعلیم و بہی خواہان ملک و قوم حالات ملک اور ضروریات بالا پر غور فرما کر امور بالا کی تکمیل کے جانب توجہ فرمائیں اور خود مدرسین اور طلباء بھی محنت اور ایثار سے کام لیں تو جملہ ضروریات بالا کی تکمیل جلد اور بآسانی ممکن ہے۔

خدائے کارساز و مسبب الاسباب ہم سب کو اپنی ان تمناؤں کی تکمیل کا روز مسعود جلد دیکھنا نصیب کرے۔

اختتام رپورٹ سے قبل اس مجلس کا فریضہ ہے کہ جناب مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری بی۔ اے (آکسن) نائب ناظم تعلیمات ملک سرکار عالی و صدر نشین میٹنگ ہذا کا دلی شکریہ خاص طور پر ادا کیا جائے۔ جنہوں نے باوجود اپنی کثیر مصروفیتوں کے تعلیم ڈرائنگ کے سکشنل میٹنگ کی صدارت کو قبول فرما کر رپورٹ مذکور کو نہایت توجہ سے سماعت فرما کر اپنے دیرینہ تجربات و مفید مشوروں سے اراکین انجمن ہذا کو ممنون و مشکور فرمایا فقط

تجرباتی تعلیمی نفسیات

از

ابوالمکارم فیض محمد صاحب صدیقی بی اے۔ ڈپ۔ ایڈ (عثمانیہ) مدرس سائنس مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم بلدہ

جناب صدر، معزز خواتین و حضرات! میں ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اس امر کا موقعہ دیا کہ

میں اپنے محدود تجربے اور ناچیز خیالات کو آپ کے گوش گزار کروں جس مضمون پر اب میں روشنی ڈالنا چاہتا ہوں وہ کوئی فسانہ یا ادب لطیف کا شہ کار نہیں بلکہ قدرے خشک اور سائنٹیفک مضمون ہے لیکن مجھے امید ہے کہ آپ کی دوررس نگاہ اور قومی ترقی و فلاح کا شوق اس کے اندر گوناگوں دلچسپیاں پائے گا اور آپ کے حساس دل اس کی اہمیت کو ضرور محسوس کریں گے۔ اگر یہ ہوا تو میں سمجھوں گا کہ میرے بے زبان الفاظ نے آپ کے دلوں میں جگہ پانے میں کامیابی حاصل کی۔

حضرات! اس سے پہلے کہ میں آپ کی توجہ اس مضمون کی طرف منعطف کراؤں ہمارے موجودہ تعلیمی نظام پر ایک سرسری نظر ڈال لینا ضروری خیال کرتا ہوں تاکہ ہم اس کے لحاظ سے اصلاحی تدابیر کی طرف قدم بڑھا سکیں۔ جب ہم اپنی زندگی کے مختلف شعبوں اور بالخصوص تعلیمی نظم ونسق پر ایک نظر ڈال کر مغرب سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مغرب کے مقابلہ میں ہم کچھ نہیں تو کئی سو سال ضرور پیچھے ہیں۔ یہ شاعری اور مبالغہ نہیں بلکہ امر واقعہ ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ سے مثالیں لے کر اس حقیقت کو واضح کرنا طول عمل ہے۔ میں صرف دو ایک مثالوں پر اکتفا کروں گا ہمارے یہاں کے مروجہ "قاعدوں" پر نظر ڈالئے تو پتہ چلے گا کہ آج سے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے کامی جس کے زمانہ میں "قاعدے" لکھنے کا جو اسلوب تھا وہ آج ہمارے یہاں رائج ہے۔ اس اثنا میں ان کی ہیئت کیا سے کیا ہوگئی اور اصلاح پاتے پاتے وہ ایک نئے قالب میں ڈھل گئے لیکن ہم ہیں کہ ابھی ابتدائی منزلوں کے طے کرنے میں ہی سرگرداں و پریشاں ہیں! علاوہ ازیں اگر آپ مغرب کے نظامات تعلیمی پر نظر ڈالیں تو آپ کو ڈالٹن پلان، مانٹسوری نظام تعلیم، پراجکٹ میتھڈ اور اس قسم کے کئی تعلیمی طریقے ملیں گے جو وہاں مروج ہیں یا جن کو مروج کرنے کی ممکنہ کوشش کی جارہی ہے لیکن ہندوستانی مدرسین سے پوچھئے تو نوے فیصدی سے زائد ایسے ملینگے جن کو ان کا نام تک بھی برابر معلوم نہیں۔ اس کی وجہ کچھ تو ماحول کا اثر ہے اور زیادہ تر وہ جمہودی کیفیت ہے جو عرصہ سے ہم پر طاری اور مسلط ہے اور جس کے باعث ہمارے طبائع کا رجحان معکوس ترقی کی طرف مائل ہوتا جارہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہی انجمادی کیفیت کچھ عرصہ اور باقی رہی تو ہماری قوم جو اس وقت استعداد مردہ دل قوموں میں شمار کی جاتی ہے حقیقت میں وجود معطل ہو کر رہ جائے گی!!

اس لئے اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی پستی سے نکلنے کے لئے تعلیمی معاملات میں مغرب کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں اور ان تمام مخالفتوں کا جواں مردانہ مقابلہ کریں جو ایک ترقی کرنے والی جماعت کے آگے پیش آتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ گزشتہ چند سالوں سے ہمارے ملک کی متعدد شخصیتیں اصلاح کی طرف رجوع ہوئی ہیں چنانچہ یہ کانفرنس بھی اسی کا ایک نتیجہ ہے

لیکن باوجود اس ہلچل کے اب بھی قطعی طور پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ غفلت کا نشہ پوری طرح اتر چکا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس دور میں جہاں زندگی کے ہر شعبہ کی ترقی کی طرف توجہ دی جا رہی ہے شعبہ تعلیم کی طرف خاص طور پر توجہ مبذول کی جائے کیونکہ آپ حضرات سے یہ مخفی نہیں کہ قوم کو سنوارنے کا واحد ذریعہ تعلیم ہے۔ اگر ہم ملک کو تعلیمی ترقیات سے مالامال کریں تو رفتہ رفتہ اس کے نتیجہ کے طور پر زندگی کا ہر شعبہ خود بخود ترقی کر جائے گا۔

حضرات جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے تعلیمی ترقی کا واحد اور مجرب نسخہ یہ ہے کہ ہم اپنے تعلیمی نظامات کی تشکیل میں متمدن ممالک کے نظامات کو پیش نظر رکھ کر ان کو اپنی ضرورت کے مطابق ڈھال لیں تعلیمی معاملات میں یورپ اور امریکہ دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں۔ ان کے بہترین دماغ بچوں کی تعلیم کے لئے نئے نئے اصول وضع کرنے میں مصروف ہیں۔ اور اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان لوگوں نے تعلیم کو ایک باقاعدہ اور مکمل سائنس کی صورت دی ہے۔ تعلیمی نفسیات جو تجرباتی نفسیات کی ایک اہم شاخ ہے اور جس سے میں یہاں بحث کروں گا انہی گراں قدر دماغی جواہر پاروں میں سے ایک ہے اور جیسا کہ آگے چل کر واضح ہو جائے گا اس نے تعلیمی میدان میں ایک نئی شاہ راہ کھول دی ہے جس پر گامزن ہونا ترقی کی نشانی ہے۔ تجرباتی نفسیات کو جدید سائنٹفک نفسیات بھی کہتے ہیں اور یہ نفسیاتی مسائل کو تجرباتی ذریعہ حل کرنے کا ایک آلہ ہے تعلیمی نفسیات بھی اس کی ایک شاخ ہے۔ اس میں خالص نفسیات کے وہ تمام مسائل لئے جاتے ہیں جن کا تعلق تعلیم سے ہے اور جن کا استعمال زیادہ تر مدرسہ کے ماحول تک محدود ہوتا ہے۔ اس کا علم ہمارے لئے ضروری ہے۔ قیاسی یا تاثی مسائل کو عمل میں کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہے اس لئے جہاں تک ہو سکے ہمارا مطمح نظر یہ ہونا چاہئے کہ ہم بچوں کے لئے وہی اصول اور مسائل استعمال کریں جن کو تجربہ کی کسوٹی پر آزمایا جا چکا ہے۔

اب میں آپ حضرات کے آگے تعلیمی نفسیات کے اہم استعمالات کا ذکر کروں گا۔

ذہنی آزمائشات سب سے پہلے میں ذہنی آزمائشات (Mental Tests) کے مسئلہ کو لیتا ہوں جو موضوع زیر بحث کا ایک اہم حصہ اور ہماری موجودہ تعلیمی ضروریات کا جز و لاینفک ہے ہم واقف ہیں کہ ارسطو سے لے کر حال حال تک نفسیات مابعد الطبیعات کی ایک شاخ ہی رہی اور اس کے عام اور مسلمہ اصولوں میں بہت کم تبدیلی ہوئی۔ نفسیات داں زیادہ تر تاثی سے طریقہ کام لیتا تھا اور اسی باعث اس کے اصول اکثر مبہم، نظری اور ناقابل عمل ہوتے تھے لیکن حضرات اب دنیا بدل گئی ہے، نفسیات داں آرام کرسی پر بیٹھ کر فلسفیانہ انداز میں خیال آرائی کرنے کی بجائے ایک ماہر سائنس

کی طرح معمل میں کھڑا ہو کر اپنے قیاسات اور مشاہدات کو تجربہ کی کسوٹی پر پرکھتا ہے اور نفسی مسائل اسی طرح صداقت اور جامعیت کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں جس طرح ریاضی کا کوئی ضابطہ۔

پہلے یہ ہوتا تھا کہ کسی شخص کی نفسی خصوصیات طبعی علامات کے ذریعہ معلوم کی جاتی تھیں یعنی ظاہری شکل وصورت اور وضع قطع سے اس کے اندرونی کردار کا پتہ لگایا جاتا تھا، کارل پیرسن Karl Pearson نے کئی ہزار طالب علموں پر تجربہ کر کے ثابت کیا کہ طبعی علامات کو ذہانت کے ساتھ کوئی نمایاں باہمی ربط نہیں ہے۔

اس کے بعد حسی اور حرکی آزمائشات استعمال کی جانے لگیں جن میں Aaesthetic meter اور Reaction Time Tests وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اور بھی کئی طریقے ہیں لیکن سب بڑی حد تک بالواسطہ ہیں اس لئے ماہرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ ذہانت کی آزمائش کے لئے ذہنی آزمائشیں ہی استعمال کی جائیں تاکہ انفرادی طور پر نفس کا مطالعہ کیا جاسکے۔

۱۹۱۰ء میں فرانس میں جب کمزور اور متوسط ذہانت کے طلباء کی علیحدگی کا سوال درپیش ہوا تو وہاں کے وزیر تعلیمات نے بی نے Binet کو اس کام پر مقرر کیا۔ بی نے اور رسائمن نے اپنی مشترکہ کوشش سے ذہنی آزمائشات کا ایک سلسلہ تیار کیا جو اس مقصد کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ یہ پیمانے آزمائشات کا ایک سلسلہ ہیں جس میں ہر ایک آزمائش ایک مسئلہ کی اہمیت رکھتی ہے جس کو حل کرنے کے لئے ذہانت کی ضرورت لاحق ہوتی ہے بی نے کا یہ خیال تھا کہ ذہانت ایک چیز نہیں بلکہ مختلف چیزوں کا مجموعہ ہے اس لئے اس نے آزمائشوں میں خاص طور پر اس امر کا خیال رکھا کہ بعض ان میں سے حافظہ کی جانچ کے لئے ہوں اور بعض استدلال کی قوت معلوم کرنے کے لئے، بعض تفہیم سے متعلق ہوں اور بعض خیالات کی ترتیب اور معمولی اشیاء کی معلومات سے متعلق۔ مثال کے طور پر اس نے آٹھ سال کی عمر والے طلباء کی ذہانت ناپنے کے لئے جو آزمائشات تیار کی ہیں ان کو بیان کروں گا۔ وہ یہ ہیں۔

۱۔ طالب علم کو ایک عبارت دی جاتی ہے جس میں ۲۰ اہم جزو ہوتے ہیں۔ طالب علم سے پڑھوا کر اس سے کوئی دو جزو دھرانے کے لئے کہا جاتا ہے۔

۲۔ اس کے بعد چند سوالات پوچھے جاتے ہیں مثلاً۔

i ۔ اگر ریل چھوٹ جائے تو کیا کروگے؟

ii ۔ اگر کسی کی کوئی چیز توڑ دو تو کیا کروگے؟

iii ۔ اگر اتفاق سے کسی لڑکے یا لڑکی سے ٹکر ہو جائے تو کیا طریقہ کار اختیار کروگے؟

۳- ۲۰ سے ایک تک الٹا گننے کے لئے کہا جاتا ہے۔

۴- دن، تاریخ، مہینہ کا نام پوچھا جاتا ہے

۵- چھ ہندسوں کے عدد کو دھرانے کے لئے کہا جاتا ہے مثلاً ۴، ۶، ۳، ۰، ۵، ۲۔

اسی طرح بی نے نے ہر عمر کے لئے آزمایشات کا ایک سلسلہ تیار کیا ہے جن کو کافی مقبولیت حاصل ہے اور مختلف ممالک میں اس کے اصولوں سے استفادہ کرکے ملکی حالات کے لحاظ سے ان کو اپنا بنا لیا جاتا ہے۔ اس قسم کی آزمایشات پنجاب کے دو ایک علاقوں اور بنگال میں تیار کی جا چکی ہیں۔ ہمارے یہاں بھی ایسی آزمایشات تیار کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔

بی نے۔ سائمن کے پیمانہ کا حال بیان کرنے کے بعد میں اس نقص کو بھی واضح کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ اس پیمانے کے استعمال میں ہر فرد کو علیحدہ علیحدہ امتحان لینا ہوگا جس کے لئے کافی وقت درکار ہے اسلئے اگر کسی بڑی جماعت کے افراد کی ذہانت معلوم کرنی ہو تو ظاہر ہے کہ اس کے لئے بہت زیادہ وقت لگے گا یہ سوال خصوصاً اس وقت پیدا ہوا جب کہ جنگ عظمیٰ کے بعد امریکی فوج کے سپاہیوں میں عہدے تقسیم کرنے کا سوال درپیش ہوا، یہ ناممکن تھا کہ ہر سپاہی کو عہدہ دیا جاتا اس لئے یہ تصفیہ پایا کہ اس سپاہی کو عہدہ دیا جائے جس کی ذہانت اعلیٰ ہو۔ اس صورت میں بے نی۔ سائمن کا پیمانہ استعمال کرنا ایک عرصہ طلب کام تھا اس لئے ماہرین نفسیات نے جماعتی آزمایش کا طریقہ نکالا جس کی مدد سے وقت واحد میں سب کی ذہانت کی پیمایش کی گئی۔ اب جماعتی آزمایش کو مدرسہ کے کاروبار میں بھی استعمال کیا جانے لگا ہے۔ اس سلسلہ میں ٹرمن Terman نے امریکی حالات کے تحت جو جماعتی آزمایشات تیار کی ہیں بہت مفید ہیں۔

بی نے۔ سائمن آزمایشات اور جماعتی آزمایشات صرف ذہانت کے ناپنے کے لئے ہیں لیکن دوسری نفسی خصوصیات کی پیمایش ان سے نہیں ہو سکتی۔ اس لئے چند اور آزمایشات تیار کی گئی ہیں جو یہاں مختصراً بیان کی جائیں گی۔

۱- دستی آزمایشات Performance Tests یہ آزمایشات ان لوگوں کے لئے ہے جو گونگے یا بہرے ہیں ورنہ اگر صرف بی نے سائمن آزمایشات کو استعمال کیا جاتا تو گونگے ان سے محروم ہو جاتے کیونکہ ان کا بولنے سے تعلق ہے اسی لئے بی نے سائمن آزمایشات کو لسانیاتی آزمایشات بھی کہا جاتا ہے۔

۲- تعلیمی آزمایشات- ان سے تعلیمی مضامین کی آزمایش مراد ہے مثلاً حساب، خطاطی

۳- پیشہ کی آزمایشات- ان آزمایشات کی مدد سے ہم کسی خاص پیشہ کے لئے کسی خاص آدمی کا

انتخاب کر سکتے ہیں اور کسی طالب علم کی کسی مخصوص پیشہ کے لئے رہبری کر سکتے ہیں۔ ان کا استعمال بہت ضروری اور سود مند ہے۔ کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ اکثر طالب علم مدرسہ یا جامعہ سے تعلیم ختم کر کے نکلنے کے بعد حیران و پریشان رہتے ہیں کہ کون پیشہ اختیار کیا جائے، ان کے آگے کوئی لائحہ عمل نہیں ہوتا اور نہ کوئی ان کی رہبری کرتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی عمر کا وہ حصہ جس میں حقیقی معنی میں وہ کچھ کام انجام دے سکتے ہیں ضائع کرتے ہیں۔ اگر استاد ابتدا ہی میں ان کی رہبری کرے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے طالب علم کے حق میں اس سے زیادہ ہمدردی نہیں کر سکتا۔

۴۔ کردار اور مزاج کی آزمائشات۔ اگرچہ یہ آزمائشات زیادہ ترقیاسی یا ذاتی تجربہ پر منحصر ہوتی ہیں تاہم مدرس ضرورت کے موافق ان سے مدد لے سکتا ہے۔

ان آزمائشات کا ایک مختصر خاکہ پیش کرنے کے بعد میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ ان کے فوائد کو بھی آپ پر واضح کر دوں۔

سب سے پہلے یہ کہ ان آزمائشات کی مدد سے ہم طلباء کی درجہ بندی اور تعلیمی معاملات میں ان کی راہ نمائی کر سکتے ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ذہین، کاہل اور متوسط درجہ کے طلباء ایک ہی جماعت میں رکھ دیئے جاتے ہیں جس سے ہر سہ معیار کے طلباء کو نقصان پہونچتا ہے لیکن ان آزمائشات کی مدد سے ہم مختلف ذہانت کے طلباء کو علیحدہ کر کے یکسانیت پیدا کر سکتے ہیں اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ غبی طالب علموں کا پتہ لگا کر اور ان کی ذہنی کمزوری کے اسباب و علل دریافت کر کے ان کے ساتھ مخصوص طریقہ کار اختیار کر سکتے ہیں کیونکہ اکثر طالب علم جن کو ہم بظاہر غبی پاتے ہیں، ان کے ساتھ اگر تھوڑا سا نفسی یا طبی برتاؤ کیا جائے تو وہ ذہین طلباء کی صف میں جگہ پا سکتے ہیں، نہ معلوم ہر مدرسہ میں ایسے کتنے طالب علم موجود ہیں جو ہماری اور اپنے والدین کی ذراسی غفلت کے باعث ہمیشہ کے لئے گمنامی اور بدبختی کا شکار ہو جاتے ہیں! ان کے علاوہ ان آزمائشات کی مدد سے ہم مختلف جماعت کے بچوں کی ذہانت کا اندازہ لگا سکتے اور ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں و نیز مدرسین کی کارگذاری کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور بھی کئی فوائد ہیں جن کو اگر میں تفصیل کے ساتھ بیان کروں تو وقت ناکافی ہوگا۔

عمل اکتساب **حضرات!** ذہنی آزمائشات کا ایک سرسری خاکہ پیش کرنے کے بعد عمل اکتساب کی طرف آپ کو متوجہ کرتا ہوں۔ عمل اور ردِ عمل کا مسئلہ نہ صرف سائنس تک ہی محدود ہے بلکہ اس کا اطلاق تعلیمات پر بھی ہے، مدرس جو کچھ پڑھاتا ہے اس کی نوعیت عمل کی سی ہوتی ہے اور طلباء کا ان معلومات کو حاصل کرنا گویا ایک قسم کا ردِ عمل یا جوابی حرکت ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب تک مدرس

ایسا انتظام نہ کرے جس سے کہ مرغوب ردِ عمل پیدا ہو تدریس بار آور نہیں ہوسکتی۔ اسی لئے ماہران تعلیمات نے اکتساب کے کئی قوانین وضع کئے ہیں مثلاً تھارن ڈائیک کے قوانین اکتساب یہ ہیں۔ (۱) قانون اثر (۲) قانون استعمال اور عدم استعمال اور (۳) قانون تیاری۔ ان پر عمل کرنے سے ہم عمل اکتساب میں بہت کچھ مدد دے سکتے ہیں اور بہت سی سہولتیں بہم پہونچتی ہیں۔ اس کے علاوہ مدرس کے لئے طلباء کی ترقی کی شرح اور حدود کو پیش نظر رکھنا چاہئے یعنی کس طرح ترقی کی شرح میں اضافہ ہوسکتا ہے اور کس حد تک ترقی ممکن ہے۔ یہ چیز بہت وسیع ہے۔ ناممکن ہے کہ اس قلیل وقت میں میں اس پر تفصیلی بحث کرسکوں۔ اس لئے تعلیمی مضامین کی نفسیات کے مسئلہ کو لیتا ہوں جو عمل اکتساب کا ایک ذیلی مسئلہ ہے۔

تعلیمی مضامین کی نفسیات یورپ اور امریکہ میں تقریباً تمام مضامین سے متعلق آزمائشات تیار کی جاچکی ہیں لیکن میں مثال کے طور پر صرف خطاطی کی آزمائش کا ذکر کروں گا جس سے واضح ہوگا کہ تعلیمی مضامین کی آزمائش کو کس حد تک سائنٹیفک بنایا گیا ہے۔

خطاطی کی آزمائش کے متعلق ہم کسی طالب علم کے خط کو دیکھ کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ خط اچھا ہے یا بُرا یا متوسط لیکن ہمارے یہاں اس کا کوئی خاص معیار نہیں۔ صرف شخصی رائے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ہم کسی خاص قسم کے خط کے نمونے کو ہر وقت ایک ہی نشانات نہیں دے سکتے۔ جس طرح کسی خط کے طول کو ناپ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا طول دس انچ ہے یا بارہ۔ علاوہ ازیں ایک اور خامی یہ ہے کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ دو مدرسوں کے طلباء کے خطوں کا کیا معیار ہے اور ان میں کیا باہمی ربط ہے۔ اس میں شک نہیں کہ معائنہ کرنے والے افسر بڑی جرأت کے ساتھ خطاطی کے متعلق اپنی رائے لکھ دیتے ہیں لیکن میری یہ عرض ہے کہ اگر ٹھنڈے دل سے وہ اس پر تھوڑا سا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں "تکمیل ضابطہ" کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا!

اس کمی کو محسوس کرکے امریکہ اور انگلستان کے ماہران تعلیم نے جن میں تھارن ڈائیک ایئر اور برٹ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں توجہ دی اور اس کا معیار تیار کرنے کے لئے انہوں نے الگ الگ خطاطی کے مختلف نمونے حاصل کرکے بڑی جد وجہد کے بعد مختلف پیمانے تیار کئے۔ خطوط کے ممتاز اور معیاری نمونوں کا تصفیہ ان لوگوں نے تنہا اپنی شخصی رائے سے نہیں کیا بلکہ کئی اور ماہران سے ان کی جانچ کرانے کے بعد ان سب کا اوسط نکالا اور پھر اس طرح سے ان تینوں نے اپنے اپنے اصولوں کے مطابق تین معیاری نمونے تیار کئے جن میں تھارن ڈائیک کا پیمانہ بہت توضیحی ہے۔

انگریزی کی حد تک تو یہ پیمانے دستیاب ہیں اور ان کو ہمارے ملک میں بھی استعمال خیال جاسکتا ہے لیکن اردو زبان میں ان نمونوں کے تیار کرنے کی شدید ضرورت ہے، ذرا دقت طلب کام ہے لیکن ارباب اقتدار

کی تھوڑی سی توجہ اس کو آسان بنا سکتی ہے۔

خطاطی کے ایسے نمونے کئی اعتبار سے تعلیمی کاروبار میں کارآمد ہو سکتے ہیں مثلاً مدرس اور صدر مدرس یا معائنہ کرنے والا افسران سے استفادہ کر سکتا ہے، خود طالب علم اپنی سابقہ حالت سے موجودہ حالت کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور انھیں اس حقیقت کا علم ہو سکتا ہے کہ ان کے اپنے خط کا معین معیار کے ساتھ کیا تعلق ہے علاوہ ازیں ہر وہ شخص خواہ وہ تعلیمات سے تعلق رکھتا ہو یا نہیں مثلاً طلبا کے والدین۔ ان نمونوں سے کسی خط کی جانچ کر سکتے ہیں۔ ان فوائد کی بنا پر تعلیمی دنیا میں ان پیمانوں کو مخصوص اہمیت دی گئی ہے۔ اور ضرورت ہے کہ ہمارے یہاں بھی ان کو رائج کرنے کی کوشش کی جائے۔

اعدادِ شماری ناپ حضرات! تجرباتی تعلیمی نفسیات کی ایک مہتم بالشان شاخ اعداد شماری ناپ ہے۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں بلکہ نظم و نسق مدرسہ کی حد تک اعداد شماری ناپ کو بہت کچھ رواج حاصل ہے صرف سرسری طور پر۔ لیکن اس ناپ میں اب اسی طرح کی احتیاط برتی جا رہی ہے جس طرح حیاتیات اور دیگر طبعی علوم میں کی جاتی ہے۔ اب نہ صرف حاضری، اخراجات مدرسہ اور اس قسم کے دیگر امور تک ہی یہ ناپ محدود ہے بلکہ اس کی مدد سے مقدار علم کی اضافی اور مطلق قیمتوں کی بھی تعین کی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تعلیمی امور میں قیاس اور شخصی رائے کی جگہ ریاضیاتی نتائج نے لے لی ہے۔

اس ناپ کی ابتدا سر فرانسس گالٹن سے ہوئی لیکن اس کی اشاعت سب سے پہلے کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر تھارن ڈائیک نے کی۔ بعد کو اس پر بہت کچھ حاشیے چڑھائے گئے اور پیرسن اور اسپرٹین نے اس موضوع پر بہت کچھ کام کیا۔ ان دونوں نے اس کے متعلق چند ضابطے بھی حاصل کئے ہیں جن کو ایک مدرس جو تھوڑی بہت ریاضی سے واقف ہے آسانی کے ساتھ استعمال کر سکتا ہے۔

اعداد شماری ناپ نے ہماری بہت سی تعلیمی مشکلات کو دور کر دیا مثلاً یہ کہ ہم دو مضامین کے مابین ارتباط باہمی معلوم کر سکتے ہیں۔ سوالات کی مشکل کا لحاظ اور ان کے لئے نشانات مقرر کرنے میں مدد لے سکتے ہیں اور تعلیمی معطیات کے تجزیہ اور اختصار میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

تعلیمی نفسیات کا یہ حصہ کسی قدر خشک ہے مگر جتنا خشک ہے اتنا ہی زیادہ سود مند بھی ہے۔ ہمارے یہاں اس کو رائج کرنے کی سخت ضرورت ہے کیونکہ اس کے عدم رواج کے باعث امتحانات کے نتائج پر بہت مضر اثر مترتب ہو رہا ہے جس کی تفصیل میں ابھی پیش کرتا ہوں۔

امتحانات ۔ حضرات! آخر میں امتحانات کی موجودہ صورت حال کو واضح کر کے میں ان سے متعلق چند اصلاحی امور پیش کروں گا۔

Essay type ہمارے یہاں تو تقریباً ہر ثانوی اور جامعاتی امتحان میں مضمون کی طرز کے امتحانات ہوتے ہیں اور عام طور پر ان کے تین مقاصد بتلائے جاتے ہیں پہلے تو یہ کہ ان سے مضمون نویسی کی مشق ہوتی ہے۔ دوسرے طالب علم اس کے لئے معلومات فراہم کرتے ہیں اور تیسرے یہ محرکہ اور ترغیب کا کام دیتے ہیں۔

یہ سب سچ ہے لیکن اس میں اس قدر نقائص موجود ہیں کہ ان کے جواز کی کسی طرح تائید نہیں کی جا سکتی۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) نشان دہی کسی سائنٹفک طریقہ پر نہیں ہوتی بلکہ بالکلیہ شخصی ہوتی ہے۔ اسٹارچ نے یہ تجربہ کیا کہ ایک ممتحن کے پاس اس نے ایک ہی پرچہ دو مرتبہ جانچنے کے لئے بھیجا تو معطیہ نشانات میں اختلاف پایا گیا۔ اس کے بعد اس کے اسی پرچہ کو مختلف ممتحنین کے پاس جانچ کے لئے روانہ کیا تو معطیہ نشانات میں ۲۸ سے لے کر ۲۹ تک اختلاف آیا۔ اور آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ پرچہ مرتب کرنے والے نے جب اپنے سوالات کے جوابات خود لکھے تو ان جوابات پر بعض ممتحنین نے ۵۰ سے زیادہ نمبر نہیں دیئے۔

(۲) ممتحن کی شخصی مساوات کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔

(۳) یہ کوئی ضروری نہیں کہ مدرس اور ممتحن کا مطمحٔ نظر ایک ہی ہو مثلاً یہ کہ اگر ایک مدرس ریاضی جماعت میں جواب کے عمل کو اہمیت دیتا ہے، طلبار کی ذہنیت بھی لازماً اسی رنگ میں رنگی جائے گی لیکن ناممکن ہے کہ پبلک امتحان کے ممتحن کا بھی وہی نقطۂ نظر ہو جو مدرس جماعت کا ہے۔ ایسی صورت میں ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ طلبار کے حق میں انصاف ہو رہا ہے؟

(۴) مختلف ممتحنین جواب کی مختلف خوبیوں کو پیش نظر رکھتے ہیں مثلاً بعض زبان کو دیکھتے ہیں، بعض اسلوب بیان کو پسند کرتے ہیں، بعض مواد کو تلاش کرتے ہیں، بعض اختصار کو پسند کرتے ہیں اور بعض وضاحت چاہتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ معطیہ نشانات کسی خاص اصول کی بنار پر دیئے گئے ہیں؟

(۵) ان سب کے علاوہ امتحانات کی بڑی خامی یہ ہے کہ ممتحن طلبار کی پوری مکسوبہ معلومات کا امتحان نہیں لے سکتا کیونکہ سوالات کی نوعیت محض اتفاق پر مبنی ہوتی ہے جس سے بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ اچھے طالب علم تو رہ جاتے ہیں اور خراب کامیاب ہو جاتے ہیں۔

جب نشان دہی کی یہ صورت ہے تو پھر ہم موجودہ امتحانات کے متعلق کس بنار پر اچھی رائے قائم کر سکتے ہیں۔ اس مسئلہ پر کافی غور و خوض کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہمارے یہاں بھی موجودہ

طرز کے امتحانات کی وجہ سالانہ سینکڑوں طالب علم ناکامی کا شکار ہوتے ہیں چنانچہ آپ نے اکثر طالب علموں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ "میں ایک نمبر سے فیل ہوگیا" کیا کوئی ممتحن صاحب جنہوں نے ایک طالب علم کو ۲۹ نشانات دے کر ایک نمبر سے ناکام کیا ہے اس بات کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اگر یہی پرچہ دوبارہ انہیں جانچنے کے لئے دیا جائے تو پھر اسے ۲۹ ہی نشانات دیں گے؟ میں نہیں کہتا کہ ہر سال کتنے طالب علم ممتحنین کی طبیعتوں کے اس آنی اتار چڑھاؤ کے باعث ناکامی کی صورت دیکھتے ہیں۔ ایسے امتحانات ترقی کے راہ بر نہیں بلکہ راہ زن ہیں!!

موجودہ زمانہ کے ماہران تعلیم نے اس خامی کو محسوس کر کے بالاتفاق اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ یہ خامیاں دور ہو سکتی ہیں بشرطیکہ

(۱) Moderation committee قائم کی جائیں۔

(۲) پرچہ سوالات کے مختلف اجزا کی انفرادی اہمیت کا پہلے ہی سے تصفیہ کر لیا جائے۔

(۳) کامیابی کا فی صد اوسط ہر سال بدلتا رہے تاکہ نتائج میں موسیقیت ہو کیونکہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر سال ایک ہی طبیعت کا ممتحن ہو، بعض ممتحن نرم دل ہوتے ہیں اور بعض سختی پسند۔

(۴) سب سے بڑھ کر یہ کہ سوالات کی اصلاح کی جائے۔

ان امور کو پیش نظر رکھ کر ہم اپنے موجودہ امتحانات میں بہت کچھ اصلاح کر کے انہیں سائنٹفک بنا سکتے ہیں لیکن مزید سائنٹفک رنگ دینے کے لئے ماہران تعلیم نے جدید طرز کے امتحان یعنی جدید امتحانات New Examinations کی بنیاد ڈالی ہے جن کی خاص خوبی یہ ہے کہ ان میں سوالات کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے جن کا جواب بہت ہی مختصر ہوتا ہے۔ وہ اس طرح سے کہ پرچہ سوالات میں سوال کے آگے چند متبادل صورتیں لکھ دی جاتی ہیں جن میں جواب بھی شامل ہوتا ہے طالب علم کو صرف صحیح یا غلط لکھنا پڑتا یا صرف چلیپا لگانا پڑتا ہے۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں کہیں ہر ایک میں اختصار کا پہلو مضمر ہوتا ہے۔ اس سے فائدہ یہ ہے کہ مدرس طلباء کی تقریباً پوری کسوبہ معلومات کا امتحان لے سکتا ہے ونیز سوالات کی ترتیب اور انتخاب بھی اس طرح کا ہوتا ہے کہ غبی طلباء کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اور ہوشیاروں کی غرور شکنی۔ ڈاکٹر بیلارڈ نے اس موضوع پر ایک کتاب نیا ممتحن New Examiner تصنیف کی ہے جو ہمارے لئے بہت کچھ رہبری کا کام دے سکتی ہے۔ ہمارے مدارس میں اگر اس طرز کے امتحانات رائج کئے جائیں تو بہت اچھا ہوگا۔ اس کے لئے شروع میں یہ طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے کہ مروجہ امتحانات کے ساتھ ساتھ اس طرز کے امتحانات بھی لئے جائیں اور رفتہ رفتہ ان کا رواج ہو جائے گا۔

حضرات! تجرباتی تعلیمی نفسیات کا ایک مختصر خاکہ اور ہمارے موجودہ تعلیمی نظام میں اس کی ضرورت اور اس کے فوائد آپ پر واضح کرنے کے بعد میں جناب صدر کے توسط سے کانفرنس کی توجہ چند تجاویز کی طرف منعطف کراتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ اس علم دوست حلقہ کی سربرآوردہ شخصیتیں جن میں عالی جناب خان فضل محمد خان صاحب ناظم تعلیمات ملک سرکار عالی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، اگر مناسب سمجھیں تو ان کے اجراء کے متعلق اپنی مفید امداد سے ملک کی فلاح و بہبود میں ترقی اور اپنی علم دوستی کا ثبوت دیں گے۔ میری تجاویز یہ ہیں۔

(۱) سب سے پہلے ایک تحقیقاتی بورڈ قایم کیا جائے جس کا کام اس امر پر غور کرنا ہوگا کہ کس حد تک جدید تعلیمی اصول جو تعلیمی نفسیات سے متعلق ہیں ہمارے ملک میں قابل عمل ہیں۔

(۲) اس بورڈ کا کام یہ ہوگا کہ وہ تمام مواد فراہم کرے جس کی اس سلسلہ میں ضرورت ہوگی مثلاً ذہنی آزمایشات، تعلیمی آزمایشات، خطاطی کے نمونے، جدید امتحان کے نمونے کے پرچے وغیرہ۔

(۳) اس بورڈ کے اراکین کا یہ فرض ہوگا کہ دورہ کر کے ان اصولوں کی اشاعت تمام مدارس میں کرے۔

روئداد مجلس تعلیم السنہ قدیم (کلاسیکل)

از جناب مولوی سید حسام الدین صاحب فاضل معتمد کمیٹی

ذیل کی رپورٹ میں گو السنۂ قدیم کو فرسٹ فارم سے لازمی قرار دینے کی تجویز پیش ہوئی ہے لیکن ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس مسئلہ پر ارکان کمیٹی متفق آلارا نہیں ہیں فقط

مدیر

تشکیل مجلس ہذا: (۱) جناب مولوی سید ہاشم صاحب جل اللیل میر مجلس (۲) محمد حسام الدین صاحب فاضل معتمد (۳) جناب مولوی سعادۃ اللہ خاں صاحب رکن (۴) جناب جی۔ اے چندر واکر صاحب رکن (۵) ریورنڈ فادر اسٹیفانٹی صاحب رکن (۶) ریورنڈ فادر واز صاحب رکن (۷) جناب مولوی محی الدین محمود صاحب رکن۔

اظہار افسوس۔ مجلس ہذا جناب مولوی سید ظہور علی صاحب کی وفات حسرت آیات پر اظہار

رنج وملال کرتی ہے جنہوں نے ابتداً مجلس ہذا کی میر مجلسی کے فرائض نہایت دلچسپی سے انجام دئیے۔ خدائے تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

تمہید

مجلس ہذا کے معزز اراکین نے اپنے فرائض بڑی دلچسپی اور خاص محنت وقابلیت سے انجام دئیے اور ہر ایک رکن نے مقررہ عنوان پر اپنا بیش بہا مضمون پیش کرکے دوسروں کو اظہار رائے کا آزادانہ موقع دیا۔ نیز انجمن اساتذہ کے ماہانہ جلسوں میں السنۂ قدیم کے متعلق جو تقریریں کی گئیں جن میں سے بعض جلسوں کی روئدادیں معتمد کے پاس وصول ہوئیں ان سے بھی ترتیب روئداد میں بڑی مدد ملی۔ لہذا یہ مجلس "تعلیم السنۂ علیٰ" کے متعلق اپنی مرتبہ روئداد اس کانفرنس میں پیش کرنے کی عزت حاصل کرتی ہے۔

کلاسیکل زبان کی تعریف

ہم دیکھتے ہیں کہ ادبیات کی ترقی وتوسیع کے زمانے میں ایک زرین دور شروع ہوتا ہے جس میں کوئی خاص زبان انتہائی ترقی حاصل کرلیتی ہے اور اس زبان کا لٹریچر نہایت ہی مکمل صورت اختیار کرلیتا ہے۔ پس وہ زبان جس کا لٹریچر اعلیٰ ترین درجے پر پہنچ گیا ہو اور تازہ اور جدید لٹریچر پر تفوق وبرتری رکھتا ہو کلاسیکل زبان کہلاتی ہے۔ کلاسیکل زبانیں مغرب میں لاطینی اور یونانی اور مشرق میں عربی، فارسی اور سنسکرت ہیں۔

السنۂ قدیم (کلاسیکل) کی ضرورت واہمیت

(۱) یورپ میں لاطینی اور یونانی زبانیں لازمی ہیں اسی اصول پر ہندوستان میں مغربی تعلیم کے رائج ہونے کے بعد بھی اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ مشرقی کلاسیکل زبانیں تعلیم میں داخل کی گئیں۔

(۲) ہر ایک طالب علم کے لئے اپنے مذہبی کتاب کی زبان جاننا ضروری ہے۔ اس لحاظ سے بھی عبرانی یا یونانی اور سنسکرت وعربی زبانیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

(۳) کلاسیکل زبانوں کی تعلیم سے طلبہ کے ذہن میں اور جودت وفہم میں خاص ترقی ہوتی ہے۔ عادات واطوار کی درستی۔ قوت فیصلہ ومتخیلہ کی تربیت میں ان زبانوں کو خاص دخل ہے۔ متقدمین کے اعلیٰ وارفع خیالات سے طلبہ واقف ہوتے ہیں اور ان کے دماغ زمانۂ گذشتہ کی دانشمندی کے ذخیرے سے بھر جاتے ہیں جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کے لڑکے زمانہ سلف سے دلچسپی لینے لگتے ہیں اور ان کے دل وطن اور قوم کی پاک اور گہری محبت کے جذبات سے معمور ہوجاتے ہیں۔ کلاسیکل زبان کا جدید زبان پر اچھا اثر مترتب ہوتا ہے اور وہ قدیم زبان کے متعلق اور دقیانوسی لغات سے ثقیل اور عسیر الفہم ہونے نہیں پاتی۔ قدیم روایات میں جو قیمتی سرمایہ موجود ہے اس میں تازہ روح پیدا ہوجاتی ہے اور اس کو جدید پیرائے میں منتقل کرلیا جاسکتا ہے۔

(۴) کلاسیکل تعلیم سے یہ فائدہ بھی ہے کہ طبقہ اناث و ذکور میں زبردست اور قابل مورّخین و ماہرین آثار قدیمہ علم اللسان کے علماء، فلاسفر و سیاحت داں نیز شاعر و انشاء پرداز پیدا ہو سکتے ہیں۔

آجکل طلبہ کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی ہے کہ حصول معاش کا واحد ذریعہ صرف اعلیٰ ریاضی کی تعلیم حاصل کرنا ہے چنانچہ اکثر و بیشتر طلبہ اعلیٰ ریاضی کا ہی شعبہ اختیار کر لیتے ہیں اور السنہ علمی کی تعلیم سے محروم رہتے ہیں اور صرف چند طلبہ جنہیں ریاضی سے زیادہ مس نہیں رہتا ادنیٰ ریاضی کے ساتھ السنہ علمی کی طرف راغب ہوتے ہیں جس سے ان زبانوں کے جاننے والوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے اور تعلیم السنہ پر بُرا اثر پڑ رہا ہے لہذا طلبہ کے اس غلط خیال کی اصلاح ضروری ہے۔ درحقیقت تعلیم السنہ بھی اعلیٰ ریاضی و اعلیٰ سائنس کی طرح حصول معاش کا بہترین ذریعہ ہو سکتا ہے۔ السنہ قدیم میں وہ خزانے موجود ہیں جن کے لینے کے لئے مستشرقین کوشش کر رہے ہیں۔ یورپ میں عربی اور سنسکرت کے لئے تحقیقی کام جاری ہے افسوس ہے کہ ہندوستانی السنہ قدیم کو غیر ضروری سمجھ کر ان میں کامل بننے کی کوشش کرتے ہیں نہ ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور یورپ کے مستشرقین عربی۔ فارسی۔ سنسکرت میں ماہر و کامل ہوتے ہیں یہاں تک کہ ایک ایک لفظ کے متعلق متعدد حوالے پیش کرتے ہیں چنانچہ ایک مستشرق نے ایک ہندوستانی اہل علم سے اثنائے گفتگو میں لفظ مسجد کے متعلق اتنے حوالے دیئے کہ یہ سن کر حیران ہو گئے۔

السنہ قدیم سے تاریخ کا تعلق تاریخ السنہ قدیم سے بنی ہے اور السنہ قدیم اپنے وجود میں تاریخ کی محتاج نہیں ہیں۔ تاریخ گذشتہ قوموں کے تمدن۔ معاشرت۔ عروج و زوال کا آئینہ ہوتی ہے۔ تاریخ کے بڑے بڑے ماخذ حسب ذیل ہیں۔

(۱) کتبات (۲) مذہبی کتابیں (۳) رزمیہ کتابیں (۴) ادبی کتابیں۔ اگر ان ماخذوں کو نکال دیا جائے تو تاریخ کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اس لحاظ سے السنہ قدیم تاریخ کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ اور قدم قدم پر اس کی ممد و معاون۔ اگر تاریخ میں غلط نویسی سے کام لیا جائے تو السنہ قدیم کی مدد اور ان زبانوں کے قدیم نسخوں اور خطوط و قراین وغیرہ سے ان غلط واقعات کو غلط ثابت کیا جا سکتا ہے جو مورخ کسی قدیم زبان سے واقف ہو کر کسی قوم کی تاریخ لکھتا ہے اس کے خیالات صحیح واقعات پر مبنی ہوتے ہیں۔ لہذا موجودہ زمانے کے مورخین کو چاہئے کہ السنہ قدیم سے واقفیت پیدا کریں اسی طرح تاریخ کے طالب علموں کے لئے السنہ قدیم سے واقف ہونا ضروری ہے کیونکہ تاریخ اور السنہ قدیم لازم ملزوم ہیں۔

اس قدر عرض کرنے کے بعد السنہ قدیم میں سے ہر ایک کے متعلق فرداً فرداً چند امور بیان

کئے جاتے ہیں

یونانی اور لاطینی

یونانی ولاطینی کی اہمیت

اگرچہ آجکل یونانی ولاطینی مردہ زبانوں میں شمار کی جاتی ہیں لیکن ایک زمانہ وہ تھا کہ لاطینی ویونانی جزو تعلیم سمجھی جاتی تھی۔ جامعوں کی زبان لاطینی تھی۔ یورپ کے ہر حصہ میں ادبی۔ سیاسی ومذہبی اغراض کے لئے لاطینی زبان مستعمل تھی۔ ہر شخص علم وتہذیب میں اسی وقت کامل سمجھا جاتا تھا جب یونانی ولاطینی میں مہارت رکھتا۔

ان دونوں زبانوں میں بے مثل ادبی خزانہ موجود ہیں پس انسانی فائدے کے مدنظر ان کی ضرورت باقی ہے۔ ان زبانوں کے مطالعے سے حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے تخیل واظہار کا ایک بہترین باب کھل جاتا ہے اگرچہ ان کے ترجموں سے بھی یہ بات حاصل ہوسکتی ہے۔ لیکن محض ترجموں کی مدد سے اصلی روح تک پہنچنا امر محال ہے۔ سائنس دانوں کے لئے وضع اصطلاحات میں ان زبانوں سے بڑی مدد ملتی ہے۔ موجودہ یورپی زبانوں میں ان کا اتنا بڑا حصہ ملا ہوا ہے کہ بغیر ان زبانوں کو جاننے کے مفہوم ٹھیک طور پر سمجھ میں نہیں آتا۔

ہندوستان میں کس حد تک ان زبانوں کی ضرورت ہے

ہندوستانی طلبہ کے نقطۂ نظر سے ان زبانوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے یہاں کے السنۂ قدیم عربی۔ فارسی۔ سنسکرت ان کی مذہبی زبانیں ہیں مذہبی سیاسی اخلاقی ومعاشرتی کتابیں ان کے ادب کا بہترین ذخیرہ ہیں۔ اس لئے ہندی طلبہ کو عربی فارسی سنسکرت سے دلچسپی ہوسکتی ہے نہ کہ یونانی ولاطینی سے۔ یورپی تعلیم میں وہاں کے طلبہ کے لئے جو درجہ لاطینی ویونانی رکھتے ہیں وہی درجہ سنسکرت۔ فارسی اور عربی کا ہندی طلبہ کے لئے موجود ہے۔ جس طرح ڈاکٹر اور وکیل یورپ میں وضع اصطلاحات کے لئے لاطینی ویونانی کی طرف بڑھتے ہیں اسی طرح ہندوستانی سنسکرت اور عربی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ انگلستان میں یونانی ولاطینی جن ضروریات کے تحت شریک نصاب کی گئی ہیں وہ ضروریات ہندوستان میں پائے نہیں جاتے ہندوستانی تہذیب ان زبانوں کے احسان سے بالکل خالی ہے۔ باوجود ان عذرات کے پھر بھی ہندوستان میں ان زبانوں کی ضرورت اس لئے باقی ہے کہ (۱) یہاں سے اکثر طلبہ ہر سال یورپ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے کے لئے جاتے ہیں۔ جہاں بعض شعبوں میں ان زبانوں کو لازمی رکھا گیا ہے۔ پس غیر ممالک میں تعلیم

پانے کے خواہشمند طلبہ کے لئے یہ زبانیں ضروری ہیں۔

(۲) ہندوستانی ڈاکٹر۔ کیمیا داں۔ ماہر علم نباتات وحیوانات کے لئے اصطلاحات کا بڑا ذخیرہ لاطینی ویونانی میں ملتا ہے۔ نئی نئی اصطلاحات اب تک لاطینی ویونانی سے وضع کی جا رہی ہیں

لاطینی ویونانی کو پسند عام بنانے کے ذرائع (۱) ایسے ماہرین ملازم رکھے جائیں جو ان زبانوں کی تعلیم زندہ زبانوں کی طرح دے سکیں۔ (۲) کسی مضمون کے عوض لاطینی ویونانی اختیار کرنے کی اجازت دی جائے۔ اور نصاب دقیق نہ ہو تاکہ ان زبانوں سے نفرت پیدا نہ ہو۔

(۳) تعلیم کے دلچسپ طریقے اختیار کئے جائیں تاکہ طلبہ میں دلچسپی بڑھے اور جس زبان کی تعلیم دینا ہو تو اس زبان میں بول چال بھی ضروری ہے۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے کوئی زبان مردہ نہیں کہلا سکتی۔

(۴) موجودہ زبانوں کی تعلیم جن طریقے سے دی جاتی ہے اس طرز پر درسی کتب لکھائی جائیں۔

(۵) جب تک طالب علم ملکی زبانوں اور انگریزی سے ایک حد تک واقفیت نہ پیدا کرلے لاطینی شروع نہ کرائی جائے۔ یعنے جماعت ہفتم تک اس کی تعلیم مسدود رکھی جائے۔

سنسکرت

سنسکرت کی اہمیت اگرچہ کہ سنسکرت مردہ زبانوں میں شمار کی جاتی ہے لیکن بہ چند وجوہ اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ (۱) سنسکرت کی ادبیات اپنی اہمیت اور علمی ذخیرے کے اعتبار سے ممتاز حیثیت رکھتی ہیں (۲) اس میں کئی علوم شامل ہیں مثلاً زبانوں کی تحلیل، منطق، فلسفہ وغیرہ (۳) ہندوستان کی زبانوں میں سنسکرت الفاظ کا عنصر غالب ہے۔ اس لئے ان زبانوں میں کمال حاصل کرنے کے لئے سنسکرت سے واقفیت ضروری ہے۔ (۴) یہ زبان ہندوستانی تخیل کا ایک بحر ناپیدا کنار ہے اور تہذیب وتمدن ہند کی روح رواں (۵) تاریخ وآثار قدیمہ کے لئے سنسکرت نہایت ضروری ہے۔ ہندوؤں کا تمام مذہبی خزانہ اسی زبان میں مدفون ہے۔

سنسکرت کی تعلیم کو وسعت دینے کے ذرائع (۱) حتی الامکان مدارس میں طرز جدید پر سنسکرت کی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے (۲) طلبہ کو خاص طور پر وظائف عطا کئے جائیں (۳) موجودہ نصاب تعلیم کی کم از کم اس طرح ترمیم کی جائے کہ وہ طلبہ جن کے مضامین اختیاری السنۂ جدیدہ ہوں ان کے لئے سنسکرت لازمی قرار دی جائے۔ السنہ کے گروپ میں کسی ہندوستانی مروجہ زبان کے ساتھ طالب علم سنسکرت یا کسی ادبی زبان کی تعلیم حاصل کرے۔

(۴) تمام مدارس میں سنسکرت کا طریقہ تعلیم یکساں ہو۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے موزوں کتابیں لکھی جائیں۔

(۵) سنسکرت کی تعلیم کا آغاز جماعت ہفتم سے کیا جائے۔ چار سال میں اس زبان پر عبور ہو سکتا ہے اور طلبہ پر زیادہ بار بھی نہ ہوگا۔

(۶) ہر سال کم از کم ایک طالب علم سنسکرت کی تکمیل کے لئے باعطائے وظیفہ تعلیمی بنارس یونیورسٹی بھیجا جائے۔

فارسی

زبان فارسی کی اہمیت فارسی زبان السنۂ قدیم میں داخل ہے اور زندہ زبان ہے۔ چنانچہ یورپ کے ساحل البانیہ سے لے کر چینی ترکستان (کاشغر) تک اس زبان کا بولنے والا بلا تکلف سفر کر سکتا ہے۔ جو حیثیت فرنچ کو مغرب میں حاصل ہے وہی حیثیت فارسی کو مشرق کے ایک بڑے حصہ میں ہے۔ وسط ایشیا ایران اور افغانستان میں علمی معاشی اور سیاسی مسائل کی ترجمانی اسی زبان فارسی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ فارسی علم ادب کو فراموش کر دینا ایرانی دماغ وجذبات کے اکثر مخصوص اور اہم انکشافات کو بھلا دینا ہے۔

فارسی شاعری چونکہ خاک ایران ہمیشہ ہی سے فنون لطیفہ کی قابلیت میں ممتاز رہی ہے علی الخصوص شاعری تو گویا اس کے خمیر میں داخل ہے اس لئے اس میں ایسی کچھ ترقی ہوئی کہ آج عربی کے سوا تمام دنیا کی شاعری ایک طرف اور صرف فارسی کی شاعری ایک طرف۔ فارسی شاعری کو دنیائے ادب میں ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔ فارسی شعرا نے شاعری کی ہر صنف کو اوج کمال پر پہنچا دیا اور اس کو اس قابل بنا دیا کہ جس قسم کے مطالب چاہیں بے کم وکاست ادا کر سکیں۔ واقعہ نگاری معاملہ بندی۔ اظہار جذبات۔ قدرتی مناظر۔ فلسفیانہ اور حکیمانہ تخیلات غرض سب ہی اس میں پائے جاتے ہیں۔ اگر اس زبردست اور معجز نما شاعری کے بحر ذخار میں شناوری کی جائے تو عجیب عجیب جواہر گراں مایہ کا پتہ چلتا ہے۔ فارسی شعرائے متقدمین ومتاخرین کی معجز نمائی وشیریں کلامی محتاج بیان نہیں۔

فارسی کی خصوصیات فارسی کی لطافتوں اور نزاکتوں کی ایک عالم میں دھوم ہے۔ جہاں تک زبان کی شیرینی اور نزاکت کا تعلق ہے دنیا کی کوئی زبان بہ مشکل فارسی کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ فارسی زبان عجیب وغریب دلآویز اور سحر کار اثرات کی مالک ہے۔ مشہور انگریز مستشرق پروفیسر

پروفیسر براؤن جن کی عمر کا ایک بڑا حصہ محض فارسی زبان اور ایرانی معاشرت کے مطالعہ میں گزرا ہے بجا طور پر فرماتے ہیں کہ "فارسی زبان گویا ایک چمن ہے جس میں مختلف قسم کے گلہائے رنگیں اپنی مخصوص دلربایانہ اداؤں سے متبسم ہیں اس کے شیریں و لطیف استعارے تشبیہات اور محاورے گویا خوشنما کیاریاں ہیں جو اپنے اندر بے حد دلفریبی و رعنائی رکھتی ہیں" موسیو لیبان کہتا ہے "بلحاظ شستگی و دلکشی مشرق میں فارسی زبان کا وہی درجہ ہو سکتا ہے جو مغرب میں فرنچ کو اس کی لطافت کے لحاظ سے حاصل ہے"

فارسی کی ہمہ گیری

فارسی کی اخلاقی کتابوں کے ترجمے تو یورپ کی زبانوں میں بھی ہو چکے ہیں۔ مگر ان سے قطع نظر منطق۔ فلسفہ۔ الٰہیات۔ طبعیات۔ ریاضیات۔ فلکیات (ہیئت) جیسے جلیل القدر علوم جن کی مسلمانوں نے ایک زبردست خدمت انجام دی ہے فارسی میں ان کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ مشہور علما مثلاً بو علی سینا محقق نصیر الدین طوسی قطب الدین رازی امام ابو نصر فاریابی۔ ملا باقر داماد نے جس طرح علوم متذکرہ میں عربی تصنیفیں چھوڑی ہیں۔ اسی طرح ان علوم میں ان کی مبسوط تصانیف فارسی میں بھی موجود ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سی علمی ادبی کتابوں کے ترجمے بھی مختلف زبانوں سے فارسی میں ہو چکے ہیں۔

مختصر یہ کہ عربی کے بعد بڑا علمی و ادبی ذخیرہ فارسی میں موجود ہے۔ اس لحاظ سے عربی کے بعد فارسی کی اہمیت بالکل مسلمہ ہے۔ فارسی کا تعلق نہ صرف مسلمانوں سے ہے بلکہ یہ پارسیوں کی بھی قدیم قومی زبان ہے۔

ہندوستان میں فارسی کو سرکاری و دفتری زبان ہونے کا بھی شرف حاصل رہ چکا ہے۔ اور جب اردو عالم وجود میں آئی تو اس میں عربی و ترکی کے علاوہ فارسی الفاظ و مشتقات کا بہت بڑا ذخیرہ داخل ہو گیا اردو زبان میں عربی و فارسی کے الفاظ صرف بیل بوٹے ہی کا کام نہیں دیتے بلکہ ابتدا سے وہ اردو ادب و شاعری کی جان ہیں جو اس کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہیں اردو میں اعلیٰ و لطیف جذبات بلند و نازک خیالات کی ترجمانی کیلئے فارسی الفاظ ناگزیر ہیں۔ اردو شاعری میں فارسی الفاظ کی شیرینی و شگفتگی اور اس کی دلآویز و لطیف ترکیبوں کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ فارسی اضافت۔ فارسی حروف عطف اور فارسی نازک و لطیف ترکیبوں کے ذریعہ شاعر کو اختصار پیدا کرنے میں سہولت واقع ہوتی ہے۔

غرض فارسی میں اب بھی ویسی ہی ہمہ گیری اور قوت تجاذب موجود ہے جو دنیا کی اور علمی زبانوں میں ہے۔

طریقۂ تعلیم:۔ زبان فارسی کی تعلیم میں حسب ذیل امور ملحوظ رکھے جائیں۔

(۱) ہر مدرسہ میں طرز جدید فارسی کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ اور اس زبان میں طلبہ سے بول چال بھی کرائی جائے۔

(۲) طلبہ کی دلچسپی کے لئے تعلیم کے وہی آسان و سہل طریقے اختیار کئے جائیں جو اب انگریزی اور اردو کے لئے عمل میں لائے جا رہے ہیں۔

(۳) طلبہ کو شوق دلانے کے لئے وظائف بھی مقرر کئے جائیں۔

(۴) فارسی مضمون نویسی کے انعامات کا انتظام ہو۔

(۵) قواعد کو آسان سے آسان تر اور ساتھ ہی دلچسپ طریقہ پر ذہن نشیں کیا جائے۔

(۶) فارسی بہت چھوٹی جماعت سے لے کر کم از کم چوتھی یا پانچویں جماعت تک تمام طلبہ کے لئے لازمی ہونی چاہیئے۔ کیونکہ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے معمولی اردو کے لئے بھی فارسی از حد ضروری ہے۔

عربی

عربی زبان کی اہمیت عربی زبان ایک قدیم اور مکمل صرف و نحو رکھنے والی زبان ہے۔ عربوں کی حکومت جب دور دراز مقامات پر پھیل گئی تو اس زبان کو اپنی فطری بلاغت اور ادبی محاسن کے علاوہ علوم و فنون پر بھی قبضہ کرنے کا شوق پیدا ہوا چنانچہ عربوں نے یونانی علوم و فنون کا کل ذخیرہ اپنی زبان میں منتقل کر لیا۔ یہاں تک کہ یورپ بھی ان ہی کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوا۔ اسلام کو جاننے اور سمجھنے اور اسلامی تاریخ سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے عربی کا سیکھنا نہایت ضروری ہے۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کا ضروری عنصر بن گئی ہے۔

مسلمانوں کا تعلق عربی سے دنیا میں مسلمان جہاں کہیں بھی رہیں اور جس زبان میں بھی گفتگو کریں عربی زبان سے ان کا تعلق کسی طرح منقطع نہیں ہو سکتا۔ اور وہ بہر طور گویا ان کے لئے لازمی زبان ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن مجید عربی میں ہے۔ اور تمام مذہبی مسائل و احکام اور اخلاق و آداب بھی مکمل صورت میں عربی زبان ہی میں ہیں جن سے واقفیت بغیر ایک مسلمان کامل مسلمان ہو ہی نہیں سکتا۔ اور دین کی بہتری دنیا کی خوبی ان کے جاننے پر موقوف ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ترجمے کے ذریعے یہی بات حاصل ہو سکتی ہے اس لئے کہ اصل و نقل میں بڑا فرق ہے ع بات تیری تجھ میں ہے تصویر کی تصویر میں۔ محض ترجموں سے کبھی

وہ فوائد حاصل نہیں ہو سکتے جو خاص زبان کے جاننے سے حاصل ہوتے ہیں پس جو لوگ عربی ادب سے
خود واقف ہو کر قرآن مجید اور عربی کتب پڑھیں گے وہی خاطر خواہ مستفید ہو سکیں گے۔

عربی زندہ زبان ہے

اور حقیقت یہ ہے کہ قدیم زبانوں میں صرف عربی ہی جو زبان بولی جاتی ہے
وہ زندہ زبان ہے جو آج تک دنیا میں رائج ہے۔ تمام بلاد عربیہ مصر۔ سوڈان
شام فلسطین اور عراق میں عربی کو ملکی کاروباری اور سیاسی زبان ہونے کا مرتبہ حاصل ہے۔ ان کے
علاوہ فارسی ممالک میں بھی اس زبان کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ چنانچہ عربی فتوحات کے زمانے
میں جب ایران کی تقریباً پوری قوم حلقہ بگوش اسلام ہوگئی تو فارسی کی جگہ سرکاری اور علمی زبان عربی
ہوگئی۔ چنانچہ اس زمانے میں اکثر فارسی علمی و ادبی ذخائر کا ترجمہ عربی میں ہوا۔ اس عربی تہذیب و
زبان نے ایران اور اہل ایران پر وہ دیرپا اور گہرا اثر چھوڑا ہے کہ بقول جرمن پروفیسر نولدیکی
کے یونانیت چھ سو برس کے طویل عرصہ میں فارسی معاشرت و زبان پر سطحی اثر بھی نہ ڈال سکی بخلاف
اسلام کے کہ عربی مذہب اور عربی طرز معاشرت فارسیت کے جسم میں لہو بن کر موج زن ہے۔ اور
اب فارسی سے عربی کا اخراج بقول پروفیسر براؤن کے ایسا ناممکن ہے جیسے انگریزی زبان سے
فرانسیسی لاطینی اور یونانی الفاظ کا اخراج اور اس لحاظ سے کہ تمام مسلمانوں کی یہ مذہبی زبان ہے
دنیا کے ان تمام حصوں کو اس سے گہرا تعلق ہے جہاں اسلامی آبادی ہے۔ ہندوستان میں کم
وبیش سات کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ اس لئے ہندوستان کو عربی سے بڑا تعلق ہے۔

ہر ایک اردو داں کو عربی سے واقف ہونا ضروری ہے

جس مقام پر مختلف زبانیں بولنے والے رہتے ہیں وہاں ایک زبان کے الفاظ
دوسری زبان میں مل جانا لازمی امر ہے۔ ہندوستان میں اردو کی پیدائش
متعدد زبانوں کے اختلاط سے ہوئی ہے۔ یہ زبان اپنی متوسط رفتار سے
ہندوستان کی ہر سمت میں پہنچ گئی ہے۔ اور اس کا مستقبل اور بھی شاندار
نظر آرہا ہے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے علاقوں میں اردو اچھی طرح بولی جاتی ہے خصوصاً
تاجدار دکن سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کے مبارک عہد میں جامعہ عثمانیہ کی تاسیس نے
اردو کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ جب اردو ہندوستان کی عام زبان بن گئی ہے تو دیکھنا یہ ہے
کہ یہ کن کن زبانوں کی رہین منت ہے۔ اور کس کا بار احسان اس پر سب سے زیادہ ہے اردو
میں عربی۔ فارسی۔ سنسکرت۔ انگریزی وغیرہ وغیرہ کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ لیکن عربی کے
الفاظ اس کثرت سے داخل ہیں کہ اردو زبان کی دو تین سطریں بھی کوئی شخص عربی زبان کی

منت کشی کے بغیر لکھ سکے گا نہ تین چار جملے بیان کر سکے گا۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی زبان کا لطف ادب جب تک اس کے لغوی تحقیقات سے آشنائی نہ ہو حقیقی طور پر حاصل نہیں ہو سکتا۔ نیز اکثر و بیشتر علوم و فنون اصطلاحیں عربی میں ہیں اس لئے عربی سے ناواقفیت کی وجہ اکثر تعلیم یافتہ حضرات بھی الفاظ کے استعمال میں غلطی کر جاتے ہیں اس طرح غلط الفاظ وقتاً فوقتاً شائع و ذائع ہوتے رہتے ہیں مثلاً بحیرہ۔ مثلث۔ منطقہ وغیرہ بجائے بحیرہ اور مثلث۔ منطقہ کے اس نقطہ نظر سے بھی ہر اردو داں کو عربی سے واقف ہونے کی سخت ضرورت ہے لہذا ہندوستان کے ایک بڑے حصے کو عربی کی طرف توجہ کرنا اردو ادب سے واقفیت کے اہم فریضے سے سبکدوش ہونے کے لئے نہایت ضروری ہے۔

عربی سے بے اعتنائی کے نقصانات عربی سے بے اعتنائی کا ایک صریح نقصان یہ ہے کہ عربی کا ناواقف اردو کا ادیب نہیں کہلا سکتا خواہ وہ کتنا ہی اردو کا ماہر کیوں نہ ہو۔ یہ عام نقصان ہے جو اگرچہ صرف ایک جملے میں دکھایا گیا ہے۔ لیکن اس کے مختلف پہلوؤں پر عمیق نظر ڈالی جائے تو اس جملے کی صداقت اور بھی عیاں ہو جائے گی۔

خاص نقصان مذہبی اور اخلاقی نقصان ہے جو مسلمانوں سے متعلق ہے۔ کیونکہ جو مسافر اپنے رہنما کی زبان سے واقف نہ ہو یقیناً اس کے حق میں راستے کی صعوبتیں بڑھ جائیں گی حقیقت یہ ہے کہ عربی سے ناواقفیت ایک مسلمان کو ان تمام بیش بہا مذہبی معلومات سے محروم رکھتی ہے جن کا جاننا کامل انسان ہونے اور اخلاق حسنہ پیدا کرنے کے لئے ازبس ضروری ہے۔ عربی علم سے محرومی مذہبی امور سے ناواقفیت کا باعث ہوتی ہے۔ جس کے نتائج بے اصول طرز زندگی۔ بد اخلاقی بیجا تعصب۔ پوچ اعتراضات۔ باہمی نفاق و منافرت اور دیگر نقصان دہ امور کی شکل میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ عربی کے نہ جاننے کا ایک بدیہی نقصان یہ بھی ہے کہ ان تمام علمی خزانوں سے محرومی اور اپنے بزرگوں کے کارناموں سے ناواقفیت رہتی ہے جن کا جاننا ذہنی تربیت حقیقی جودت اور قومی وقار برقرار رکھنے کے لئے ازبس ضروری ہے۔

عربی زبان مسلمانوں کیلئے لازمی کردیجائے زبان عربی ایک مکمل اور نہایت وسیع زبان ہے۔ اس کے قواعد صرف و نحو کی بے نظیر باضابطگی اور الفاظ و معانی کی کثرت اس کی شاہد ہے۔ لیکن جس قدر یہ زبان اہمیت رکھتی ہے اسی قدر اس کا طرز تعلیم بھی اہمیت رکھتا ہے۔ باقاعدہ اور آسان اصولوں سے اگر اس کی تعلیم نہ دی جائے تو قریباً عسیر الحصول ہو جاتی ہے۔ طرز تعلیم جس قدر آسان بنایا جائے گا اسی قدر زبان کی اشاعت متوقع ہو گی۔ اس حقیقت

سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب صحیح اصول سے تعلیم دی گئی ہے تو بعض عمر رسیدہ حضرات بھی مہینوں میں عربی سے ایک حد تک واقفیت پیدا کر چکے ہیں۔ بسا اوقات غلط شہرت بھی بڑا نقصان پہنچاتی ہے عربی زبان کے متعلق یہ مشہور ہو گیا ہے کہ بہت ہی دشوار اور عسیر الحصول زبان ہے۔ اسی غلط شہرت کی بناء پر عام طور پر عربی کی طرف متوجہ ہونا اور اس کے حاصل کرنے کے لئے وقت نکالنا پسند خاطر نہیں معلوم ہوتا اور طلبہ یا تو خود ہی یا کسی کے سمجھا دینے سے عربی کو زبان دوم کے طور پر اختیار کرنے سے بھی گریز کر جاتے ہیں۔ ان کی یہ ابتدائی غلط فہمی ہمیشہ کے لئے انہیں عربی علوم کے قابل قدر خزانوں سے محروم کر دیتی ہے۔ درحقیقت عربی بھی ویسی ہی ایک زبان ہے جیسی دنیا میں اور زبانیں ہیں۔ بلکہ اس کا حصول بہ نسبت ان زبانوں کے جن کے قواعد مکمل نہیں ہیں بہت آسان ہے باوجود آسانی کے اس زبان کو مشکل قرار دے کر اس کی طرف ملتفت نہ ہونا کوتاہ بینی ہے۔ بعض طبائع کی یہ متضاد باتیں سمجھ سے باہر ہیں کہ جب ان کے پاس مثلاً ان کے بچوں کو عربی تعلیم دلانے کا مسئلہ پیش ہوتا ہے تو اس کو آسان اور مستعمل زبانوں میں شامل کر کے معمولی قابلیت کے اساتذہ کی تلاش کی جاتی ہے اور جب اس کی تعلیم کی طرف زور دیا جاتا ہے تو یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ مشکل زبان ہے کون اس کی طرف توجہ کرے۔

الغرض عربی زبان سہل الحصول اور کثیر المنفعت زبان ہے۔ دوسری زبانوں کے ساتھ عربی ادب کی تعلیم دلانا ذوق سلیم کو ایک بڑی نعمت سے محروم رکھنا ہے۔

ہماری رائے میں جیسا کہ یورپ کے مدارس میں زیادہ تر لاطینی اور کہیں یونانی لازمی ہے اسی طرح تمام مسلمان طلبہ کے لئے کم سے کم جماعت پنجم سے عربی زبان لازمی قرار دی جائے تو بہت مناسب ہے۔ سوم و چہارم میں ابتدائی فارسی کی تعلیم سے عربی سمجھنے کی استعداد پیدا ہو جائے گی اور آئندہ عربی تعلیم میں مہارت پیدا ہونے سے فارسی خود بخود آسان ہوگی۔ یہ تجربہ ہے کہ عربی کا عالم زبان فارسی پر ذرا سی توجہ میں کافی عبور حاصل کر سکتا ہے۔ اس طرح عربی تعلیم کا لازم کر دینا بہ یک کرشمہ دو کار کے مصداق گویا عربی و فارسی دونوں میں کامل بنانا اور اردو کی مہارت میں کافی مدد پہنچانا ہے۔

عربی تعلیم اس اصول پر دی جانی چاہئے کہ طلبہ میٹرک تک تعلیم پانے کے بعد کم از کم اتنی عربی بول سکیں جتنی کہ انگریزی بول لیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزی معلم جتنے گھنٹے کام کر کے طلبہ کو انگریزی بول چال سکھاتے ہیں عربی معلم اتنے ہی گھنٹے کام کر کے اتنی بول چال نہیں سکھاتے۔ درحقیقت یہ تعلیم کا قصور نہیں ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ جو زبان لازمی قرار دی جائے اور اس کی کامیابی بغیر

طالب علم کو سند نہیں ملتی تو اس کی طرف طلبہ بہت زیادہ توجہ مبذول کرتے ہیں۔ جو زبان ایسی نہ ہو اس کی اہمیت کو کم سمجھتے ہیں۔ نہایت وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر عربی کو انگریزی کا درجہ اور اہمیت دی جائے اور تعلیمی گھنٹے ہر دو زبانوں کے مساوی رہیں تو عربی میں طلبہ انگریزی کے موافق بلکہ اس سے بہت زیادہ مہارت حاصل کر لیں گے۔ کیونکہ اب بھی اس بے توجہی کے باوجود جو عام طور پر پائی جاتی ہے طلبہ عربی میں دو چار سال میں اتنی لیاقت ضرور حاصل کر لیتے ہیں جو اس سے زیادہ مدت میں انگریزی میں حاصل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ عربی زبان کی طرف موانع کے باوجود طلبہ میں فطری میلان پایا جاتا ہے۔

نصاب تعلیم طلبہ میں عربی سے خاطر خواہ دلچسپی پیدا نہ ہونے کا بڑا سبب نصاب کی خرابی ہے۔ ایک ایسے مکمل نصاب کی ضرورت ہے جو جماعت پنجم سے میٹرک تک ہر جماعت کی قابلیت کے لحاظ سے تیار کیا گیا ہو۔ پہلی کتاب روزمرہ کی معمولی گفتگو اور آسان آسان جملوں پر مشتمل ہو اور ماضی مضارع کی گردانوں کا استعمال جملوں میں اس طرح کیا جائے کہ طلبہ قواعد کی خشکی محسوس کئے بغیر ان سے واقف ہو جائیں نیز نصیحت آمیز اور اخلاقی فقرے بیان کئے جائیں دوسری کتاب میں پُر لطف حکایتیں نتیجہ خیز قصے اسماء افعال کے اشتقاقات اور گردانوں پر توجہ دلائی جائے اور ایک مختصر قواعد کی کتاب جس کا طرز بیان دلچسپ اور قواعد آسان پیرائے میں بیان کئے گئے ہوں شریک نصاب کی جائے غرض ہر ادبی کتاب دلچسپ مضامین سے مملو ہے اور قرآن مجید کی حسب استعداد آیتوں آسان احادیث اخلاقی حکایات حکمت کی باتوں اور نتیجہ خیز اشعار پر حاوی ہو۔

ایسی کتابیں جن میں پیچیدہ عبارات اور لمبے لمبے جملے ہوں طلبہ کی ذہنیت پر بُرا اثر ڈالتی ہیں صرف و نحو کی کتابیں مادری زبان میں ہوں اور صرف ان میں نہایت ضروری مسائل بیان کئے جائیں اور حکایات وغیرہ سے دلچسپی پیدا کی جائے۔ تا کہ طلبہ کو قواعد سے خاص دلچسپی پیدا ہو سکے

اساتذہ اور طلبہ کو مصر بھیجا جائے سالہائے سال سے ہماری علم دوست سرکار طلبہ کو وظائف دیکر مختلف علوم و فنون کی تکمیل کے لئے بیرون ممالک بھیجا کرتی ہے۔ عربی زبان اپنی ہمہ گیری اور فصاحت و بلاغت اور دیگر خصوصیات کے لحاظ سے اس کی مستحق ہے کہ اس کی تعلیم و تکمیل کی طرف خاص توجہ فرمائی جائے۔ اور ہر سال منتخب طلبہ و اساتذہ میں سے کم از کم ایک ایک کو باعطائے وظیفہ تعلیمی مصر روانہ فرمایا جائے تا کہ اس قسم کی تعلیم یافتہ ہستیاں ملک میں عربی زبان کا مزید صحیح ذوق پیدا کر سکیں فقط

روداد ضمنی جلسہ السنۂ قدیم

از جناب مولوی سید حسام الدین صاحب فاضل معتمد مجلس

بتاریخ ۱۰ آبان ۱۳۴۱ف روز پنجشنبہ بوقت ۲ ساعت بمقام سٹی کالج ضمنی جلسہ السنۂ قدیم بصدارت جناب ڈاکٹر عبد الحق صاحب ڈی فل (آکسن)، پروفیسر عربی جامعہ عثمانیہ منعقد ہوا جس میں السنۂ علمیہ سے دلچسپی رکھنے والے مدرسین کرام کا کثیر حصہ شریک تھا۔

تلاوت آیات قرآنی سے جلسہ کا آغاز کیا گیا۔ بعد ازاں محمد حسام الدین فاضل معتمد مجلس السنہ علمی نے مجلس کی مکمل روداد سنائی جو عام طور پر پسند کی گئی جس کا ملخص عرض خدمت ہے۔

اس کے بعد جناب صدر نشین صاحب نے مختصر تقریر فرمائی جس میں ارشاد فرمایا کہ جنگ عظیم کے قبل گورنمنٹ نے ایک کمیٹی مقرر کی تھی کہ السنۂ قدیم پر رپورٹ لکھیں اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں یہ بیان کیا تھا کہ السنۂ قدیم کے ساتھ دوسرے علوم کی تعلیم پانے والے طلبہ اور ان زبانوں سے واقفت نہ رکھنے والے طالب علموں میں کیا فرق رہتا ہے پہلی قسم کے طالب علم مختصر الفاظ میں بہت کچھ بیان کر جاتے ہیں۔ کیونکہ صرف ونحو منطق وغیرہ کی وجہ کمال حاصل ہوتا ہے۔ جناب صدر نے فرمایا صرف یہی نہیں بلکہ جیسا کہ مجلس السنہ کی رپورٹ سے ظاہر ہے۔ السنۂ علمی میں وہ خزانے موجود ہیں جن کے لینے کے لئے مستشرقین کوشش کر رہے ہیں یورپ میں سنسکرت اور عربی کے لئے تحقیق کام جاری ہے اور وہ ان قلمی عربی کتابوں کا ترجمہ کر رہے ہیں جو آج تک طبع نہ ہو سکی ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس سے اپنے علوم اور قوم کو بہت فائدہ ہے۔ یورپ میں سنسکرت اور عربی کی تعلیم جاری ہے۔ تحصیل علم کا منشا تحصیل معاش نہ ہونا چاہئے بلکہ ہمارا مقصد اپنے بزرگوں کی طرح حصول علم سے تہذیب نفس اور قومی فائدہ رسانی ہونا چاہئے۔

تقریر صدارت کے بعد روداد مجلس السنۂ علمی کی حسب ذیل تجاویز جو اس نے اپنی روداد میں کامل غور و خوض کے بعد پیش کی تھیں جلسے میں فرداً فرداً جناب صدر ممدوح نے بغرض منظوری بیان فرمائیں۔

تجاویز:۔

(۱) جب تک کوئی کلاسیکل زبان طلبہ پر لازم نہ قرار دی جائے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ طلبہ ادُھر متوجہ ہوں لہذا مجلس ہذا کی قطعی رائے ہے کہ ہر ایک ہندو طالب علم کے لئے خواہ وہ فوقانی طبقے میں اعلیٰ ریاضی لے یا ادنیٰ بہر حال سنسکرت لازم کردی جائے اور اس کی تعلیم کا آغاز جماعت ہفتم سے ہو۔ اسی طرح ہر مسلم طالب علم کے لئے خواہ وہ اعلیٰ ریاضی کا شعبہ اختیار کرے یا ادنیٰ ریاضی کا بہر طور عربی زبان لازم کردی جائے اور عربی تعلیم کی ابتدا جماعت پنجم سے کی جائے۔

اس لزوم کے باوجود مسلم طلبہ کو سنسکرت اور غیر مسلم طالب علموں کو عربی بطور زبان اختیاری لینے کی عام اجازت رہے۔

(۲) سنسکرت اور عربی کو لازم قرار دے کر مجلس ہذا یہ استدعا کرتی ہے کہ مجلس نصاب۔ ان زبانوں کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے نصاب موجودہ میں ایسی خاص رعایت فرمائے کہ ان ہر دو زبانوں میں سے کسی ایک کی تعلیم کے ساتھ طلبہ پر دیگر مضامین کی تعلیم ناقابل برداشت بار نہ ہو۔

(۳) زبان فارسی کی اہمیت کے لحاظ سے اس مجلس کی رائے ہے کہ آجکل جس طرح نصاب اعلیٰ ریاضی میں فارسی نہیں ہے اور شعبہ دینیات میں اردو شریک نہیں ہے۔ اسی طرح یہ کیا جائے کہ جو طلبہ عربی کے ساتھ زبان فارسی بھی لینی چاہیں ان کے لئے اردو کے عوض فارسی لازم قرار دی جائے اور جماعت سوم و چہارم میں فارسی ہر اس طالب علم کے لئے جس کی مادری زبان اردو ہے زبان لازمی قرار دی جائے اس کے باوجود اگر ان جماعتوں میں کوئی طالب علم باوجود اردو مادری زبان ہونے کے فارسی لینا چاہے تو بطور زبان اختیاری لے سکتا ہے۔

ان تجاویز میں سے اس جلسہ میں پہلی تجویز بعد بحث و مباحثہ باغلب آرا منظور ہوئی دوسری تجویز بالاتفاق منظور کی گئی۔ تیسری تجویز اس ترمیم کے ساتھ منظور ہوئی کہ جماعت سوم و چہارم میں فارسی ہر اس طالب علم کے لئے جس کی مادری زبان اردو ہے زبان لازمی قرار دی جائے۔ اس کے باوجود اگر ان جماعتوں میں کوئی طالب علم باوجود اردو مادری زبان نہ ہونے کے فارسی لینی چاہے تو بطور زبان اختیاری لے سکتا ہے۔

اس قدر کارروائی کے بعد جناب صدر نشین صاحب کے شکریہ کے ساتھ جلسہ ½۴ بجے برخاست ہوا فقط

شذرات

ڈیویژن افسر تعلقہ لنگسگور کی تعلیمی ہمدردی یہ خبر باعث مسرت و امتنان ہے کہ مولوی کلیم اللہ صاحب ڈیویژن افسر لنگسگور نے اپنے دورہ سندھنور کے موقعہ پر مدرسہ وسطانیہ سندھنور کے غریب طلبہ کے لئے مبلغ (عمہ) روپیہ عثمانیہ اور پانچ آنہ کلدار مرحمت فرمایا اس عطیہ سے نادر طلبہ کو سلیٹ۔ کاپی۔ قلم۔ کتابیں دلائی گئیں۔ ایک لڑکا مسمی محمد حسین جو ایک یتیم و لیسیر ذہین فسٹ فارم کا طالب علم ہے اس کو اپنے سامنے بلوا کر بہ نفس نفیس اس کی حالات کا معائنہ فرمایا جس کی کیفیت سے متاثر ہو کر اس کی تعلیمی اغراض کو دوامًا تا ختم تعلیم پوری فرماتے رہنے کا وعدہ نہایت فراخدلی کے ساتھ فرمایا اور اسی وقت مبلغ پندرہ سکہ عثمانیہ فراہمی کتب درسی کے لئے عطا فرمایا۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء

مدرسہ وسطانیہ سرپاپٹھ میں وداعی جلسہ بتاریخ ۲۳ ر مہر ۱۳۴۱ ف معزز رعایا، مقامی وکلاء، اور اراکین کلب کی جانب سے بصدارت جناب مسٹر سری دھر راؤ صاحب تحصیلدار سرپاپٹھ جناب مولوی افتخار علی خاں صاحب بی۔ اے صدر مدرس کے دس سالہ خدمات کے اعتراف میں ایک پارٹی ترتیب دی گئی تھی جس میں صاحب ممدوح کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے اور ناقابل فراموش کام کی ستائش کی گئی اور ان کے تبدیل بمدرسہ فوقانیہ نانڈیڑ پر اظہار رنج و افسوس کیا گیا۔ چاء، شیرینی اور فواکہات کا معقول انتظام تھا۔

موصوف کے اعزاز میں بتاریخ مہر ۱۳۴۱ ف طلباء مدرسہ نے بھی ایک جلسہ کا انتظام بصدارت جناب ڈیویژنل افسر صاحب آبپاشی و تعمیرات سرپاپٹھ کیا تھا۔ طلباء نے ان کے ان گنت احسانات کا (جو مدرسہ اور طلباء پر آپ نے فرمائے تھے) ذکر کرتے ہوئے آپ کے تبدیل پر اپنے گہرے رنج و ملال کا اظہار کیا اور ایک قیمتی فونٹن پن پیش کرتے ہوئے اس کو بطور یادگار قبول کرنے کی استدعا کی۔ چاء، بسکٹ و شیرینی سے معزز سرکار کی تواضع کی گئی۔

اسٹاف مدرسہ کی جانب سے بصدارت جناب مولوی احمد شفیع صاحب بی۔ اے بیرسٹر ایٹ لا منصف سرپاپٹھ ایک اور وداعی جلسہ ترتیب دیا گیا تھا جس میں معزز رعایا۔ وکلاء و عہدہ داران

مقامی شریک تھے مقررین نے آپ کے کارنمایاں کا اظہار کیا اور مدرسہ نے جو تعلیمی و تعدادی ترقی آپ کے زمانے میں حاصل کی اس سے عام لوگوں کو روشناس کرایا۔ اور آپ کی جدائی و تبدل پر اپنے جذبات کا اظہار کیا ایک گھڑی بطور یادگار پیش کی۔ حاضرین و شرکاء جلسہ کی چا، فواکہات سے تواضع کی گئی اور نہایت ہی خوبی و ترتیب سے یہ جلسہ اختتام کو پہنچا۔

جلسۂ تعلیمی مدرسۂ چنا ملا ریڈی

بتاریخ ۱ر آبان ۱۳۴۱ف بہ سرپرستی جناب نرزنگ راؤ صاحب پٹواری سکنہ ہذا مدرسہ لوکل فنڈ چنا ملا ریڈی تعلقہ کاما ریڈی کا تعلیمی جلسہ زیر صدارت عالیجناب مولوی مرزا ابراہیم علی بیگ صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ناظر تعلیمات مکان مدرسہ میں منعقد کیا گیا۔ مکان مدرسہ آراستہ و پیراستہ تھا۔ بیرون مدرسہ میں مختلف رنگ کی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ ٹھیک ۳ بجے طلباء مدرسہ پرچم آصفی لئے ہوئے اپنے بادشاہ ذیجاہ کی درازیٔ عمر کے گیت گاتے ہوئے آبادی کا چکر کاٹ کر مدرسہ پہونچے۔ جہاں عوام کا مجمع تھا۔

تاریخ مذکور میں باوجود بارش سخت ہونے کے شرکاء جلسہ کی اچھی خاصی تعداد رہی۔ ۴ بجے سے جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ معزز صدر کرسی صدارت کو زینت بخشنے کے بعد رعایا کی جانب سے پھول کے ہار پہنائے گئے اس رسم کی ادائی کے بعد مولوی قاضی ملک محمد صدیق صاحب صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ درجہ اول قصبہ راجم پیٹھ نے خوش الحانی سے کلام پاک سنایا اس کے بعد طلباء مدرسہ نے خدا کی تعریف و پرارتھنا و ترانہ دکن پڑھا۔ ازاں بعد مولوی محمد عبد العزیز صاحب صدر مدرس نے مدرسہ کی رپورٹ سنائی۔ اس کے بعد مولوی محمد اسمٰعیل خاں صاحب صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ درجہ اول قصبہ بھکنور نے ”فی زمانہ تعلیم کی ضرورت“ پر اور مولوی قاضی ملک محمد صدیق صاحب صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ قصبہ راجم پیٹھ نے ”تعلیم کس طرح دی جانی چاہئے“ پر و مسٹر بی نرسیا صاحب مددگار مدرس مدرسہ تحتانیہ بھکنور نے بزبان تلنگی رعایا دیہی سے دو باتیں پرجوش انداز میں تقریریں کیں جن کا حاضرین پر بہت کچھ اثر ہوا۔ مولوی شیر علی صاحب مددگار مدرس مدرسہ تحتانیہ قصبہ بھکنور نے ”جماعت دوم اردو کی ادب“ پر علمی سبق و مسٹر دسی لچیا صاحب مددگار مدرسہ تحتانیہ راجم پیٹھ نے ”جماعت اول تلنگی کی حسابی نظم“ پر بذریعہ کنڈرگارٹن علمی سبق دیا گیا جس میں خاصی دلچسپی رہی اور ایک کمسن طالبعلم مدرسہ بھکنور (فرزند مولوی محمد اسمٰعیل خاں صاحب صدر مدرس بھکنور) نے وعدہ کی سچائی پر ایک قصہ سنایا اس کے بعد جناب صدر نشین جلسہ نے اپنا عالمانہ خطبہ صدارت پڑھا جو اپنی نوعیت میں بے نظیر تھا۔ معزز صدر نے اپنے دوران تقریر میں فرمایا کہ ایسے تعلیمی جلسہ اگر ہر ماہ ہوا کریں تو رعایا میں

ابھی خاصی اسپرٹ پیدا ہوگی۔ اس کی صدارت کے لئے عہدہ دار تعلیمات کی ہی شخصیت کی ضرورت نہیں۔ بلکہ معزز رعایا میں سے کسی ایک کو صدر نشین بنایا جا سکتا ہے۔ نیز اس سلسلہ میں یہ بھی فرمایا گیا کہ جس طرح رعایا و مدرس تعلیمی جلسہ منائے اسی طرح کلاس کے مانیٹر بھی اپنا ایک جلسہ منائیں جن کے منجملہ ایک مانیٹر صدر نشین بنایا جا کر کلاسوں کے نظم ونسق پر تبادلہ خیالات کیا کریں جس سے بچوں میں بھی تقاریر کا مادہ پیدا ہوگا۔ غرض معزز صدر نے اپنی قابلیت سے مدرس و رعایا کے معلومات میں خاطر خواہ اضافہ فرمایا۔ آخر میں جناب صدر نے فرمایا کہ میرا ہر چند ارادہ تھا کہ مزید عرض کروں مگر افسوس کہ وقت بہت ہو چکا ہے بارش کا سلسلہ جاری ہے۔ رات کی تاریکی بڑھتی جارہی ہے اندیشہ ہے کہ شرکار جلسہ کو تکلیف ہو لہذا اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں اختتام تقریر پر مولوی قاضی ملک محمد صدیق صاحب صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ راجم پیٹھ نے مدرسہ کے جانب سے شرکار جلسہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے درگاہ مجیب الدعوات میں اپنے سرپرست بادشاہ ذیجاہ خلد اللہ ملکہ وسلطنتہٗ وشہزادگان والاشان وشہزادیاں فرخندہ فال کی درازی عمر وشہزادگان والاشان کے بخیر وخوبی یورپ سے مراجعت فرمانے کی دعا مانگی اور سب نے "آمین" کے نعرے بلند کئے اس کے بعد طلبا مدرسہ کو شیرینی تقسیم کی جا کر حاضرین کی عطر و پان سے خاطر تواضع کی گئی اور ٹھیک ۸ بجے شب جلسہ برخواست ہوا۔

مدرسہ وسطانیہ لنگسگور میں اگنی سبھا کا تیسرا مظاہرہ

بتقریب تشریف آوری جناب مولوی رفیع الدین صاحب صدیقی بی اے۔ بی۔ ٹی مہتمم تعلیمات ضلع رائچور بعد ختم معائنہ تعلیمی مدرسہ وسطانیہ لنگسگور کے اسکوٹس نے جس کی مجموعی تعداد پچاس تک پہونچی ہے اجتماعی ڈرل اور اسکوٹس گیمس کے مختلف مظاہروں کے بعد شب میں ۹ بجے بتاریخ یکم آبان ۱۳۴۱ف اگنی سبھا کیامپ فیر کا مظاہرہ مختلف وگوناگوں دلچسپ مشاغل کے ساتھ پیش کیا۔ عوام کثیر تعداد میں شریک تھے۔ جناب مہتمم صاحب تعلیمات ضلع رائچور بمعیت جناب الیاس قریشی صاحب منصف عدالت لنگسگور تشریف فرما تھے۔ ڈاکٹر مہادیوی نند ایم۔ اے۔ ڈی۔ یس۔ سی مددگار محکمہ طبقات الارض جن کی دلچسپیوں اور ہمدردیوں کا مدرسہ ہذا ممنون ہے شریک تھے۔ ٹھیک وقت پر مجوزہ پروگرام کے مطابق "بھارت ماتا" کی نظم کے ساتھ جس کو واعظ الحق نامی اسکوٹ نے خاص سوز وگداز کے ساتھ والہانہ انداز میں پڑھا تھا اگنی سبھا کی افتتاح عمل میں آئی۔ انگریزی۔ فارسی۔ اردو۔ کنڑی مکالموں اور ڈراموں میں مصروفیت رہی "دو برہمن" کا مذاقیہ مکالمہ ازحد دلچسپ اور ظرافت انگیز ثابت ہوا۔ "تعطیل کی مصروفیت" والا ڈرامہ اہل مذاق اور اہل نظر ہر دو کے لئے سبق آموز تھا۔

اسکوٹس نے مسمیرزم کے عنوان سے مختلف عجیب و غریب کرشموں کو حاضرین کے پیش نظر کیا۔ اسکوٹس کا بلا حجاب و رعب مجلس مختلف مظاہروں کو نہایت آزادی و مشاقی کے ساتھ پیش کرنا ناظرین سے کلمات تحسین و آفریں کا باعث ہو رہا تھا۔ اسکوٹس کی جماعت موسیقی نے مختلف انداز سے نوع بہ نوع ترنم کے ساتھ خوش نوائی و اصول موسیقیت کو مد نظر رکھتے ہوئے نغمہ نوازی و ترنم ریزی کی صلاحیت کا مظاہرہ پیش کیا۔ غرض اس کوردہ میں جو ریلوے اسٹیشن سے میلوں دور ہے اسکوٹس نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں سے اس امر کو ثابت کر دکھایا کہ تعلیم و تربیت کے بعد دیہی باشندوں میں بھی شہری مدارس کے طلبا کی سی خصوصیات پیدا ہو سکتی ہیں۔ اگنی سبھا کے مظاہروں کے اختتام سے پہلے شعلہ انگیز آتش جو پہلے سے روشن ہو رہی تھی۔ نہایت آب و تاب کے ساتھ بھڑک اٹھی۔ اسکوٹس کی مختلف ٹولیوں نے اس آتشی تودہ کو اپنے حلقہ میں لئے ہوئے۔ قومی گیت الاپنا شروع کیا۔ "خضر کی عمر ہو تجھ کو عطا بخت سکندر رہو" کی دعائیہ نظم کے ساتھ سارے حاضرین دست بستہ ایستادہ تھے۔ اس پر کیف نظم کے ساتھ اسکوٹس نے سلامی اتاری اور مصروفیت ختم ہوئی۔ جناب مولوی محمد جیلانی صاحب بی۔ اے۔ ہیڈ ماسٹر مدرسہ ہذا نے جمیع حاضرین اور خاص کر جناب مہتمم صاحب تعلیمات کا شکریہ ادا کیا۔ جنہوں نے باوجود اپنی سرگرم مصروفیتوں کے کیامپ فیر میں شریک ہو کر جمیع اسکوٹس کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ اور کارکنان مدرسہ کو ممنون کیا۔ جس کے جواب میں جناب مہتمم صاحب نے جناب ہیڈ ماسٹر صاحب سے انتہائی مسرت و شادمانی کا اظہار کیا۔ اور یہ فرمایا کہ اس قسم کے خوش کن نتیجہ خیز مظاہرے پیش کرنے سے ضلع ہذا کے وسطانیہ تو کیا مدارس فوقانیہ بھی قاصر ہیں۔

مدرسہ تحتانیہ انتر گاؤں بتاریخ ۳۰؍ اردی بہشت ۱۳۴۱ف روز یکشنبہ زیر صدارت جناب مسٹر کے ترل راؤ صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی مہتمم تعلیمات ضلع آصف آباد ڈبیٹنگ سوسائٹی کا انعقاد بوقت چار ساعت شام بلے گراؤنڈ پر جو کہ جھنڈیوں وغیرہ سے آراستہ کیا گیا تھا۔ جلسہ کا افتتاح کیا گیا۔ چند طلبہ نے خدا کی تعریف نظم اردو و مرہٹی میں سنائی۔ بعد ازاں چار طلبہ نے ہمارے بادشاہ اعلیحضرت حضور پرنور (میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہٗ) کے سلامتی کے لئے خدا سے دعائیں مانگیں۔ کمسن طلبہ نے چھوٹی چھوٹی کہانیاں بیان کیں۔ اور (اشوہرن) مرہٹی ڈرامہ ہوا جس کو جناب صدر صاحب نے پسند فرمایا۔ بعد ازاں طلبہ نے علم و دولت پر تقریر کی۔ جناب سیتارام راؤ صاحب صدر مدرس مدرسہ ہذا نے علم و دولت کے بارے میں اپنے

خیالات کا اظہار فرمایا۔ مسٹر دتاتری راؤ صاحب مددگار نے علم و دولت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہوئے رعایا کو (جو کہ اس جلسہ میں مدعو کئے گئے تھے) علم کے متعلق ترغیب دلائی بعد ازآں جناب صدر نشین صاحب نے زبان مرہٹی میں پر زور تقریر فرمائی۔ اور رعایا و طلبا کو نصیحت کی کہ علم اور دولت ایک ہی چیز ہے۔ علم سے ہی دولت اور دولت سے ہی علم ہے۔ بعد ازآں جناب صدر مدرس صاحب نے جلسہ مذکور کی رپورٹ پڑھی اور فرمایا کہ بزم مذاکرہ کی ابتدا سال ۱۳۳۹ف میں ہوئی ہے اس وقت سے تاحال کامیابی کے ساتھ مدرسہ ہذا میں ہر ہفتہ جلسہ کا انعقاد ہو رہا ہے۔ بعدہٗ جناب صدر مدرس صاحب نے حاضرین جلسہ و جناب صدر نشین صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ چائے نوشی کے بعد شیرینی تقسیم کر دی گئی۔ نہایت مسرت کے ساتھ ۶½ بجے جلسہ برخواست ہوا۔

رپورٹ جلسہ تعلیمی مدرسہ تحتانیہ درجہ اول دو زبانی قصبہ واڑہونہ تعلقہ احمد پور ضلع بیدر شریف

بتاریخ ۲۵ آبان ۱۳۴۱ف روز جمعہ ٹھیک چار بجے مدرسہ تحتانیہ درجہ اول دو زبانی قصبہ واڑہونہ ضلع بیدر کا سالانہ تعلیمی جلسہ اس نواح کے مشہور زمیندار جناب اعظم میاں صاحب دیسمکھ و جاگیردار و مقطعہ دار (واڑہونہ و سوگاؤں و دواکیال وغیرہ) کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ چونکہ جلسہ کا انتظام اعلیٰ پیمانہ پر کیا گیا تھا۔ مدرسہ کی سرکاری عمارت کے ہال و برانڈہ ناکافی خیال کر کے میدان بازیگاہ میں بعض ساہوان آبادی کی امداد سے ٹین کا وسیع ہال تیار کر کے رنگ برنگ کی جھنڈیوں اور بیرقوں سے آراستہ و پیراستہ کیا گیا تھا۔ حاضرین کی تعداد تین سو سے زائد تھی۔ جناب صدر مدرس صاحبان ڈھولتی و چاپولی و گھڑورو و دیگر مدرسین بھی شریک جلسہ تھے۔ حمد و ثنا کے بعد جلسہ کا آغاز ہوا۔ جناب صدر مدرس صاحب مدرسہ ہذا کی تحریک صدارت و مولوی سید عثمان علی صاحب صدر مدرس چاپولی کی تائید کے بعد جناب صدر نشین صاحب کرسی صدارت پر رونق افروز ہو کر اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار فرمایا بعد ازآں جناب مولوی محمد عبد الحمید صاحب صدر مدرس مدرسہ ہذا نے رپورٹ مدرسہ سنائی۔ جہادو راؤ و شیخ احمد و بجناتھ طلبہ مدرسہ نے علم اور اس کی ضرورت پر اردو و مرہٹی میں اچھے اچھے مضامین پڑھ کر حاضرین سے خراج تحسین حاصل کئے۔ چونکہ مسٹر رگھناتھ راؤ صاحب مددگار کے تبادلہ ہائی اسکول کے احکامات بھی آچکے تھے۔ اس لئے بہادر باؤ رکو درس وکنی لنگون و آبادی کے افراد نے ماسٹر صاحب جیسے ہر دل عزیز مدرس کے تبادلہ پر اظہار افسوس کیا از آن

بعد فصیح الدین احمد صاحب مددگار مدرسہ ہذا نے ماسٹر صاحب کے اوصاف حمیدہ و تعلیمی دلچسپی کا اعادہ و چمن بندی میں دلچسپی لینے کے مادہ کا اظہار کرتے ہوئے ایک نظم سنائی۔ مولوی سید عثمان علی صاحب صدر مدرس جاپولی نے کسی شاعر کی درس عمل پر ایک بہترین نظم سنائی اور اتفاق و اتحاد پر نہایت لبیط و معنی خیز مضمون پڑھا۔ اس کے بعد مولوی عبدالوہاب صاحب وہاب منصبدار و دیسکھ نے جن کو تعلیم سے خاص لگاؤ ہے۔ احادیث و آیات قرآنی کے ذریعہ حصول تعلیم و ضرورت علم پر نہایت فصیح و بلیغ تقریر فرماتے ہوئے فیوضات دور عثمانی بالخصوص تعلیمی ترقی کا جامع الفاظ میں مدلل اعادہ فرمایا جس سے حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔ بعد ازآں فطرتی تعلیم پر گوبند راؤ صاحب صدر مدرس بڈولتی نے زبان مرہٹی میں اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار فرمایا۔ موصوف کی تقریر بھی مثل مولوی عبدالوہاب صاحب منصبدار دل پذیر رہی اور حاضرین خوب لطف اندوز ہوئے۔ مسٹر سدھو راؤ صاحب اور پنڈت گوبند دیو صاحب جوشی نے نہایت جوش و خروش سے فرمایا کہ موجودہ صدر مدرس مولوی محمد عبدالحمید صاحب کو ہیری کی مساعی جمیلہ کا باعث ہے جو یہاں جماعت پنجم قایم ہوگئی اور دو جائداد کا اضافہ ہو کر (۹) مدرسین مامور ہو چکے ہیں۔ مدرسہ کی تعداد ڈھائی سو سے زائد ہے۔ رعایا دلچسپی لے کر وسطانیہ بنانے کی کوشش کرے جناب مقطعہ دار صاحب و رعایا مدرسین کا ہاتھ بٹائیں تو بہت جلد یہ مدرسہ مڈل اسکول ہو جائیگا زاں بعد مسٹر نگھا تھ راؤ صاحب مددگار متبدلہ نے مرہٹی میں اپنی الوداعی تقریر پڑھی اور منجانب مدرسہ حاضرین کا شکریہ ادا کیا گیا۔ اعلیحضرت بندگانعالی ظلہ العالی و شاہزادگان بلند اقبال و شاہزادیان ہمایوں فال کی ترقی عمر و اقبال کی دعا کے ساتھ اپنی نوعیت کا پہلا اور شاندار جلسہ ٹھیک مغرب کے وقت بخیر و خوبی برخواست ہوا۔ حاضرین کی چاء و پان سے تواضع کی گئی۔

روئداد جلسہ سالانہ مدرسہ تحتانیہ درجہ اول قصبہ بھکنیدہ ضلع ناندیڑ مدرسہ ہذا کا سالانہ جلسہ بتاریخ ۲۵ آبان ۱۳۴۱ف بصدارت عالیجناب دوم تعلقدار صاحب ڈویژن دیگلور منعقد ہوا۔ اندرون و بیرون مدرسہ رنگ برنگ کی جھنڈیوں سے اور چمن خوشنما بودوں سے اور مدرسہ کے کمروں کو خوشنما ڈزاین اور مختلف اشعار سے خوب سجایا گیا۔ صبح ۸ بجے سے ۱۱ بجے تک مختلف دیسی و انگریزی کھیل ہوئے۔ اور ۳ بجے قرات و حمد باری کے ساتھ جلسہ کا آغاز ہوا عام پبلک و معززین قصبۂ ہذا کے علاوہ جلیل القدر عہدہ داران صاحبان جناب تحصیلدار صاحب و جناب منصف صاحب وغیرہ نے بھی شرکت کی عزت بخشی طلبا مدرسہ کے ظرافت آمیز نتیجہ خیز اور سبق آموز مختلف زبانوں کے ڈراموں اور مکالموں سے شرکا جلسہ بہت ہی محظوظ و مسرور ہوئے۔ اس کے

بعد بھیم راؤ صاحب صدر مدرس مدرسہ ہذا نے حالات مدرسہ و جناب لکشمن راؤ صاحب ساہو نے ضروریات مدرسہ و جناب رحمان علی صاحب نے تحصیل علم و جناب عبد الکریم صاحب نے فوائد علم پر اردو میں تقریر فرمائی اور مولوی احمد علی صاحب مددگار نے حاضری کی طرف پبلک کی توجہ مبذول کرائی۔ جناب ڈرائنگ ماسٹر صاحب وسطانیہ دیگلور نے مرہٹی میں و جناب کاشی ناتھ آپا صاحب نے کنڑی میں علم کے فوائد پر تقریر فرمائی اور طلبہ مدرسہ نے دعائے سلامتی اعلیحضرت بندگانعالی کی نظم پڑھی۔

بعد ازآں عالیجناب صدر نشین صاحب نے خوشنودی کا اظہار او رسود مند پند و دلپذیر تقریر کے بعد گیمس کامیاب طلباء کو انعام تقسیم فرمایا۔ اور بڑی خوشی و کامیابی کے ساتھ ۶ بجے شام جلسہ برخواست ہوا۔

جلسہ سالانہ مدرسہ تحتانیہ سلگرہ ضلع گلبرگہ شریف بتاریخ ۲۴ آذر ۱۳۴۲ف بوقت ۴ بجے شام مدرسہ تحتانیہ قصبۂ ہذا کے سالانہ تعلیمی جلسہ بصدارت جناب چلکیا صاحب مالی پٹیل سکنہ کوٹرگہ تعلقہ گلبرگہ منعقد ہوا۔ اہالیان بستی میں سے تقریباً (۳۵۰) تین سو پچاس نفوس شریک جلسہ رہے۔ طلباء مدرسہ نے مختلف نظمیں اور مکالمے زبان کنڑی اردو انگریزی وغیرہ میں سنائے مدرسین اور اہالیان بستی میں سے اکثر معززین کی تقریریں ہوئیں اور مدرسین مدرسہ ہذا نے اپنے ذاتی صرفہ سے (۱۲) عدد سلیٹیں جناب صدر صاحب کے دست مبارک سے غریب و نادار طلباء کو تقسیم کرائیں اس کے بعد صدر مدرس نے مدرسہ کی موجودہ ترقی و آبادی کو ظاہر کرتے ہوئے رعایا قصبہ ہذا کو آبادی مدرسہ میں مدد دینے کی توجہ دلائی اخیر میں صدر نشین جلسہ نے مدرسہ کی موجودہ حالت پر اظہار خوشنودی ظاہر کرتے ہوئے۔ فراہمی طلباء میں مدد دینے کے متعلق رعایا کو خوب توجہ دلائی جس کا اثر حاضرین پر بہت ہوا اختتام جلسہ پر اعلیحضرت بندگانعالی و صاحبزادگان بلند اقبال و شہزادیاں ہمایوں فال کی ترقی عمر و اقبال کی دعا مانگی گئی۔ اور جلسہ نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے اختتام کو پہونچا۔

روئداد چھٹی سالانہ کانفرنس انجمن اساتذہ بلدہ

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کی چھٹی سالانہ کانفرنس سٹی کالج حیدرآباد دکن کے ہال میں بتاریخ ۱۵ و ۱۶ ستمبر ۱۹۳۲ء نواب سر نظامت جنگ بہادر کے زیر صدارت منعقد ہوئی۔ سخت بارش کی وجہ سے پہلے اجلاس میں مجمع کم تھا لیکن بعد کے جلسوں میں حاضرین کی تعداد اچھی خاصی ہوگئی۔ حاضرین جلسہ میں جناب نواب اکبر یار جنگ بہادر معتمد عدالت امور عامہ، جناب خان فضل محمد خاں صاحب ناظم تعلیمات ملک سرکار عالی اور جناب قاضی محمد حسین صاحب پرنسپال کلیہ جامعہ عثمانیہ، جناب سید محمد حسین صاحب جعفری نائب ناظم تعلیمات، جناب سید محمد اعظم صاحب صدر سٹی کالج، جناب سجاد مرزا صاحب پرنسپال ٹریننگ کالج، مسز رستم جی، مس ریڈ، مس ٹائیلر، اور جناب فیض الدین صاحب و احمد حسین خاں صاحب و سید حسین صاحب صدر مہتممین اسمات کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اجلاس اول صبح

نواب سر نظامت جنگ بہادر نے تعلیمی نمائش کا افتتاح کوئی ۱۰.۵ بجے کیا۔ اس کے بعد مولوی سید علی اکبر صاحب میر مجلس استقبالیہ کمیٹی نے اپنا خطبہ استقبالیہ پڑھ کر سنایا۔ اور کانفرنس نے مولوی سید ظہور علی صاحب مرحوم کی وفات حسرت آیات پر اظہار ملال اور ان کے پسماندگان کے ساتھ اظہار ہمدردی کا ریزولیوشن منظور کیا۔ بعد ازاں سید محمد شریف مشہدی معتمد عمومی نے اپنی رپورٹ بابتہ ۱۳۴۱-۴۲ف سنائی۔ جو رسالہ ہذا میں شائع کی گئی ہے۔ تب مولوی سید علی محمد صاحب نے اپنی نظم جو خاص اسی موقعہ کے واسطے لکھی گئی تھی لحن و ترنم کے ساتھ پڑھ کر سنائی۔ جس سے سامعین نہایت محظوظ ہوئے۔ اس نظم کی سامعہ نوازی کے بعد نواب سر نظامت جنگ بہادر نے اپنا فاضلانہ اور ولولہ انگیز خطبہ پڑھا جو رسالہ کے ابتدائی اوراق کو زینت دے رہا ہے۔

صدارتی تقریر کے اختتام پر اس تجویز پر بحث و مباحثہ ہوا۔

"اس کانفرنس کی رائے میں موجودہ مدارس میں پھسڈی طلبہ کی تعلیم پر زیادہ توجہ ہونی چاہئے"
اس کے محرک مولوی غلام دستگیر صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی نے فرمایا کہ "یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ
قوم اسی وقت ترقی کرسکتی ہے جب کہ اس کا ہر فرد سلیم الجسم اور سلیم العقل ہو۔ یہ بات تحقیق کو پہنچ
چکی ہے کہ ناقص القویٰ انسان کے مجموعہ میں پھسڈی، کمزور دماغ والے، نحیف القویٰ اور مخبوط
الحواس افراد شامل ہیں۔ تجربہ کار اساتذہ بخوبی واقف ہیں کہ ہر طبقۂ مدرسہ کے پھسڈی طلبہ کی تعداد
دس فی صدی سے کم نہیں۔ اس لئے تعلیم بنی نوع انسان کی فلاح پر جو رقم صرف ہوتی ہے اس
کا اس سے بہتر مصرف نہیں ہوسکتا کہ ان کے ناقص القویٰ افراد پر زیادہ توجہ کی جائے پھسڈی
طلبہ کی تعلیم کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرانس کے وزیر تعلیم نے تین وجودہ
سال کی عمر کے مابین والے بچوں کی پیمائش ذہن کا طریقہ ایجاد کیا۔ یہ بہت مفید ثابت ہوا۔ اور
اس سے طلبہ، مزدوروں اور سپاہیوں کی حقیقی ذہانت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔

ماہرین علم النفس کا قول ہے کہ بعض جسمانی بیماریاں مثلاً میعادی بخار، ذہنی اور جسمانی نقص
اور ناقص خوراک و لباس بچوں کو پھسڈی بنا دیتے ہیں۔ بدقسمتی سے پھسڈی بچوں کی مناسب
خبرگیری ہمارے مدرسوں میں نہیں ہوتی۔ ان کو ترقی سے محروم رکھا جاتا ہے اور یہ بات معلم و
متعلم دونوں کے لئے مضر ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ متعلم دل شکنی کا اور مدرس مایوسی کا شکار ہو
جاتا ہے۔ مدرس خیال کرتا ہے کہ وہ کامیابی کے ساتھ پڑھانے کے قابل نہیں اور طالب علم یہ نتیجہ
نکالتا ہے کہ اس میں تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں۔ تعلیم کے اس نقص کی وجہ سے جرمنی
میں اس قسم کے بچوں کے لئے جداگانہ مدارس قائم کئے گئے ہیں جہاں اس کے ادراک کو اسباق
الاشیاء اور دستی مشاغل کے ذریعہ متاثر کرنے پر زیادہ توجہ کی جاتی ہے۔ مگر اس طریقہ میں ایک بڑا
عیب یہ ہے کہ سارے بچے تقریباً ایک ہی ادنیٰ ذہنی معیار کے ہوتے ہیں۔ اور ان بچوں کو اوسط
ذہنیت کے بچوں کی صحبت نصیب نہیں ہوتی۔ اور وہ آئندہ زندگی کی ضروریات کے مطابق
تجربات نہیں حاصل کرسکتے۔ البتہ امریکہ میں ان لڑکوں کی الگ مدرسہ نہیں ہوتے بلکہ معمولی
مدرسوں ہی میں ان کی تعلیم کا خاص انتظام کیا جاتا ہے۔"

اس تحریک کی تائید میں ریورنڈ ایف۔ سی۔ فلیپ نے فرمایا کہ قبل ازیں جو کچھ کہا جاچکا
ہے اس سے میرا خیال ہے کہ اس قسم کی تحریک کی ضرورت بالکل ظاہر ہوگئی ہے۔ پھسڈی لڑکوں
کی طرف سے جو غفلت کی جاتی ہے اس سے نہ صرف روپیہ برباد ہوتا ہے بلکہ انسانی زندگی بھی تباہ

ہوتی ہے جو روپیہ سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور جو قوم کی حقیقی دولت ہے مجھے حیدرآباد کے بچوں کا اوسط تو معلوم نہیں مگر انگلستان میں ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ لندن کے طلبہ میں سے دس فی صدی اس نوع کے ہیں اور غالباً یہی اوسط حیدرآباد کا بھی ہوگا۔ بہر صورت اصل مسئلہ فیصد کا نہیں بلکہ انسداد کا ہے اگر شروع شروع علاج کیا جائے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ مجرموں کی درگاہیں، پاگل خانے وغیرہ ظاہر کرتے ہیں کہ حکومت عام ناقص القویٰ پر کتنی توجہ صرف کرتی ہے۔ بھدّی لڑکوں کو یقیناً اتنی ہی توجہ کی ضرورت ہے کیونکہ بھدّی طلبہ کو اپنی پوری ترقی حاصل کرنے کا ویسا ہی حق ہے جیسا کہ ہوشیار لڑکوں کو، مگر اکثر مدارس میں غبی لڑکوں کو نظر انداز کر کے ہوشیار لڑکوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ بحیثیت مدرس کے ہمارا کام یہ نہیں کہ تعلیمی ڈور کے گھوڑے تو تیار کریں اور بار برداری کے ٹٹوؤں کو پس پشت ڈال دیں یہ بیچارے بھی اُسی توجہ اور عنایت کے مستحق ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ دنیا کے کاروبار کا بوجھ زیادہ تر بار برداری کے گھوڑے اُٹھاتے ہیں نہ کہ گھوڑ ڈور کے تازی۔

حقیقی ناقص الذہن بچوں کو خاص مدرسوں میں خاص نصاب کی تعلیم دینا لازمی ہے۔ لیکن میرے نزدیک بھدّی لڑکوں کو ایسے مدرسوں میں بھیجنا کچھ زیادہ مفید نہ ہوگا۔ کیونکہ ایسے مدرسہ کے لڑکوں کے ماتھے پر ایک کلنگ کا ٹیکا لگ جاتا ہے اور ان میں ایک قسم کا احساس کمتری نشو و نما پاتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جو بھدّی طلبہ [illegible] کرنی چاہئے۔ تحریک کا منشا یہ ہے اور مناسب بھی یہی ہے کہ موجودہ مدارس ہی میں ان کی تعلیم کا انتظام ہو۔ سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ کمزوری کے اسباب کی ٹھیک تشخیص کی جائے تاکہ مناسب تدابیر اختیار کی جاسکیں۔ ممکن ہے کہ کمزوری غیر حاضری یا دیر سے تعلیم شروع کرنے کے سبب سے ہو۔ ایسے طلبہ کے لئے خاص جماعت کھولنا چاہئے مگر مشکل یہ ہے کہ ہمیں مالی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے کیونکہ خاص جماعت کے لئے زائد اساتذہ کی ضرورت ہوگی۔ اس کے علاوہ دوسرے اسباب بھی ہو سکتے ہیں مثلاً کم خوراکی یا دوسرے جسمانی نقص جو طبی معائنہ مدرسہ کے وقت معلوم ہو سکتے ہیں۔ بعض اساتذہ جو لڑکوں کو مکان پر دیکھتے رہتے ہیں وہ بھی اصل سبب معلوم کر سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کام کے لئے بیچارے عدیم الفرصت مدرس کا کچھ اور وقت صرف ہوگا۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کام کے انجام دینے میں ان کو مشکلات پیش آئیں گی۔

اصل بات یہ ہے کہ سبب کی تشخیص جلد ہونی چاہئے اور قبل اس کے کہ کمزوری ناقابل علاج ہو جائے مناسب تدابیر جلد سے جلد اختیار کرنی چاہئیں۔ نفسیاتی آزمائشوں سے انگلستان میں یہ ظاہر ہوا ہے کہ اگر انسداد جلد نہ کیا جائے تو کمزوری بڑی تیزی سے بڑھتی ہے مثلاً ایک بچہ جو

پانچ سال کی عمر میں اپنے برابر والوں سے ایک سال پیچھے ہے وہ دماغی ترقی میں پندرہ سال کی عمر میں دو سال پیچھے ہوجائے گا۔ یہ تو ابتدائی تناسب ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوری چارہ گری کی کتنی سخت ضرورت ہے اس لئے اس معاملہ میں ابتدائی مدارس خاص توجہ کے مستحق ہیں۔

ٹریننگ کالج بہت کچھ مدد کرسکتا ہے اگر وہ اپنے نصاب میں ایسی تعلیم بھی شامل رکھے جس کی مدد سے مدرسین اسباب کمزوری کی صحیح تشخیص کے قابل ہوجائیں۔ انہیں یہ بھی سکھایا جائے کہ انفرادی صورتوں میں بہترین طریقۂ فلاح کیا ہوسکتا ہے۔

بذات خود میں سمجھتا ہوں کہ بچوں میں جو ہمدردی کا جذبہ ہوتا ہے اس کو کام میں لاکر جماعت میں اتحاد عمل کے طور پر بہت کچھ کہا جاسکتا ہے ہم لبا اوقات اس انداز عمل کو نقالی جیسے برے نام دیا کرتے ہیں میں نقالی کی حمایت نہیں کرتا لیکن اگر کوئی اس نقطۂ نظر سے دیکھے تو نقالی ایک کار خیر ہے۔ اور جذبہ ہمدردی کو ظاہر کرتی ہے مجھے یقین ہے کہ اس جذبہ کو جائز طور پر استعمال کرکے پھسڈی طلبہ کی مدد ہوسکتی ہے۔ کچھ بھی سہی لیکن جماعت ایک اتحادی بزم ہے اور اس میں یہ صفت جتنی زیادہ پیدا ہوسکے اتنی ہی بہتر ہے۔ اس نہج پر اگر کوئی جماعت نشو ونما پائے تو توقع ہے کہ اس مسئلہ کے حل میں مدد ملے گی اور دوسرے طلبہ پر بھی مفید اثر پڑے گا۔

آخر میں کیا میں مدرسین سے اس امر کی درخواست کروں کہ وہ چند تیز شاگردوں کے ساتھ خاص محنت کرنے کی عادت کو جو ایک آہنی طریقۂ امتحان کی وجہ سے ترقی پا رہی ہے چھوڑدیں اور ادنیٰ درجہ کے اور بالخصوص پھسڈی طلبہ پر اتنی ہی بلکہ زیادہ توجہ مرکوز کریں! افلاطون نے لکھا ہے کہ کسی ملک کی حکومت انتہائی صورتوں میں اوسط درجہ کے شہری کی اوسط رائے کا مظہر ہوتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہماری اوسط درجہ کے شہری تیار کرنیکی ذمہ داری کتنی بڑی ہے کیونکہ یہی پھسڈی لڑکا آخر کار ان میں سے ایک ہوگا۔

کچھ بحث و مباحثہ کے بعد یہ تحریک بغلبہ آرا منظور رہوئی۔

پہلے دن کا صباحی اجلاس مسٹر محمد مکتھال کے فصیح و بلیغ اور سبق آموز لکچر بعنوان "اَحدی لڑکے کا مسئلہ" کے ساتھ ختم ہوا۔ مکتھال صاحب نے اپنے موثر طرز میں فی البدیہہ تقریر فرمائی لیکن آخر میں ہماری درخواست پر موصوف نے اپنی تقریر کے اہم نکات کو ایک مقالہ کا جامہ پہنایا جو حصہ انگریزی میں زینت قرطاس ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ ناظرین اس مقالہ کو اسی توجہ سے پڑھیں گے جس توجہ سے کہ مکتھال صاحب جیسے متبحر کے ادیب کی تحریریں پڑھنی چاہئے ہیں

اس وقت پکھال صاحب کا شکریہ ادا کرنے کا موقعہ حاصل ہوا ہے کہ انھوں نے انجمن اساتذہ اور حیدرآباد ٹیچر کے ساتھ جس کے وہ پہلے مدیر تھے اپنی دلچسپی قایم رکھی۔

سہ پہر کا اجلاس

سہ پہر کا اجلاس انگریزی اور السنۂ مشرقیہ کے ضمنی جلسوں کے لیئے وقف کر دیا گیا تھا دونوں جلسوں میں حاضرین کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ السنۂ مشرقیہ کی ضمنی کمیٹی نے جس کے صدرنشین جناب ڈاکٹر عبدالحق صاحب ڈی فل (آکسفورڈ) تھے یہ تجویز منظور کی کہ طبقۂ وسطانیہ وفوقانیہ میں السنۂ مشرقیہ کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔

السنۂ مشرقیہ کی ضمنی کمیٹی کی روئداد ہدیہ ناظرین کی گئی ہے بعنوان "قدیم دکن کی تمدنی تاریخ پر ایک نظر"

رات میں مسٹر ہنمنت راؤ ایم۔اے۔ایل۔ٹی پروفیسر تاریخ نظام کالج نے طلسمی لالٹین کے ساتھ لکچر دیا۔ مولوی سید علی اکبر صاحب ایم۔اے نے اس جلسہ کی صدارت فرمائی۔ پروفیسر ہنمنت راؤ نے مشہور آفاق غارہائے ایلورہ اور اجنٹہ کا نہایت واضح طور پر تذکرہ کیا اور ضمناً متعلقہ عہدوں کی تہذیب وتمدن پر روشنی ڈالی۔ صدرنشین صاحب کی ایما سے مولوی وہاج الدین صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی لکچرار اورنگ آباد کالج نے مدرسین تحتانیہ کی خاطر پروفیسر صاحب کے لکچر کی خاص خاص باتیں اردو میں بیان فرمایئں۔ مسٹر ہنمنت راؤ اور وہاج الدین صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے بعد صدرنشین صاحب نے تاریخی اہمیت کے مقامات کی سیر وسیاحت پر زور دیا اور اس سلسلہ میں تعلیم تاریخ کی لاجواب رپورٹ کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ جسے تین سال پیشتر انجمن اساتذہ کے مقرر کردہ ایک ذیلی کمیٹی نے مسٹر ہنمنت راؤ کی رہنمائی سے مرتب کیا تھا۔

دوسرا روز

صبح کا اجلاس

ڈرائنگ کی ضمنی کمیٹی

ڈرائنگ کی ضمنی کمیٹی کا اجلاس بصدارت مولوی محمد حسین صاحب بی۔اے (آکسن)

نائب ناظم تعلیمات ملک سرکار عالی نو بجے سے دس بجے تک منعقد ہوا۔ مولوی شیخ ابو الحسن صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی میر مجلس ذیلی کمیٹی تعلیم ڈرائنگ نے اپنی ذیلی کمیٹی کی مرتب کردہ رپورٹ پڑھی یہ رپورٹ ضمنی کمیٹی میں اور بعد ازاں کانفرنس میں چند ترمیموں کے ساتھ منظور کی گئی۔ صدر نشین صاحب نے اپنی اختتامی تقریر میں فرمایا کہ اپنے معائنوں کے وقت میں نے دیکھا ہے کہ مدارس میں تعلیم ڈرائنگ کو کافی اہمیت نہیں دی جاتی۔ جیسا کہ نظام الاوقات میں جو وقت ڈرائنگ کے لئے دیا جاتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ موصوف نے ڈرائنگ کی تعلیمی قدر و قیمت پر بھی زور دیا۔

انتظامی جلسہ

ضمنی جلسہ کے بعد انتظامی کمیٹی کا اجلاس بصدارت جناب سید علی اکبر صاحب منعقد ہوا۔ اور مندرجہ ذیل تحریکیں منظور کی گئیں۔

(۱) یہ کہ ڈاکٹر کرشنیا، ایجوکیشنل افسر، علاقہ عظمت مدارس کندرآباد اور بلارم کے مدارس کی انجمن کی مرکزی انتظامی کمیٹی میں نمایندگی فرمائیں۔

(۲) یہ کہ ماہانہ جلسوں سے غیر حاضری کے متعلق جو دفعات ہیں وہ بجنسہ بحال رکھی جائیں۔
یہ بھی طے پایا کہ دو ذیلی کمیٹیاں منجانب مرکزی انتظامی کمیٹی مقرر کی جائیں جو آئندہ سال کے لئے بیمنڈی طلبہ کے مسئلہ اور کنڈرگارٹن کے متعلق رپورٹیں مرتب کریں۔

تعلیمی نفسیات پر لکچر

مسٹر فیض محمد خاں بی۔ اے۔ ڈپ۔ ایڈ (عثمانیہ) مددگار سائنس مدرسہ عثمانیہ فوقانیہ دار العلوم بلدہ نے اردو میں تعلیمی نفسیات پر نہایت دلچسپ تقریر فرمائی۔ کرسی صدارت پر جناب قاضی محمد حسین صاحب ایم۔ اے (کنٹب) صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ متمکن تھے۔ یہ لکچر رسالہ ہذا میں بجنسہ شائع کیا گیا ہے۔

آخری اجلاس

نواب سر نظامت جنگ بہادر نے ٹھیک دو بجکر پندرہ منٹ پر کرسی صدارت کو رونق بخشی۔ مولوی حسام الدین صاحب معتمد ذیلی کمیٹی السنۂ مشرقیہ نے رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ کمیٹی نے

مدارج ثانویہ میں السنۂ مشرقیہ کو لازمی قرار دینے کی جو سفارش کی تھی اس کی بعض حضرات نے مخالفت کی۔ مولوی سید علی اکبر صاحب کے مشورہ سے بالآخر یہ طے پایا کہ رپورٹ منظور کی جائے اور ضمنی کمیٹی کی پاس شدہ تحریکوں کو مرکزی انتظامی کمیٹی میں بغرض غور و خوض و کارروائی پیش کیا جائے۔

ڈاکٹر کرشنیا ایم۔ اے نے بعنوان "ہم کس طرح بہترین معلم بن سکتے ہیں" ایک مضمون پڑھا۔ اور ان کے بعد مولوی وہاج الدین صاحب نے "نصاب مدارس نسواں کو سدھارنے کی ضرورت" پر ایک پرمغز تقریر فرمائی۔

جناب صدر نشین کی ایما سے مسز رستم جی نے وہاج الدین صاحب کی تقریر پر اپنا خیال ظاہر کیا اور فرمایا کہ وہاج الدین صاحب نے مدارس نسواں کے لئے جو نصاب تعلیم تجویز کیا ہے اس سے مجھے پورا اتفاق ہے۔ اس کے بعد موصوفہ نے دہلی میں جو زنانہ سنٹرل کالج عنقریب میں کھلنے والا ہے اس کی اسکیم کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا اور کہا کہ اس درسگاہ میں ان تمام باتوں کا انتظام ہوگا جس کی ضرورت ہندوستانی بچوں کو ہندوستانی حالات کے تحت لاحق ہوتی ہے۔ نصاب تعلیم میں علم خانہ داری، فنون لطیفہ پر زور دیا جائے گا اور گو ذریعہ تعلیم انگریزی ہوگا لیکن طالبات کو السنۂ ملکی کا امتحان کامیاب کرنا پڑے گا۔ موصوفہ نے یہ خیال بھی ظاہر فرمایا کہ اس کلیہ سے نکلی ہوئی لڑکیاں دس سال کے اندر ہندوستانی طرز بود و ماند اور ہندوستانی زاویۂ نگاہ میں انقلاب پیدا کر دیں گی۔

اس کے بعد مولوی سالم بن سعید بی۔ اے۔ بی۔ ٹی معتمد انگریزی ضمنی کمیٹی نے جلسہ کی مختصر رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ اور مولوی نظیر حسین شریف صاحب نے نمائش کمیٹی کی کارگزاری کی روداد سنائی۔

صدر نشین صاحب کی اختتامی تقریر

تقسیم انعامات کے بعد نواب سر نظامت جنگ بہادر نے اختتامی تقریر فرمائی جس کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"میں نے دوران کانفرنس میں جو بحث و مباحثے ہوئے ان سب کو بڑی دلچسپی سے سنا گذشتہ دو ایام میں میں نے جو کچھ دیکھا یا سنا اس سے میرے دل پر بہت گہرا اثر ہوا۔ مجھے نمائش تعلیمی بے حد پسند آئی اور میں انجمن اساتذہ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ وہ ایک مہتم بالشان

کام صحیح اصول پر انجام دے رہی ہے۔ ناقص القویٰ بچوں کی تعلیم کے دوران میں ہمدردی بنی آدم کے قابل تعریف
جذبہ پر جو زور دیا گیا ہے اس سے میں خاص طور پر متاثر ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ مسئلہ ذرا اہم ہے اور ہماری پوری ہمدردی اور
توجہ کا مستحق ہے۔ میرے محترم دوست مسٹر فلپ نے جس قابلیت سے کمزور بچوں کی حمایت کی ہے اس پر وہ قابل مبارکباد ہیں۔
میرے دوست مسٹر پکتھال نے بقول خود اعدی بچوں کے متعلق ایک پر شورہ تقریر فرمائی جس میں انہوں نے انگلستان
کے پبلک اسکولوں کی زندگی کے بہت سے دلچسپ حوالے دیئے۔ اور اگر ان پر عمل کیا جائے تو ترقی تعلیم میں ان سے
بیحد مدد ملیگی۔ مجھے تعلیم السنۂ مشرقیہ کی رپورٹ سے اتفاق ہے ان زبانوں میں قدیم اور تاریخی قوموں کے
حالات محفوظ ہیں۔ السنۂ قدیم کے مطالعہ سے تقویم تاریخ میں مدد ملتی ہے۔ اور قدیم قوموں کے حالات سے لوگوں کو
آگاہی ہوتی ہے۔ اسلئے مجھے اس رائے سے کامل اتفاق ہے کہ مدارس میں السنۂ قدیم کی تعلیم کی ترغیب و تحریص اور ترقی دی جائے
مجھے مولوی وہاج الدین صاحب کیساتھ بھی پوری ہمدردی ہے جنہوں نے مدارس نسواں کے نصاب کو سدھارنے
کیلئے اپنی فصیح و بلیغ تقریر سے سامعین کو متاثر کر دیا۔ واقعی لڑکیوں کی تعلیم لڑکیوں کی طرح ہونی چاہئے نہ کہ لڑکوں کی
طرح۔ فقط کتابی تعلیم کام کی نہیں ہے۔ لڑکیوں کو ثانوی مدارس اور کلیہ کی تعلیم دینا اور پھر انکو دنیا میں چھوڑ دینا بیشک
وشبہ بیش بہا جانوں کی تباہی ہے ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے جلسہ میں مسز رستم جی فریدوں جی صاحبہ موجود ہیں
جن کی تعلیم نسواں کے میدان میں قیمتی خدمات کی تعریف کیلئے مجھے الفاظ نہیں ملتے۔ ان کا کام ایسا ہے
جو ابھی نہیں بلکہ کئی پشت کے بعد بار آور ہوگا۔ مجھے ڈاکٹر کرسٹنیا کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ انھوں نے
نہایت دلچسپ تقریر فرمائی۔ آخر میں، میں یہ ضرور کہوں گا کہ میں یہاں سے اطمینان و مسرت کے جذبات
لے کر جا رہا ہوں۔ مجھے آئندہ بھی ہمیشہ یہ سن کر خوشی ہوگی کہ انجمن اساتذہ اپنا کام حسن و خوبی کے ساتھ
انجام دے رہی ہے۔ میں اس کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں اور میرا مشورہ ہے کہ انجمن اساتذہ کو اپنے
مساعی کو مسدود نہ کرنا چاہئے چاہے کبھی ایسے حادثات بھی پیش آئیں جو اس کی ترقی میں رکاوٹ پیدا
کرنے لگیں۔

مولوی شیخ ابو الحسن صاحب نے نواب سر نظامت جنگ بہادر، مسٹر سید اعظم، سید محمد حسین
جعفری صاحب، ڈاکٹر عبد الحق ڈاکٹر کرسٹنیا، مسٹر وہاج الدین اور دوسرے حضرات کا شکریہ ادا
کیا جنہوں نے کانفرنس کو کامیاب بنانے میں حصہ لیا تھا آخر میں مولوی حسام الدین صاحب نے
حضور پرنور خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی عمر و اقبال اور انجمن اساتذہ کی ترقی کیلئے دعا مانگی اور اس طرح
یہ چھٹی کانفرنس انجمن اساتذہ خیر و خوبی کیساتھ ختم ہوئی۔

بتقریب تہنیت سالگرہ عثمانی

یکم ماہ رجب المرجب ۱۳۵۱ھ لغایتہ ختم ماہ شعبان المعظم ۱۳۵۱ھ

احباب کے اصرار پر مزید توسیع آخر ماہ شعبان المعظم تک کیجاتی ہے

کتاب کا مجموعی حجم (۵۳۵) صفحات (۲۹) تصاویر اور دو نقشہ جات آرٹ پیپر کاغذ جرمنی پشتہ چرمی پر طلائی نام کندہ ہے کتاب کا وزن ۳ سیر سائز (۱۸+۲۲) عہد عثمانی کی یادگار میں علم دوست حضرات کو عملی فائدہ کی غرض سے رعایت چوتھائی یعنے (۱ مے) روپیہ قیمت کردی گئی ہے۔ مابعد پوری قیمت پر بھی ملنا محال ہوگا۔

پتہ

سیّد عبد القادر

تاجر کتب و مالک اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن

While the surplus female population in England makes it necessary to educate girls for a life of economic independence, the social and economic conditions in India demand that Indian girls should be trained mainly for the home.

Mr. Wahajuddin has offered some very constructive suggestions for remodelling the courses of study in Indian Girls' schools under the various stages of instruction. As far as Girls' education in H. E H. the Nizam's Dominions is concerned, he recognises that in the new curriculum which was introduced last year, sufficient weight is given to subjects like Domestic Science and Hygiene. But he recommends a bifurcation of studies after the Middle Stage and the introduction of a more practical course for girls who do not wish to study for the Matriculation or High School Leaving Examination. While such bifurcation is desirable, we are of opinion that the time for opening the Post-Middle Vocational Schools suggested by Mr. Wahajuddin has not come yet owing to the small number of girls studying in the Middle Stage at present. As far as the High Stage is concerned, we understand that a scheme for the introduction of practical courses in Domestic Science with provision for cooking, care of infants, nursing and needlework is already under the consideration of the Osmania University. The scope for such practical training in the University Stage is obviously limited, but even in that stage it may be possible to satisfy the future requirements of girls by allowing them to take up Domestic Science and Child-Study as optional subjects.

In the end, we should like to endorse Mr. Wahajuddin's remarks regarding the need for preparing suitable text-books for Girls' schools. A still greater need, however, is to secure the right kind of teachers who will be able to ensure *that the education which the girls receive is at once* liberal and realistic in domestic, as in other subjects.

in future years. Under medical advice, Miss Michell will shortly be going away to Australia. We wish her speedy recovery and hope that she will be permitted to come out to India again to work in our midst.

The Hyderabad Boy Scout Association.

It is nearly 12 years now since the Hyderabad Boy Scout Association was started. During this period it has done yeomen service in organising rallies, training camps and inter-troop competitions and in encouraging schools to start troops. The Boy Scout organisation had necessarily to be an official organisation in its initial stage, but as soon as it passed that Stage, efforts were set on foot to enlist public co-operation and public sympathy with the movement. We are glad to find that these efforts have now been crowned with success. We welcome the advent of the City and Chaderghat Local Associations which have been formed by the public of Hyderabad recently and we feel confident that they will do much to advance the cause of scouting in the Hyderabad State.

Curriculum of Girls' Schools in India.

We have published elsewhere the text of an interesting lecture delivered on the above subject by Mr. Wahajuddin at the Sixth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association. Mr. Wahajuddid complains, and in our opinion rightly, that the curricula followed in most Girls' schools in India do not sufficiently take account of the work which the girls will be required to do in future as wives and mothers. The English system of Girls' education cannot and should not be copied in India, because the conditions in England are quite different from those in India.

Editorial Notes

Nawab Sir Nizamat Jung's Presidential Address.

The presidential address delivered by Nawab Sir Nizamat Jung Bahadur at the Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association appears elsewhere in this issue. It strikes a note to which, in these days of unbounded faith in methods and material equipment, we are inclined not to listen. For this reason, we can do no better than to read, mark, learn and inwardly digest the words of this detached but careful observer of the trend of events. The world over, the same doubts and fears are being expressed regarding the efficiency of school and college education. In India, it would seem that we are more desperately in need of such a note of caution. Education which does not result in building up desirable ideals and changing conduct, is very likely to be worse than useless.

The suggestions made by Sir Nizamat Jung for meeting the present needs are not less valuable than his diagnosis of the existing chaotic situation. No educational expert could improve on them. We are extremely grateful to Sir Nizamat Jung both for the honour which he did to the Association by presiding over its Annual Conference and for his penetrating and thought-provoking message.

The Educational Exhibition.

As usual, an Educational Exhibition was held along with the Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association. Miss Michell, President of the Exhibition Committee, displayed admirable skill and taste in classifying and arranging the exhibits, and with the assistance of the Secretary, Mr. Nazir Husain Sharif, and other members of the Committee, she made the Exhibition a great success. We have published elsewhere a brief report of the Exhibition written by her. It contains many useful suggestions which, we are sure, will be a great help to the Teachers' Association in improving the organisation of the Exhibition

Mr. Nizamuddin, the Scout Master from the City College, and to the masters and ladies who gave so freely of their time and labour.

The secret of success lay in the fact that Mr. S. Ali Akbar gave unstintingly of his time and thought, and under his guidance we were able to carry the Exhibition to a successful conclusion.

I would like to suggest that in future years the schools be urged to send only the best of their exhibits to the Educational Exhibition, not each child's whole output of work for the year. Could not a rule be made whereby each school exhibited only four articles in each section? I would also like to draw attention to the fact that very few schools kept to the syllabus sent out regarding the classification of exhibits. There were hundreds of exhibits for which no class was provided. As this syllabus must necessarily be altered each year, I would like to suggest that the schools concerned read it more carefully than heretofore and that in future the Committee reject exhibits for which no class is provided in the syllabus.

I would most strongly urge that the schools have their own exhibitions for the purpose of choosing the articles to be sent in and I would remind teachers and pupils alike that "quality" and not "quantity" is what is required.

HELEN MICHELL

President,

EXHIBITION COMMITTEE

The Educational Exhibition.

As in previous years, the Educational Exhibition was held in conjunction with the Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association in September, 1932. Exhibits from various schools were received from 11th September till 2 p. m. on the 12th September, 1932.

The total number of schools which sent exhibits was 59. It was noticed that very few of the Secunderabad Schools sent in exhibits this year. The exhibits numbered 1945. Some of these were rejected on account of their inferior quality and the remaining 1570 articles were placed in the gallery of the great hall of the City College.

The judging Committee consisted of Mr. Syed Md. Husain Jafery, B. A. (Oxon.), Deputy Director of Public Instruction, Mrs. Sackett, Secunderabad, and Dr. Krishnayyah, Educational Officer, Administered Areas.

The total number of prizes awarded was 33, one of which was kindly given as an extra prize for Boys' tailoring by Mr. Md. Husain Jafery.

The Dar-ul-uloom High School, gaining the highest number of prizes, was awarded a Special Certificate. The Exhibition was thrown open to the Girls' Schools on the 15th and 16th September from 4-30 to 7 p. m., Purdah arrangements being ably carried out by the Committee and helpers from several schools. It was estimated that 1500 girls and teachers visited the Exhibition. After the close of the Conference, the Exhibition was open to the Boys' schools, 15,000 boys visiting it on Saturday, the 17th September. The next day, Sunday, was kept exclusively for the City College boys numbering 1200.

Our thanks are due to Mr. Azam for allowing the Exhibition to be housed in the City College and for his very helpful suggestions in the setting up of the same, also to

causes of backwardness, and also by instruction as to the best methods of treatment to be given to individual cases

I myself consider that a great deal could be done in a co-operative way in the class by utilising the spirit of helpfulness that exists among boys. We often give this tendency opprobrious names such as "copying" etc., but when one considers the matter—though I do not wish to argue for wholesale copying—from one point of view it is really a virtue, and reveals the spirit of helpfulness. I believe this spirit could be utilised in a legitimate way to help the backward boy. After all, a class should be a co-operative society and the more it can be made so the better, and it does seem if a class can be developed in this way that it would help towards the solution of the problem before us and have a beneficial influence on the other pupils as well.

May I, in closing, appeal to teachers to avoid the tendency which the rigid examination system seems to encourage of specialising on the few bright pupils, the "race horses" of the class, and to devote equal and even more attention to the average and particularly to the backward pupil. Plato said, of old, "The government of a country ultimately represents the average opinion of the average citizen." If that is true, what a great responsibility is ours to train the "average citizen," and the backward boy is destined ultimately to become one of them.

Real mental defectives, of course, should have special treatment in special schools with a special curriculum, but I do not think it helps the backward child to be sent to such an instituation as there is a certain amount of stigma attached to attendance there and a sense of inferiority is engendered and this is the very thing which in a backward child should be eradicated.

As the resolution implies, it is treatment in the existing schools that should be applied. What is very necessary is a proper diagnosis of the causes of backwardness in order that the right steps should be taken. Backwardness may be due to many causes. It may simply be retardation due to absence or starting school at a later age than usual. A special class could be instituted for such pupils, though this, of course, brings us up against the financial problem as it means extra teachers. There may be other causes such as malnutrition, or some physical defect which the school medical inspection can locate and remedy. Teachers by getting to know pupils in their homes can often ascertain where the cause really lies, though, of course, this demands more time from the already overworked teacher, and I realise the difficulties involved in accomplishing it. The main thing is that the cause should be diagnosed early and that the proper remedies should be taken at an early stage, before the weakness becomes irremediable. Psychological tests in England have revealed the fact that backwardness increases very rapidly if not taken in hand early, e. g., a child who is one year backward at five years is found to be two years behind in his mental development at the age of seven and three at the age of fifteen. This is a startling ratio and reveals an imperative need for remedies to be taken early. The primary school therefore demands special attention in this respect.

The Teachers' College can help very much by seeing that its curriculum includes such courses as will help and equip teachers both in the matter of right diagnosis of the

Conference came to a close with prayers by Moulvi Hisamuddin Saheb for the long life and prosperity of H E. H. the Nizam and for the success of the Association.

Education of 'Backward' Children [1]

BY

Rev. F. C. PHILIP, M. A.

Warden, St. George's Grammar School, Hyderabad Deccan.

The need for a resolution of this character, after all that has been said is, I think, self-evident. The waste due to the neglect of backward children is a wastage not only of money, but what is more important, of human life, which, after all, is the true wealth of a nation. I do not know the percentage of such children in Hyderabad schools, but it has been estimated by experts in England that 10% of the school-going children of London would come under this designation and presumably the same would apply to Hyderabad. The real problem, however, is not in the percentage but in the prevention, and a great deal can be done to avoid the wastage if early treatment is undertaken. Criminal reformatories, lunatic asylums, etc, reveal the anxious care bestowed by Government upon the defectives in the general walk of life. The care of backward children surely demands equal consideration. The backward child has just as much a right to realise his fullest possible development as the clever child, but there is a tendency in many schools to educate the latter at the expense of the former. We are not here as teachers however to train "academic race horses" and leave the draught horses to look after themselves. The latter have an equal right to consideration and after all the burden of the world's work is done mostly by the draught horses and not by the race horses.

---

1. Text of a speech made at the Sixth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association.

life. The resolutions moved to-day in the Conference are very useful and, if action is taken on them, they ought to contribute much to the progress of teaching in schools. I agree with the report on the teaching of classical languages. The classical languages enshrine the great lives of ancient and historic peoples. The study of classical languages which are so full of the human touch, helps the reconstruction of history and gives one an insight into the life of the ancients. I am therefore in entire agreement with the recommendations made for encouraging the study of classical languages and improving their teaching in schools.

"I must also express my perfect sympathy with Mr. Wahajuddin who moved the audience by his eloquent plea for rationalising the curriculum of Girls' schools. Girls should be educated as girls and not as female boys. Mere book learning is not of much use. To take a girl through the secondary and college courses and then allow her to drift is, I say, waste of precious life. We are very fortunate indeed in having in our midst Mrs. Rustomji Faridunji to-day for whose excellent work in the field of women's education I have no words enough to praise. Her work is such that it will yield results after generations and not immediately. I must not forget to thank Dr. Krishanayya for his interesting paper. In conclusion, I say that I go away carrying with me a sense of satisfaction and pleasure. I shall always be anxious to hear reports in future that the Teachers' Association is working well. I wish it all success and suggest that the Association should not cease in its efforts even if there may be any occasional incidents that tend to retard its progress."

Mr. Shaik Abul Hasan, Secretary of the Reception Committee, thanked Nawab Sir Nizamat Jung Bahadur, Mr. S. M. Azam, Mr. Syed Mohamed Husain Jafery, Dr. Abdul Haq, Dr. Krishnayya, Mr. Wahajuddin and others who had helped to make the Conference a success. The

study suggested by Mr. Wahajuddin. She then described the scheme for the proposed All-India Central College for Women, which was going to be opened shortly at Delhi. That institution, she said, would provide for what the Indian child in Indian conditions needs. The curriculum would emphasise domestic science and fine arts, and, though the medium of instruction would be English, the students would be required to satisfy a vernacular test. She anticipated that girls trained in this college would revolutionise Indian life and thought within ten years.

Mr. Salim Bin Sayeed, B. A., B. T., Secretary of the English Sectional Meeting, read a brief report of the proceedings of the meeting, while Mr. Nazeer Husain Sharif read a report of the work done by the Exhibition Committee, of which he was the Secretary.

The President's Concluding Remarks

After distributing the Exhibition Prizes, Nawab Sir Nizamat Jung Bahadur made his concluding remarks, of which the following is a brief summary :—

"I have listened with much interest to the various discussions so ably and eloquently carried on during the Conference. I have been very much impressed with what I have seen and what I have heard during the last two days. I would like to mention the excellent Exhibition and congratulate the Teachers' Association on the great work that it has been doing on the right lines. I was rather struck, during the discussion on the education of backward children, with the admirable feeling of human sympathy which was emphasised. I am inclined to believe that the problem is a serious one and requires our fullest sympathy and consideration. My friend Mr. Philip deserves to be congratulated on his able defence of the backward boy. A suggestive contribution regarding the idle boy, as he called it, was made by my friend Mr. M. Pickthall, wherein he gave a number of interesting references to English public school

(2) That the original rule regarding the absence of members from the monthly meetings of the Association be retained.

It was also decided that two Sub-Committees should be appointed by the Central Executive Committee to prepare reports during the ensuing year on "The Problem of Backward Children" and "Kindergarten" respectively.

Lecture on Experimental Psychology

Mr. Faiz Mohamed Khan, B. A., Dip. Ed., Assistant, Darul Uloom High School, read a very interesting paper in Urdu on "Experimental Psychology." The chair was taken by Mr. Qazi Mohamed Husain, M. A. (Cantab), Principal, Osmania College. The full text of Mr. Faiz Mohamed Khan's paper will be found in our Urdu Section.

Concluding Session

Nawab Sir Nizamat Jung Bahadur took the chair punctually at 2-15 p. m. Moulvie Hisamuddin Saheb, Secretary of the Sub-Committee on Classical Languages, read the report prepared by the Sub-Committee. The recommendation of the Sub-Committee that the Study of Classical Languages should be made compulsory in the Middle and High stages was opposed by some members. At the suggestion of Mr. S. Ali Akbar, it was finally decided to accept the Report and to refer the Resolutions passed by the Sectional Meeting to the Executive Committee of the Association for consideration and necessary action.

Dr. Krishnayya, M. A., Ph.D., Education Officer, Administered Areas, then read a paper on "How to Improve as a Teacher," which was followed by a lecture by Mr. S. Wahajuddin on "A Plea for rationalising the Curriculum of Girls' Schools." Reports of both these contributions appear elsewhere in this issue. At the request of the President, Mrs. Rustomji of the All-India Women's Conference fame, expressed her views on the subject of Mr. Wahajuddin's lecture. She said that she was in entire agreement with the principles underlying the courses of

will be published in our next issue. At the special request of the Chairman, Mr. S. Wahajuddin, B. A., B. T., Lecturer, Aurangabad Intermediate College, explained in Urdu the important points of Professor Hanmanth Rao's lecture for the benefit of teachers of Primary schools, of whom quite a large number was present. While thanking Messrs. Hanmanth Rao and Wahajuddin on behalf of the Teachers' Association, the Chairman dwelt on the value of excursions to places of historic interest, and, in this connection, called attention to the excellent Report on the Teaching of History which had been prepared three years ago by a Sub-Committee appointed by the Teachers' Association with Professor Hanmanth Rao as Chairman.

SECOND DAY

Morning Session

Sectional Meeting on Drawing

A Sectional Meeting on Drawing was held from 9 a. m. to 10 a. m. with Mr. Syed Mohamed Husain Jafery, B. A. (Oxon), Deputy Director of Public Instruction, in the chair. Mr. Shaik Abul Hasan, B. A., B. T., Chairman of the Sub-Committee on the Teaching of Drawing, read the report prepared by the Sub-Committee. This Report was adopted by the Sectional Meeting and subsequently by the Conference with a few modifications suggested by the Chairman. In his concluding remarks, Mr. Syed Mohamed Husain said that in the course of his inspection tours he had observed that sufficient importance was not attached to the teaching of Drawing in schools, as was shown by the inadequate time allotted for this subject in the time-table. He stressed the educational value of Drawing.

Business Meeting

The Sectional Meeting was followed by a Business Meeting of the Association presided over By Mr. S. M. Ali Akbar. The following resolutions were passed :—

(1) That Dr. Krishnayya, Educational Officer, Administered Areas, should represent the schools in Secunderabad and Bolarum on the Central Executive Committee of the Association.

the speech made by Rev. F. C. Philip in seconding the Resolution appears elsewhere.

After some discussion, the Resolution was carried by an overwhelming majority.

The morning session of the first day of the Conference closed with an eloquent and instructive lecture by Mr. Marmaduke Pickthall on "The Problem of the Idle Boy." Mr. Pickthall spoke extempore in his impressive style, but, at our request, he subsequently wrote out the main points of his speech in the form of an independent article, which we have published elsewhere and which, we are sure, will be read with the attention which contributions from a man of his literary eminence are always entitled to. We take this opportunity of thanking Mr. Pickthall for keeping up his interest in the Teachers' Association and in *The Hyderabad Teacher*, of which he was the first editor.

Afternoon Session

The afternoon session was devoted to Sectional Meetings on English and Classical languages respectively, which were held simultaneously. Both the meetings were well attended. The Sectional Meeting on Classical Languages, which was presided over by Dr. Abdul Haq, D. Phil. (Oxon), resolved that a classical language should be made compulsory in the Middle and High stages.

A report of the Sectional Meeting on English appears elsewhere.

Lantern Lecture.

In the evening Mr. S. Hanmanth Rao, M. A., L. T., Professor of History, Nizam College, gave a lantern lecture on "A Peep into the Cultural History of Early Deccan." Mr. S. Ali Akbar took the chair. Professor Hanmanth Rao gave a vivid account of the famous caves of Ellora and Ajunta, incidentally throwing light on the civilization and culture of the periods concerned. A report of his lecture

Principal, Teachers' Training College, Mrs. Rustomjee, Miss Read, Miss Tyler and Messrs. Faizuddin, Ahmed Husain Khan and Syed Husain, Divisional Inspectors of Schools.

FIRST DAY

Morning Session

Nawab Sir Nizamat Jung Bahadur performed the opening ceremony of the Educational Exhibition at 10-15 a. m. After Mr. Ali Akbar, Chairman of the Reception Committee, had read his Welcome Address, the Conference passed a resolution expressing its deep sense of grief at the sad death of Mr. Zahoor Ali and its sympathy with the bereaved family. Mr. S. M. S. Mashadi, the General Secretary of the Association, then read the Report of the Association for the Year 1931-1932, extracts from which were published in the last issue of *The Hyderabad Teacher.* Mr. Ali Mohamed Ajlal recited an Urdu poem which he had written for the occasion. This was followed by Nawab Sir Nizamat Jung's learned and inspiring Presidential Address, the full text of which appears elsewhere in this issue.

Resolution on the Education of Backward Children.

At the conclusion of the Presidential Address, the Conference proceeded to discuss the following resolution :—

" This Conference is of the opinion that more attention should be paid in the existing schools to the education of 'Backward' children and also that greater importance should be attached in the Teachers' Training Institutions to the methods of educating such children ".

After giving a short account of the arrangements made in America and other Western countries for the education of 'Backward' children, Mr. Gulam Dastagir, the mover of the Resolution, showed how such children were neglected in Indian schools and urged that a beginning towards the scientific solution of the problem should be made by taking the measures recommended in the Resolution. A report of

Ladies and Gentlemen, I have now finished what to most of you must have been a trying and boring recital of dry-as-dust stuff. My only apology for this infliction is that we have so long sat with stuffed ears and folded hands, supremely indifferent to the education of the future mothers of the country, that it is about time that we made an earnest endeavour to make amends for the past negligence, remembering that a community which dilly-dallies with its female education and does not attempt to make it rational can have no hope for the future. If my speech has brought to you a realisation of this fact, then my labour has been more than repaid. I thank you, ladies and gentlemen, for the patient hearing you have given me.

Proceedings of the Sixth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association

BY

THE CHIEF EDITOR.

The Sixth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association was held at the City College, Hyderabad, Deccan, on the 15th and 16th September, 1932, under the presidentship of Nawab Sir Nizamat Jung Bahadur, Knight, C. I. E., O. B. E., M. A., L. L. M., (Cantab), Barrister-at-Law, formerly member of the State Executive Council, Hyderabad, Deccan. Owing to heavy rain, the gathering at the first sitting of the Conference was not as big as in previous years, but the attendance improved and assumed its usual proportions during the subsequent sittings. Among those who were present at one or more sittings of the Conference were Nawab Akbar Yar Jung Bahadur, Home and Educational Secretary, Mr. Khan Fazl Mohamed Khan, Director of Public Instruction, Mr. Qazi Mohamed Husain, Principal, Osmania College, Mr. Syed Mohamed Husain Jaferi, Deputy Director of Public Instruction, Mr. S. M. Azam, Principal, City College, Mr. Sajjad Mirza,

Education and Music as optional subjects. Child Study should be made optional with Higher Mathematics, Biology with Higher Science, Music with History and Geography, while the following should be compulsory subjects of the Curriculum: English, Urdu, Domestic Science (including an advanced course in Sewing and Cooking and Nursing), and Morality and Religion. The Course in Education should also include practical teaching of Children. I am confident that the proposed curriculum will win the approval of Indian parents, and will considerably popularise High School Education in these Dominions.

University Stage—I do not want to make any comprehensive suggestion in respect of University Education. It cannot be denied, however, that the need for a reshuffling of the courses of study in the university is greater in the case of women's education than in the case of men's education. My argument in the earlier part of this speech that we educate our women for economic independence, whereas their's is and shall be for a long time to come a position of economic dependence applies with still greater force to University Education. Many careers which have been thrown open to women in Europe are not open for them here. Only the barest minority of our lady graduates can be absorbed in the services, where the competition bids fare to be keener than ever. While admitting that such women as aspire for a University education should by all means have it, I beg to submit that it will be only in the fitness of things if our University sheds some of its conventionalism, and finds a place for subjects like Child-study (already provided for men in the Teachers' College), Music, and Domestic Economy in its Faculties. Even the convention-bound University of Madras has only recently made a welcome departure in allowing Music as an optional subject for girls in the Intermediate Examination. Why cannot the Osmania University make arrangements for teaching the subjects referred to above?

the Middle, we shall be extending the scope of the usefulness of our girl's education. We have already a prototype of these Institutions in the Victoria Memorial Orphanage at Saroor Nager, where the girls are taught some very useful handicrafts. We should, however, take care to see that the practical side of education is provided for, and that some sort of general knowledge is also imparted in these Schools. As in Japan, I beg to propose that our Continuation Schools should offer a 2-year course, which should include training in at least one of the following vocational subjects :—

Weaving, Carpet-making, Cane work, Basket-making, Rope-making, Kashida, Karchob, Mat-making, etc.

As an experimental measure, the existing Normal Schools for women teachers should be equipped for teaching these subjects. In course of time, when these schools are established, they will prove more or less self-supporting, as there will be considerable income from the sale-proceeds of the manufactures. In the Victoria Memorial Orphanage, we have also an institution for supplying teachers for these handicrafts. As I have already pointed out, the expenditure on the Middle Schools for Girls needs to be further augmented, and, in view of the peculiar circumstances of our society, where girls are withdrawn from schools after the Middle Stage, more encouragement should be given to these Continuation Schools.

High School Stage—In common with British India, our High School Curriculum is dominated by the University, and is suffering from too much of the cultural and liberal aspect of education. It is imperative that, side by side with the liberal studies, we should make our High Schools an adequate training ground for the primary functions of home life. By all means, have a liberal curriculum, but, side by side with it, make arrangements to extend their sphere of usefulness. Thus I beg to propose that like the Women's University at Poona, we should have Child Study,

and so that they may at the same time have access to the higher branches of learning. Since, however, a very, very small percentage of our girls actually proceeds to the University stage, our curriculum should make adequate provision for a sound training of those who are destined to leave school after the High or the Middle School.

Primary Stage—As I have already pointed out, the new Primary School curriculum proposed by the Department, and in force from the 1st of Amardad, 1341, is a distinct advance on the old one, and may be tried with just a few changes here and there. Story-telling in the Primary Stage should be replaced by singing, and Callisthenics should be substituted for Physical Training. Hygiene should be dropped, as it is already covered by the course in Domestic Economy. Rural knowledge and Manual Instruction should also be dropped, the latter being provided for by the Sewing course in Domestic Science.

Middle Stage—The course for the Middle Stage does not need any alterations. The Department has already very wisely made Domestic Science optional with Algebra and Geometry. I shall, however, suggest that the course in History and Geography should be reduced, and should be made optional with Nature-study. According to the curriculum which I shall shortly submit to you for use in the girls' high Schools, it should not be necessary for those girls who want to proceed to a High School to take Algebra and Geometry compulsorily. Before doing that, however, I must devote some time to the curriculum of the proposed Continuation Vocational Schools, on the need of which I have already dwelt.

Continuation Vocational Schools—As I have already pointed out, it is highly necessary to have a bifurcation of the course at the Middle Stage. A very small percentage of our girls really take advantage of the High School course, and if we have a chain of Continuation Schools, teaching some craft to those girls who are removed from School after

of 14, a girl should have the option of either proceeding to the High School, or of going over to a Continuation Vocational School on the lines of Japanese Continuation Schools. In these Schools, during a two-years' course, our girls, specially those whose circumstances will not allow them to pursue a higher course, should be fitted for some particular craft, such as Kashida, Karchob, Knitting, Basket-making, Rope-making, Cane work, Carpet-making etc., which may enable them to earn a little money and thus supplement the slender resources of their husbands or their families. As you will see from the list of subjects which I have proposed to be included in the curriculum of these Schools, care should be taken to impart to the girls some liberal education side by side with the vocational courses. Our present expenditure on the Middle stage of the girls' education is only 59000/-, which is very much lower than what we spend on our Primary and High Schools. It is here that the need for a careful redistribution of expenditure arises. More money must be found for this stage. If these suggestions are followed, our Middle Schools and the Continuation Schools will become very popular, and incidentally will help to check the process of wastage to which I made reference in the earlier part of my speech. It is thus alone that we can hope to conquer the feeling of apathy, if not of actual antipathy, which the villagers have against the education, and particularly the secondary education, of their girls.

I shall now read to you the curriculum which I propose should be adopted at the different stages of our girls' education. I do not claim any originality for these proposals. My sole aim in offering these suggestions is to place female education in these Dominions on a more rational basis, so that the present breach between the home and the school, and the school and society may be filled up, and our girls may be equipped with that knowledge which may be of real service to them in their every-day life (e. g., Knowledge of Child-study, Nursing, Domestic Science)

has been providing an education essentially for the higher and the upper middle classes. It has not given any thought to the conditions of life obtaining among the lower middle or the lower classes of Society. The result is that already one finds that the educated products of our Middle and High Schools are being quoted below par in the matrimonial market. We have so far made the fundamental mistake of educating our girls for a life of economic independence like their western sisters, whereas theirs is, and will be for a long time to come, essentially a life of economic dependence.

Coming now to the second aim, which has been unfortunately so far neglected, we find a lot of opposition against the functions of Wifehood and Motherhood being given a prominent consideration in curriculum making. Even our ladies, present company always excepted, seem to accept this statement of facts with a silent reserve, and in an apologetic, protesting way which seems to suggest as if Nature had made a mistake somewhere in saddling women with these functions in the scheme of creation. We must not shut our eyes to the fact that in India an overwhelming majority of girls are destined for a married and home life. It is to that end that we must educate them.

It is a happy sign of the times that this need has been realised all round. The Poona Women's Conference, the Madras Women's Educational Officers' Conference, and even some departments of Public Instruction, have declared themselves as favourable and sympathetic to this aim. Our own Educational Department has thoroughly revised its curriculum of girls' schools, specially in the branches of Domestic Science and Hygiene. This currriculum, if given effect to by a preparation of suitable text-books, will represent a distinct advance on the curricula of most of the Provinces. What is needed now is the provision of alternative courses of study at every stage. The crying need of the day is a bifurcation of courses at the Middle School Stage. After passing the Middle Examination at the age

of instruction in the High School stage and was teaching such important subjects as Education, Child Study, and Hygiene in its institutions.

You have only to look at the results, obtained from the 75 years of liberal and literary education of our young men, to realise how much more serious the consequences of such an indiscriminate education of our girls are going to be. Is it any exaggeration to say that our University-educated young men are completely divorced from their environment? They develop a hatred of every thing old; they lose their freshness and originality, acquire an exaggerated sense of self-importance and false dignity, and become incapacitated to face the struggle for existence. I need only refer you to two recent utterances from responsible quarters to convince you of the truth of this indictment. Sir P. C. Ray, in the address which he delivered at Madras, actually sneered at the graduates of Madras and Bengal for seeking employment on Rs. 20/- and 25/-, while Sir C. V. Raman in his Convocation Address this year at the University of Bombay, expressed himself very strongly against the so-called liberal education of our Universities and went even so far as to suggest substitution of Science Courses for Arts courses.

We are already face to face with some of the evils which this aim of curriculum-making has brought in its wake. The practical side of our girls' education has been sadly neglected. There has been a considerable weakening of the home influence. Our schools and colleges are producing, with a very few noble exceptions which have been produced in spite of the Curriculum, blue-stockings, young girls who can talk glibly on anything under the sun, except the immediate things of their own environment. These products of our girls' institutions are unfit to cope with the complexities of the Indian home or the Indian joint family. They can cut a dodecahedron or an icosahedron from card-board, but in most cases they cannot stitch a shirt for the back of the little one. Our curriculum

convincing the parents of the utilitarian and not merely the cultural side of the curriculum, a considerable measure of the wastage referred to above may be avoided.

In every country there are always two rival aims claiming the attention of those who frame the curricula for female education. One of these is the equality of the sexes, the emancipation of women, and the provision of equal opportunities, so that the two sexes may compete on equal terms. The second aim is to provide the girls with a liberal education, and at the same time to fit them for home and married life. Unfortunately, the first aim has always been predominant in the High School education of girls in our country. Their curriculum has always been made identical with that of the boys. In this connection, I crave leave to make a personal observation. About seven years back a women's journal in the Punjab invited me to contribute a series of articles on this very subject, the curriculum of Girls' Schools, and before doing that I sent a sort of questionnaire to almost all the important institutions for the education of girls in this country. I also approached the Educational Departments of some Provinces for information and enlightenment. Ladies and Gentlemen, you can only imagine my feelings of disappointment when on going through the information supplied, I found that everywhere our girls were being educated not as girls but as boys. Institution after institution, and Department after Department told me that they did not follow any separate curriculum of studies for girls, but taught them the very same subjects as the boys were taught, with sewing and cooking thrown in here and there. In this desert of misspent efforts and wasted life, there was only one oasis, and it was the curriculum followed in the Women's University at Poona and the Seva Sadan institutions. It was a pleasant surprise indeed to find that this University, founded and run by public enterprise, was providing alternative courses

the various stages. I may also point out in passing that these figures reveal that, in common with British India, there is a serious wastage in education, that only 8.5 % of girls in the Primary Stage pass on to the Middle Schools, and 1 out of every 35 girls in the Middle Stage enters our High Schools. In British India, 18 % of girls in the Primary Stage pass on to the Middle Schools. The Hartog Committee have estimated that this wastage in terms of money amounts to a total loss of 14 crores for four years between Classes I and V.

It will be wrong to assume that the Department of Public Instruction is in any way responsible for this enormous amount of wastage which occurs in education. There are other causes for this, causes over which the Department can have no control. A few of these are the gross poverty of the masses the economic position of the villagers which prevents them from taking the fullest advantage of the money spent by the Government on education, epidemics, diseases etc.; seasonal migration of parents, the barriers of caste, communal and linguistic difficulties and, finally, the peculiar social customs of the country, such as the Purdah system and the practice of early marriages. In connection with the last named customs, it will be instructive to learn that, according to the Census Returns of 1921, 22½ lakhs of girls were married under the age of 10, and as many as 85 lakhs were married under the age of 15. This itself is sufficient to absolve any Department of Public Instruction in India from the responsibility for not promoting mass education among girls.

I am sure some of you are wondering where these statistics are going to lead us, and what possible bearing these figures have on the problem in hand, viz. the Curriculum of Girls' Schools. My only apology for giving these boring details is that with their help I hope to prove that by making suitable changes in the curriculum, and by

having a larger number on their rolls than heretofore, and the expenditure on female education shows considerable increase. All these are hopeful signs indeed. But the time has come to take stock of our past progress and to assess it in respect of consolidation as well as of expansion, quantitatively as well as qualitatively, and to explore the possibilities of improvement.

The total number of girls' schools of all denominations in our State is (according to the D. P. I's Report for 1338, from which I have taken my figures) 697, having a total number of 40,000 girls on their rolls. The total female population of school-going age in our State is 9,19,000. Thus the proportion of girls under instruction to the total school-going population is 4.2% This figure does not compare favourably with the British Indian figures, where Burma leads with a percentage of 18 girls to the total population of school-going age, and Bihar and C. P. are the lowest with percentages of 4.4 and 4.8, respectively. The distribution of girl students in the various stages of instruction is as follows:—

Primary Stage	36,000
Middle Stage	3500
High School Stage	143
College Stage	11

The expenditure for the different stages of instruction is as follows:—

Primary	4.33 Lakhs of Rupees
Middle	59,733
High Schools	1.58 Lakhs
College	17,831

My object in giving these figures, which, I am afraid, may appear to most of you as a mere boring detail, is to focus your attention on the larger and more important problem of redistribution of expenditure involved in the changes which I am going to propose in the curricula for

Rev. F. C. Philip, who was present, to enlighten the audience with his views on the points raised in the discussion. Mr. Philip, in a brief speech, expressed agreement with the main trend of the discussion.

Owing to lack of time, the Resolution moved by Mr. Naik and seconded by Mr. Nakvi, urging the need for postponing the study of English till Class V, could not be discussed at the meeting that day, and it was resolved to refer the resolution to the Central Executive Committee of the Teachers' Association for its consideration.

A Plea for Rationalising the Curriculum of Girls' Schools[1]

BY

SYED WAHAJUDDIN, B. A., B. T.,

Lecturer, Osmania Intermediate College, Aurangabad

LADIES AND GENTLEMEN,

I shall not attempt to survey the policy of Female Education in this country, nor insult the intelligence of this learned audience by presuming to read to them a lecture on the importance of Female Education, but I shall at once come down to the brass-tacks of the problem.

Girls' education in this State has been making considerable headway recently, thanks to the generous and far-sighted policy of our Educational Department. We have had the Zenana College, Nampally, raised to the status of a first grade College; and only this year we have seen a lady-student of this College topping the list of all the successful candidates in the B. A. examination of the Osmania University. Our High and Middle Schools are also

1. A Lecture delivered at the Sixth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association.

purposes. He elaborated the plea with the help of concrete examples. He was of opinion that even in the High School stage it was possible by means of good teaching to get our boys to appreciate the best in English Literature as to matter, form or style.

Mr. Parthasarathy of the Nampalli High School and Mr. Sundaram of the Methodist Boys' High School also took part in the discussion.

While one or two speakers seemed to favour the utilitarian aim only in the teaching of English, the consensus of opinion appeared to be in favour of the suggestions advanced by the opening speaker.

This controversial point having been thus settled, the other topics, namely the teaching of grammar, composition, and the text book were briefly considered. There was no difference of opinion at all on the subject either of Dr. West's Readers or of grammar. All agreed that grammar should occupy a prominent place and the teaching of it should be conducted in the modern inductive method. In regard to composition, it was emphasised that boys should have more practice in oral work, and subjects that were too abstract should not be set off-hand to the boys without giving them an opportunity of discussion in the class beforehand. The complaint of some teachers in regard to the difficulty of finishing text books in time was very ably answered by Mrs. Garden, who contended that the object of teaching English was to teach English and not the curriculum.

Since all these different subjects had been thoroughly explored and discussed by the Sub-committee on the Teaching of English appointed three years ago with Rev. F. C. Philip as Chairman, Principal Azam invited the attention of all the teachers of English to the report prepared by that Sub-committee and recommended that it should be studied closely by them. He also requested

examples. In the earlier stages, grammar should be taught incidentally and only as much as was necessary to ensure accuracy and precision of expression. He read out to the audience some specimens of un-English English and regretted that there should be such mistakes in the writing of boys even after a course of secondary education. He felt sure that if we accepted the aim of English teaching as a happy combination of the cultural and the utilitarian aims, as he had ventured there to outline, and made judicious use of the reading material provided in Dr. West's Readers, we should, in due course of time, achieve results more commensurate with our labours than we did at present.

Mr. Wahajuddin of the Aurangabad College, who next rose to speak, argued spiritedly against the cultural aim and opined that we should be content with the utilitarian aim only. He pleaded for a working knowledge of English. He was strongly of opinion that grammar should be given a prominent place in the teaching of English.

Mr. Doraiswamy of the City College, who supported the main speaker, said that he could not agree with the statement of Dr. West who made an earnest plea for utilitarianism saying that a Bengalee boy needed only to read English. Since the time of Plato the aim of education had never been bread and butter. The phrase 'practical working knowledge' baffled him. He did not know its definition. Nobody knew the exact amount of English required by an Indian boy. He asked, if the aim of English teaching was only to give a practical working knowledge of English, should not the teaching of poetry be dropped and replaced by the teaching of a few thousand words needed for actual business? If everything English in tone, in atmosphere and in character that we find in the works of Johnson, Hazlitt, Addison, and other writers was left out, he saw only a vacuum left. The utilitarian aim in education was possible or permissible only in the case of an adult, who tried to learn a modern language for commercial

placed were peculiarly English. But if the children in the lower stages were familiarised with English scenes through pictures and other materials, and if they were acquainted with English manners and customs, in short, if they were provided with a sufficient English background, the cultural aim was attainable so far as the ideas were concerned. The speaker was not sure if the cultural aim could be realised so far as the appreciation of language was concerned. By appreciation of language he did not mean merely the appreciation of phraseology or syntax or rhythm. He meant by it the appreciation of the inherent sonority of the English language. He thought that intrinsically there was no real contradiction between the cultural and the utilitarian aims. Only, the utilitarian aim was a preliminary stage in the learning of a language, whether native or foreign. And, as in all such preliminary stages, the reading material had to be very carefully selected and properly graded, it was of the utmost importance that we should have suitable readers for use in this stage. He approved of Dr. West's New Method Readers as they were neither too Indian nor too English. They were not ideal nor incapable of improvement, but of all the published Readers, they were unquestionably the best. They gave scope to the teachers for giving different types of lessons. He then briefly described the procedure for such lessons. Talking of home-work, he said that it was usually understood to be writing work only, but he meant by it any work set to be done at home. He observed that boys were overworked with homework owing to the absence of previous consultation among the teachers of different subjects, and the result was that the boys produced shoddy work all round. As regards composition, he suggested, among other things, that oral composition should be introduced even in the High School Classes in the form of lectures. Then as regards grammar, formal grammar was not to be taught before two years' study of English, and even then the better method was to proceed from examples to rules and back again from rules to

of the eight to twelve hours' tuition a week in English and even after a course of secondary and collegiate education, the students did not know how to express themselves in good English. When he visited Germany three years ago and inspected some secondary schools, the standard of the teaching of English there had startled him, although less time was devoted to the study of English in Germany than in India. He said, "We make a fetish of English in our schools and yet achieve little. Whether proper text-books are lacking or whether the environment necessary for the learning of modern European languages is absent, I cannot say, but I am afraid we have not been teaching English as it should be taught. So it is with a view to finding out where the defect lies that this meeting has been called".

Mr. Azam then called upon Mr. Ataur Rahman of the City College to open the discussion. Mr. Ataur Rahman in opening the discussion said that Indian educationists were not agreed about the aims of teaching English. Some advocated the cultural aim and others emphasised the utilitarian. The utilitarian aim had acquired a peculiar connotation when Dr. West of the Dacca University had narrowed it down to giving our boys reading ability only. "Could any man get on in life with reading alone, asked the speaker? Had he no occasions when he needed to express himself in English? He then asked himself whether the cultural aim was attainable. He answered that it was and it was not. How far were Indian students and Indian teachers capable of appreciating the ideas in English Literature? When the thought was too exclusively English they were not able to appreciate it fully. Descriptions of English country scenes called up wrong images in the minds of the children; for instance, the Indian bullock cart was always present whenever they thought of the English countryside. Addison's restraint of feeling was peculiarly English, while Goldsmith's buoyancy had a universal appeal. There were Beau Tibbs in Hyderabad as well as in England, but Sir Roger-de-Coverly and the situation in which he was

us who are teachers can ill afford to postpone the duty that is ours of making ourselves more like what we feel we would like our teachers to have been.

Report of the Sectional Meeting on the Teaching of English

BY

S. B. SAYEED, B. A. (Hons.), B. T.

In view of the importance attached to the teaching of English in our schools, the Hyderabad Teachers' Association decided to hold a Sectional Meeting on the Teaching of English in connection with its Sixth Annual Conference. Before this meeting was held, a series of Demonstration Lessons in English was kindly organised by Principal Syed Mohamed Azam at the City College. These lessons, which were given by Mr. Ataur Rahman during the week immediately preceding the conference, were attended by a very large number of English teachers from nearly all the Primary, Middle and High Schools of the Headquarters Division. With the ground thus prepared, the Sectional Meeting was held on the 15th September in the City College Hall with Principal Syed Mohamed Azam in the Chair.

The proceedings commenced with a brief speech by Mr. S. Ali Akbar who introduced the Chairman and explained the object of the Meeting.

In the course of his opening remarks, the Chairman said that the fourteen years' experience he had had of organising school work had presented him with certain doubts and difficulties in regard to the teaching of English. English loomed large in our curricula. It gave us access to modern and scientific ideas and kept us in touch with world affairs. But one had to find out what was lacking in the teaching of English in our schools when one discovered that, in spite

General and Professional reading—The teacher who wishes to maintain his professional self-respect will have to do not a little private reading. The subject matter of most subjects is ever broadening and changing, and so, if a teacher is to know more than his pupils, and in subjects other than those he is teaching, he can hardly afford to rest content with the work done for his B.A. or the Matriculation. Unless he has clear mental pictures his teaching will betray obscurity of thought and imagination. Besides adequate study of the subject taught and the related fields, the progressive teacher should conscientiously allow himself a certain amount of biography, fiction, travel and general literature in order to give his teaching breadth and perspective. To this end better libraries and larger use of library facilities should be recommended. The reading habit most unfortunately seems absent in the vast majority of the men who are expected to inculcate this in the next generation.

Interest in pupils—Finally, no teacher can make a success of his job until he very early establishes a friendly relation with his pupils. It is easy enough to be guide and philosopher but to enter into sympathetic and human relations with his boys takes more patient study and persevering effort. The easiest way to get to know one's pupils is to see them off guard,—that is, at play, away from the unnatural and stifling atmosphere of the class-room. And yet, how many of our teachers take advantage of this fact? A keener interest in the raw material handed to us—and for which we are responsible—will result in the teacher exploring all avenues of helpful service to his trust.

I realize that I have not propounded any great profound truths, but I feel that too long have we been absorbed with subject matter and curriculum, equipment and appliances, and that it is time for us to study the hero of our drama and see how he might play his part better. If he is as important as we have been led to believe, we should spare no pains to enable him to play his part well, and those of

an intolerable nuisance! When things go wrong at school, as they surely will at times, the teacher should try to find out the cause of the trouble. Many times he will find himself to be at fault rather than his pupils or others. It may be due to loss of temper, hasty judgement or careless preparation. Obstacles are not nuisances or enemies but facts. There is the constant temptation for the teacher as for others, to regard a difficulty not as a challenge but as a misfortune, for which he at least is not to blame. The most effective method is to begin with concrete problems, through these to acquire general principles and then to make use of these principles until action in accordance with them becomes habitual. This is the difference between teaching intelligently and teaching mechanically. Problem-solvers are needed everywhere, but more so in teaching because the present procedure in this field is so dependent on rule of thumb and fashion and untested opinion. The cultivation of the problem-attitude is the beginning of progress.

Cultivating the Social Side—The teacher usually needs cultivating of the human side. He is often accused of knowing more of books than of people. The clannishness of some people is fatal to their growth. School masters often betray in this way what is known as "inferiority complex". The teacher should take an active interest in the life of the community. Participation in some civic activities and serving on local committees are to be regarded as opportunities for the development of personality. While social life even of the ordinary type has a tonic effect on the mind, more especially is to be sought the friendship of persons of character and versatility. Association with men of other aptitudes and ambitions, persons of large mental and moral horizons cannot but enlarge one's personality, correct one's conceit, enrich one's experience, and call out the best and the deepest. Thus can be overcome the pedagogue's besetting sins, pedantry, dogmatism, talking shop, etc.

Observing efficient teachers—If the teacher has observed himself critically, he is sure to want to notice how other teachers manage the difficult places. Visiting the classrooms of other teachers also serves as an impetus to more serious and concientious effort. It may prove a mirror to one's own faults. It is necessary that the teacher should start out with some definite problems in mind. Otherwise the visiting is likely to mean little or nothing. Very often another teacher's success will lie only in a different combination of essential personal traits, and so unless much thought is given to analysing and finding out what it is that is responsible for success, the secret will not be discovered. Usually the teacher whose work needs most improving is the one who finds least to commend in or profit from another's performance.

Many teachers are contented to go on from year to year without ever trying to profit from the example and experience of other teachers. If this opportunity for professional growth is not to be neglected altogether it may be necessary for inspectors and head masters to introduce a scheme for regular visits and tours. It will not be wasteful even to allow every teacher some time each year for such observation. Earnest teachers will return to their work with renewed vision and courage. Reports of these visits could be made and discussed with great gain at the teachers' meeting. It may be wise for the head master to make a few suggestions to the teachers both as to how to receive and treat visitors and also as to how to make a visit. Quite often some unnecessary and undesirable things happen when teachers visit other schools or other teachers' classes.

Problem-solving—Another means of cultivating an efficient teaching personality lies along the line of looking at every difficulty as a problem to be solved. Every pupil offers a series of problems; the syllabus and the methods of teaching present problems; many parents are hard to deal with; the head master himself is a puzzle; and the inspector

card out of the lists of the desirable qualities given above. The teacher who would make well balanced progress, must have such a conscious, definite programme. Without this comprehensive outline, there is the danger of stressing qualities in which one is fairly strong, and neglecting those which really need special attention. The teacher may use the marking system A, B, C, D, E, and grade himself with reference to the average in each quality. Sometimes it may be possible and advisable for a teacher to get some honest and friendly colleague to mark him on the basis of the list. It will be helpful to him thus to verify the reliability of his own estimates. Such a self-measuring sheet may be used once or twice a month. It has to be remembered that this analysis will be of little value unless the teacher adopts a detached objective attitude, studying himself as if he were considering some other person. Another matter which has to be borne in mind is that a single year of concientious effort in the use of such a plan will prove sufficient to lift intelligent teachers above the level of mediocre performance. Few can expect to approach perfection in all the traits on the list, but this is a scheme that promises years of pleasant and worthwhile effort. Good personality and effective teaching are largely matters of development. This fact makes the profession much more interesting than it would otherwise be and indicates that teaching has a real future for all those who teach with the intention of making progress.

Consultation—It may be worthwhile also to work out with others the trait-actions which can be performed for developing those traits. Whether a self-scoring system is employed or not, the teacher will do well to seek frank advice (whenever it can be done with safety) with reference to the improvement of his teaching-self. Such advice will be useless, unless there is the willingness and the resolve to carry out the programme that his counsellors may recommend.

experience and training. Dr. Clapp's study also supports the view that both experience and training have positive effect in improving teaching-personality.

Understanding 'Personality'—If a teacher believes that personality is the determining factor in the teaching business, that personality can be changed and that he does not have to be content with his present state, there are several things he can do. He may start by making a deeper study of the nature of 'personality.' A book like the *Personality of the Teacher* by Charles McKenny will serve to make clear the elements of personality. The author discusses sympathy, sincerity, dynamic knowledge, good breeding, growth in personality and the joy of living. Without understanding this, no teacher can make an intelligent approach to his problem.

Self-Study—No one improves as he should unless he studies himself constantly. If a teacher does not realize his shortcomings he will never change. The best way to do it is to formulate the problem and then to study it scientifically. Self-improvement is helped greatly by working with a definite plan. It is desirable to have a deliberate daily retrospect of the day's happenings. Without such a survey the teacher is not likely to know wherein he had succeeded and wherein he had failed, and why. From this point of view nothing is more suicidal than the attitude—"I never give my work a thought after the day is over". It does not pay to be so overwhelmed with work as to have little time for a calm and judicial review.

Self-measurement—The most definite suggestion that can be given regarding the improvement of personality is one which involves a self-measuring plan. Related to the daily retrospect is the writing of a complete analysis of one's teaching-self. The individual makes a comprehensive list of desriable qualities and then gives himself marks and grades. Any teacher can easily prepare such a self-marking

which each judged to be the most important constituents of a desirable teaching personality. He combined these judgements on the basis of the frequency with which each quality was mentioned, and thus obtained a list of ten qualities which had the highest number of votes. He then submitted this list to one hundred and forty inspectors and headmasters, and asked them to rank their five best teachers, first in the order of their "general teaching personality" and then in the order of their standing with reference to each one of the ten specific qualities. He thus obtained not only the combined judgement of experienced school men as to what, in theory ought to make up good teaching personality, but also the order in which these qualities actually appeared in a group of teachers recognised as superior from this point of view. The final order in which these ten traits stood is as instructive as it is unexpected:

1. Address (manner of meeting people)
2. Personal appearance
3. Optimism
4. Reserve
5. Enthusiasm.
6. Fairness
7. Sincerity
8. Sympathy
9. Vitality
10. Scholarship.

The Improvement of Personality—It would be useless to know what traits are desirable in a teacher if they are all beyond the possibility of cultivation. If personality could not be changed, the situation would be hopeless. Fortunately however the fatalistic notion that the important factors in the teacher's personality cannot be improved is not supported by facts. No doubt, there are some who cannot change very much, but after all allowance has been made for them, it must still be admitted that individuals can change, and develop these various qualities through the discipline of

It is an old proverb, and as true as old, that "the teacher makes the school." As the teacher, so is the school. However important the material environment may be in the way of grounds, buildings and equipment, however valuable good text books, a fine syllabus and up-to-date methods may be considered, the most important factor in the school, the heart of the school, is the teacher. To say that the success of the school as the instrument for the transformation of the raw material of the little children into efficient citizens depends upon the efficiency of the teacher, is so obviously true that no one is likely to question it. It is as true in the practical sense as in the philosophical that the teacher is the school. He corresponds to the main spring of a watch. He keeps everything going.

The Teaching-Personality—Many books on pedagogy and school management attribute the success or failure of a school to the teacher's personality. Rightly so. Teaching is based on personal relationship between the teacher and the taught. There is exerted an unconscious influence. The contagion of a teacher's spirit is a fact although it cannot be measured. It is difficult to describe what personality is; it is so mysterious and intangible. The word is very general. So, abandoning the general and vague term, we may mention the various qualities and abilities which go to form the teacher's personality.

People vary in personality because they possess different ideas, ideals, habits, manners, mannerisms, appearance, abilities, attitudes and interests. Not enough importance has hitherto been attached to the careful selection of teachers, though most are agreed on the desirability of a fine personality. Various studies and statements have been made of what constitutes good teaching-personality. One interesting investigation may be described here.

Dr. Clapp's Study—In 1913 Dr. Clapp of the University of Illinois, U. S. A., secured from one hundred experienced inspectors and headmasters a list of the ten specific qualities

How to Improve as a Teacher.[1]

The Cultivation of a Desirable Personality.

BY

G. S. KRISHNAYYA, M. A. (Madras), Ph. D., (Columbia).

Education Officer, British Administered Areas, Hyderabad.

I feel greatly embarassed to have to face this august assembly of educators and tell them how they might improve as teachers. I should not have been so presumptuous as to choose such a subject if I had known the kind of gathering I was going to address. However, my only reason for thinking of such a subject is that most people are eagerly clamouring for better teachers. Teachers themselves are anxious to improve and do their best. Pupils—if they were consulted—would urge the necessity for such a subject being discussed in such a conference; the parents and the public insist that our teachers need to improve considerably. And as for inspectors, there is nothing which they are so keen about.

The importance of the subject was made clear to those who attended yesterday's session. The Chairman of the Reception Committee, Mr. Ali Akbar, touched on the need for teachers possessing a fund of commonsense. The problem of the "backward boy," it was said later would have to be solved only by the teacher's painstaking and sympathetic treatment. As for the "idle boy"—who is very likely to be the opposite of the "backward boy,"—he makes a very big demand on the skill, understanding and resources of the teacher. For, human wastage lies as much in the neglect of genius as in the ignoring of the backward. The distinguished chairman in his presidential address dwelt largely on the tremendous importance of a new emphasis in education and pointed out that the crux of the situation lay in better teachers—teachers with a soul, a heart and a head. If as Sir Nizamat Jung said, teachers are "leaders of mankind," the "high priests of human nature," and the "moulders of world civilization," there is no doubt that the problem of the professional growth of the teacher could not safely be ignored any longer.

---

1 A paper read at the Sixth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association.

punishment and lack of sympathy before they reach the stage where education becomes interesting. It is so easy for a teacher to make a boy look a fool. It is so easy for a teacher to make a boy feel a fool. It is so easy for a teacher, if the treatment is continued, to make a boy indeed a fool. A little triumph for the teacher, no doubt; but a terrible—perhaps, irretrievable—defeat for the spirit of the boy.

To some boys compulsion is obnoxious and competition repugnant. They become good students only when their minds have been won over gladly to accept a situation into which they have been thrust without their will or consent. And then they make the best of students, from the point of view of the headmaster—helpful to others in the school, unselfish sportsmen in the playing-field; students capable of organising team-work, who will make public-spirited men.

The jaded teacher, naturally in the conditions under which he works, will think: "Why should I pay special attention to a wilfully lazy vagabond? Boys who are dutiful and do their work are more deserving."

I venture to assert that the dutiful, hard-working students will remain dutiful and hard-working without the teacher's personal attention; whereas, with but a little of his personal attention, the idle boy may become something more—much more—than merely dutiful and hard-working. Surely you do not wish to see a nation all routine-men!

The idle boy I have in mind is always being reported for inattention in class, for truancy, for wandering about the compound during school hours with no lawful object. When charged with these delinquencies, he replies (of course mendaciously) in a manner which reveals considerable ingenuity and also a quaint and humorous turn of mind. He is not unsociable at heart. But the crowd of boys rather appals him; he prefers to be alone. He responds immediately to overtures of friendship made by individuals, and thus is particularly liable to drift into bad company.

What this boy requires is individual attention. And how is one to give that in a school of well over a thousand boys, in classes of from 40 to 50? It seems too much to ask. But it is really not so much, for the individual attention that this boy needs is not separate instruction but only personal notice. A very little show of understanding and kindness on the teacher's part will often be enough to change the mental outlook of a sensitive Indian boy. Often, in the Fourth or Fifth Form I have known a boy, till then renowned for heedlessness, suddenly acquire enthusiasm for the School's activities. That is always owing to the personal touch of a wise teacher.

The attitude of these idle boys towards school-work is comparable to that of the late lamented Queen Victoria towards one who in her presence hazarded a feeble joke: "We are not amused." The problem is how to amuse them; how to make the school-work more attractive than their private thoughts and hobbies; how to find out the hobbies and the private thoughts and work them in. We have, alas! to push them somehow through the mill. I have seen a boy's face brighten when a teacher makes some homely, unconventional remark which touches him. It is as if he saw the school for the first time, as if he thought: "This game of learning lessons is not so rotten as I thought it was. It may be worth my while to have a try at it." But how many sensitive idlers are completely dulled by

schoolman of to-day is a later growth, as I think, of pure snobbery. The educational value of intelligent, observant idleness in growing boys was definitely recognised. The idlest boy in school I ever knew, though one who had a lot of hobbies, has been three times a Cabinet Minister, has written some good books and is known for his faculty of concentration and long hours of work. If you read the lives of famous men you will be surprised to find how many of them were idle boys at school in work and play.

Now you will say that there is no analogy between an English School and an Indian School, between a school designed for a privileged class and a school designed for everybody. I do not say there is. All I wish, by this preamble, is to explain why it is that I personally have especial sympathy for idle boys.

The system of education which I have to see enforced in the Government High School, Chadarghat, is very much more efficient than that to which I was subjected. The students are much better taught than I was. But is there much allowance for the growth of individual talent ; is there any allowance for the idle boy ?

The idle boy is regarded as a reprobate and worthless creature. He may become so, under reprobation, in the course of time. But he is not necessarily or generally so. We make every allowance for the athlete. We make no allowance for the dreamer. Yet, if there is a heaven-born genius in the school he is nearly certainly to be found among the idle boys. It is true that we are not asked to produce or foster genius. We are asked to turn out a standardised product. But we are not manufacturers dealing with soap or hardware. We are schoolmasters dealing with young human minds; and we ought to remember that a certain tendency to idleness is part of the process of growth in young people; we ought also to remember that, while the average mind is stimulated by the sense of competition, the finest type of mind is numbed by it.

One of those songs (I quote from memory) runs thus :—

Byron lay,
Lazily lay,
Hid from lessons and games away,
Dreaming poetry all alone,
Up on the top of the Peachey stone. [1]
All in a fury enters Drury, [2]
Sets him grammar and Virgil too,
Poets should'nt have work to do!
Peel stood,
Steadily stood,
Just by his name in the carven wood,
Reading rapidly, all at his ease.
Pages out of Demosthenes.
"Where has he got to?"
"Tell him not to!"
All the scholars around him cry ;
"That's the lesson for next July."
Byron lay, wearily lay.
Dying for freedom far away, [3]
Peel [4] stood up on the famous floor,
Ruled the nation and fed the poor.
None so narrow the range of Harrow.
Poet and statesman are welcome too.
Doer and Dreamer! Dream and do!

That, I think, was the chief merit of the School. The idle boy, the dreamer, was made welcome and his potential future greatness acknowledged. It was rather haphazard education that we got, but it was real education, allowing individual talents room to grow. There was no cramping fear of an examination ; there was at that time no idea of turning out a standardised product. The standardised public

1 An old flat-topped tombstone in Harrow churchyard, to the memory of a Mr. Peachey ; now known to tourists as "Byron's tomb," because tradition says it was a favourite haunt of the poet when a boy at school.

2 Dr. Drury was headmaster of Harrow School at the time when Byron and Peel were boys.

3 Lord Byron, the poet, died at Missolonghi, fighting for Greek independence.

4 Sir Robert Peel, the famous Prime Minister of Queen Victoria.

boys in the same form with us, because they could prepare thework for all of us and coach us in the last five minutes before going into school. We became experts in the art of dodging impositions and in rapid guess-work—which, by the way, is in itself a sort of education—and somehow, in the course of our passive resistance to instruction, managed to acquire sufficient knowledge to float us up from Form to Form till, in the Sixth Form, a miracle took place and many of the idle boys suddenly became quite brilliant scholars.

The miracle can be explained. We all came from educated homes and had all been fairly well grounded in some preparatory school. And though it was not the thing for boys in the lower forms to work in school, public opinion did not object to work done out of school as a fad or hobby; and there were always masters ready to abet such work. Boys, who would have scorned to do a stroke of work in school-hours, did hard reading in the Library on subjects which appealed to them, or did experiments in the Science Laboratory for their own pleasure.

As for games: Most of us liked football in moderation; and in the summer-term we liked to lie in the grass and watch the swells play cricket. In summer we enjoyed the swimming pool when it was not too crowded. We were not keen on games unless we happened to be good at them; and many of us would invent excuses to escape fatigue. But nearly everybody had some sport that he was keen on. It might be fencing, rackets, or the rifle corps. Public opinion did not reprehend the boy who frankly said he hated violent exercise in mud and rain or the sun's heat. Often the boys who slacked at school were daring horsemen or crack shots at home.

We were not really quite so idle as we studied to appear. And then there were the names of great men who had undergone the same experience in the same School before us, carved in the old oak desks and wainscotting; and there were School songs, to inspire us with a sense of continuity.

The Problem of the Idle Boy [1]

BY

MARMADUKE PICKTHALL,

Principal, Chadderghat High School, Hyderabad, Deccan.

Nawab Sir Nizamat Jung, Ladies and Gentlemen,

The Father of the Conference, Mr. Syed Ali Akbar, at first suggested that I should speak to-day upon the subject of English Public Schools. I told him that I knew only one of them at all intimately, and that a great many years ago, and would rather speak about the problem of the idle boy, a subject which would include my memories of one great Public School. When I was a boy there were eight old foundations which were universally known as the great Public Schools, and perhaps a score of new foundations and ambitious Grammar Schools which were clamouring for recognition as great Public Schools. Educationists had not yet begun to talk about a Public School system of education ; the term "educationist" had hardly yet come into common use. We never knew that we were subjects of a system which could be defended theoretically. We thought it altogether indefensible. The only thing about it was that it was old and seemed of natural growth, and that our fathers, uncles and grandfathers had been through the same rough-and-tumble. The great Public Schools were almost entirely made up of boys who had no reason to expect that they would ever have to earn their bread-and-butter.

The point of view of the masters had no weight at all with us. We thought of them as our opponents in a game. It was the public opinion of the School, which meant the boys, that governed our behaviour. The idle boy was regarded as a normal human being; the boy who worked—or, as we said, "swotted"—was abnormal, unless he had come in with a scholarship when the poor wretch was, we knew, obliged to do it. We were glad to have two or three abnormal

1. A lecture delivered at the Sixth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association.

It is a pleasing thought to me that the Teachers' Association has already done some good work and, will, I hope, live to do much more, and that every teacher who joins it will put some of his own soul into it—preferably the best part of it! This is my advice because I believe that institutions cannot make men half as well as men can make institutions. I am often reminded of this in these days when the general tendency of the human mind is to believe its opposite to be true.

Institution-making is one of the results of the gregarious or social habits of man, and the faith in its efficacy has grown with the advance of his corporate movements. Institutions in their turn help forward corporate movements, and this is their chief utility. They help to make men's movements uniform and corporate, and thus bring about harmony and a proper adjustment of relations, but they need strong right walled souls to guide them. Hence the teacher's work in this Association is first of all to supply a portion of that soul in such a way that his contribution, however small, may make the whole more efficient for its work—which I take to be the production of a higher type of man.

I congratulate all concerned on the success so far achieved by the Association and wish them all the success the movement deserves. In a few years' time it may be able to show us the higher and more spiritual results of its work not in the form of such tangible exhibits as we have seen to-day, but as noble conduct allied with intellectual achievement on the part of their pupils. In this way I hope they may become real benefactors, and prove that the teacher behind the scene is the real leader of mankind.

---

or national self-esteem, there is such a thing as prejudice born of antecedent conventions of thought and feeling. These combine to create a certain unwholesome mental atmosphere, and operating secretly upon our mental processes affect our judgment and our beliefs. Even sceptical, impartial minds cannot easily escape such influences. It is therefore of the utmost importance that we proceed to the investigation of truth with a mind that is like a clean sheet, and that we first record on it only such facts as are not open to any doubt—facts which have actually happened in the past, or which are happening in the world now, or which we can perceive by our senses as existing permanently in nature. So far the work is comparatively easy; but when we begin to try to understand their nature and their significance and to appraise their value or to appreciate their interrelations, it is then that the task becomes more difficult and more embarassing. At this stage it is necessary to avoid superficial judgment and to penetrate to the very depths in all sincerity of heart in order to reach the truth. Truth and sincerity are linked together and their connection is indissoluble. No great work can be done without these, no great work was ever done in this world without these. Whether a prophet brought a new religion into the world, or whether a philosopher gave a new system of philosophy to the world, or whether a world-conqueror added a new continent to his domain, he laboured in sincerity of heart and succeeded. Let teacher and pupil remember this, and in trying to understand and appreciate a great man's work let them not lose sight of that earnestness and sincerity of soul without which all his efforts would have been vain.

My advice to all is: Study the lives of great good men, and whenever you approach the work of any such with a view to understand it, command as great a sincerity of soul in estimating it as you may be capable of; and let your heart be full of reverence—a feeling without which the human mind cannot rise above its animal nature.

him; and he had the faculty both of discovering and ordering, in an intelligent and methodical way, the principles necessary for life; and he never showed anger or any other passion, and was most affectionate; and he could express approbation without noisy display, and he possessed much knowledge without ostentation."

"From Alexander the grammarian, to refrain from fault-finding, and not in a reproachful way to chide those who uttered any barbarous or solecistic or strange-sounding expression; but dexterously to introduce the very expression which ought to have been used, and in the way of answer or giving confirmation, or joining in an inquiry about the thing itself, not about the word, or by some other fit suggestion."

"From Fronto I learned to observe that envy, and duplicity, and hypocrisy are in a tyrant, and that generally those among us who are called Patricians are rather deficient in paternal affection"

That pupil was Marcus Aurelius. And what he learned from his teachers was something more than Grammar and Rhetoric: it was the very soul of practical ethics.

When I tell you that the teacher has to turn out not merely successful students but good men, perhaps you will ask me whether it is possible to achieve this object. Yes, by truth and sincerity. Follow these and you will avoid error.

Experience has shown over and over again that the natural limitations of the human mind together with its self-conceit and consciousness of ability and discernment, are often the cause of misleading it. It often arrives at erroneous conclusions and believes them to be the truth; and it often prejudges through error or bias; it often takes for granted what it has to prove, and proves only what it has prejudged. Apart from the narrowness of sectarian bigotry to which some minds are prone, and apart from that peculiar narrow-mindedness which is the result of racial

orations, nor to showing myself off as a man who practises much discipline, or does benevolent acts in order to make a display; and to abstain from rhetoric, and poetry, and fine writing; and not to walk about the house in my outdoor dress, nor to do other things of the kind; and to write my letters with simplicity, like the letter which Rusticus wrote from Sinuessa to my mother; and with respect to those who have offended me by words, or done me wrong, to be easily disposed to be pacified and reconciled; and to read carefully, and not to be satisfied with a superficial understanding of a book; nor hastily to give my assent to those who talk overmuch; and I am indebted to him for being acquainted with the discourses of Epictetus, which he communicated to me out of his own collection."

"From Apollonius I learned freedom of will and undeviating steadiness of purpose; and to look to nothing else, not even for a moment, except to reason; and to be always the same, in sharp pains, on the occasion of the loss of a child, and in long illness; and to see clearly in a living example that the same man can be both most resolute and yielding, and not peevish in giving his instruction and to have had before my eyes a man who clearly considered his experience and his skill in expounding philosophical principles as the smallest of his merits; and from him I learned how to receive from friends what are esteemed favours, without being either humbled by them or letting them pass unnoticed."

"From Sextus, a benevolent disposition, and the example of a family governed in a fatherly manner, and the idea of living conformably to nature; and gravity without affectation, and to look carefully after the interests of friends, and to tolerate ignorant persons, and to those who form opinions without consideration; he had the power of readily accommodating himself to all, so that intercourse with him was more agreeable than any flattery; and at the same time he was most highly venerated by those who associated with

his pupils who were his disciples. Something that had nothing to do with books but was intensely personal and beneficent. It was a spiritual current by means of which knowledge became purged of all grossness as it flowed into the pupils' mind. It was "soul force" used with effect. You would do well to cultivate it in yourselves.

How to keep selfish and mischievous thoughts and impulses out of the minds of our boys is becoming a more and more difficult problem in this age of unrest. But we all know that a boy who has been brought up among decent people will find it easier to overcome such tendencies than one whose early life has been spent amidst questionable associations. We also know that proper direction in early years has the effect of leaving a lasting impression upon the mind. You will, therefore, agree with me that it is here that the real work of the teacher begins. He who confines himself merely to book-teaching confesses himself an inferior being. He can only go the dull round of daily routine, and no more. But the teacher who understands and appreciates his high and delicate responsibility, and who has a conscience sufficiently sensitive, will never be satisfied with this His aim will be to purify and raise to a higher degree of sensitiveness the moral consciousness of his pupil. And this is not by dinning precepts into his ears, but by tactful suggestion, so as to enable the pupil to realise his own importance as moral being and rise in his own estimation and in that of others. I am convinced that a great deal more can be done by suggestion that has the effect of rousing a boy's proper self esteem and sense of superiority than by making him hear and repeat moral formulae!

Here I must tell you what a famous pupil once wrote of the effects of his masters' teaching upon himself.

"From Rusticus I received the impression that my character required improvement and discipline; and learned not to be led astray to sophistic emulation nor to writing on speculative matters nor to be delivering little hortatory

I used to think, as I still do, that education can supply certain natural deficiencies and raise the human mind to a higher level. But I am beginning to feel some doubts about this now. Whether nature is too strong, in its perversity or our system of education inadequate, the result is far from satisfactory. The average school-turned young man is not always a specimen to be proud of. His schooling does not always succeed in curbing the vicious tendencies, and bringing out the nobler instincts of his nature. His moral perception is neither keen nor delicate. He leaves school (or college) with his head crammed with fragments of miscellaneous ill-digested knowledge, and if he is clever at books he manages to take a degree ; but as a rule he remains unimproved within and imperfect in the finer human qualities. How far is the teacher responsible for this? You will agree with me that though the teacher's concern is mainly with words and figures arranged in books, yet it is not his only duty to take his pupils mechanically over those words and figures during school hours. His real work lies on a higher plane and is much more impalpable.

If it is true that a little knowledge is a dangerous thing, it follows that a little education too may be dangerous, for, it is likely to give that little knowledge together with much pretence as is generally the case. The teacher has to find out whether the real substance of knowledge has found its way into the pupil's mind; and if so, how deeply it has penetrated, and what impression it has left and what tendencies it has created. He is to take stock of his pupil's mental and moral qualities, and to do all that he has to mould the pupil's character by personal influence. My mind dwells fondly on the old type of teacher whose want of English was more than compensated for by his qualities of the heart, whose venerable appearance inspired awe and reverence and whose unrelenting aspect concealed a loving heart full of pure benevolence and sympathy. Some subtle purifying force flowed out from his heart into the hearts of

Who have been the greatest teachers of mankind? Just think of a few of those great names and bow your heads. Were they rich men or poor? You walk in their footsteps or do you prefer the social lure? Now I know what your answer will be. I will give some of my stray thoughts on some of the things that concern you, and us, and all.

I have been thinking for a long time that if our education does not enable us to purify and control our desires, it fails in its object. There is a perpetual conflict between our reason and our desires. It is for education to train the mind so thoroughly as to be victorious always, but this is possible only when it sets before itself an avowedly moral aim—not otherwise. I would go so far as to say that one of the chief functions of education is to train our desires.

Is not the world just beginning to realise that everything in it is awry on account of its inability to adjust its moral balance?

Man is so constituted that he cannot break away from the unseen iron-chain of moral cause and effect that binds him to a central point as a necessary part in the universal scheme of things. To realise this and to adjust his relations in sympathetic harmony with his surroundings is wisdom. The teacher has to teach his pupil how to do this. He has to convince him that mere love of wisdom without actual practice must be an anomaly, as religion without the exercise of righteousness is only self-deception or hypocrisy. Mere knowledge is not wisdom. Man's spirit requires growth, expansion and increase of power through purification of the will and its continual activity in the direction of truth. The teacher must bear this in mind every moment of his life, for he is to lead from darkness to light. He is the guide to truth, but he must first keep his own heart open to truth. And truth, we know, can reach the heart in many ways provided the heart is kept open to receive it and the access to it is not barred by misdirected passions and errant fancies.

and I can find no satisfactory answer. I grope in the dark feeling there is something lacking in our education—the power to touch the deep-lying, hidden moral instinct in man. To my mind the real, though not always the avowed object of all our best endeavours in the form of education, culture, civilization, morality, and religion is to bring about a proper balance between the animal and the spiritual side of human nature. I am a firm believer in this, but there are people who talk of utility. I have no quarrel with the famous utilitarian principle, and this is my interpretation of it; nothing can be more useful than that 'utility' which makes us better inwardly rather than outwardly; for, as we are within, so will the result of our work be around us. We are the makers of our world, and it is our heaven-ordained duty to make it a good world. Have you considered that in, and yet above, the big world of collective humanity there is within us, nearer home, the more important world of each one's little imperishable self? This little world causes much trouble and anxiety to all concerned. But the true teacher enables us to place it in its right position.

Now I call on you as professed teachers of men to think over this, and to spend your whole life time in thinking over this, so that you may at last arrive at something better than examinations, *viz:* self-examination, self-purification, and thus gain that inner strength by which alone it is possible to influence and move other minds.

The teacher has the most important mission in life. He has to mould the world's civilization. His function is sacred, he is the high priest of human nature. Can he forget this, and yet retain his high place? Just think over it, and go on thinking, and you shall find light and guidance.

The teacher's position in society has been receiving some attention of late, and I am glad of it. But let the teacher remember that he has a position, assigned to him by nature, higher than any position that society can give.

me but from others more distinguished than myself, especially the learned President; Dr. Krishnayya, the subject of whose lecture is "How to improve as a Teacher"; and last but not least, from my friend Mr. Pickthall, although the title of his address is "The Idle Boy" and not "The Idle Teacher"!

Presidential Address

BY

NAWAB SIR NIZAMAT JUNG BAHADUR Kt., C. I. E., O. B. E., M. A., L. L. M. (Cantab.)

Ladies and Gentlemen,

The honour you have done me in asking me to preside at this Conference gives me the opportunity of conveying to you an important message, a message that has been coming to me for some years past. It concerns the true object of education and the teacher's function. But I must warn you that it has nothing to do with the external machinery of teaching. It keeps clear of standards and examinations, of courses and curricula and methods. These are matters reserved for experts. A layman like myself, a quiet watcher of human events, a somewhat detached citizen of the world, is only interested in the enquiry "where is our education leading us?" The answer seems to be contained in the question, "where has it led us?"

When I look at the civilized world as it is to-day, I feel that we have not much reason to rejoice. In spite of all our progress, all our achievements in external matters, we have got into a state of mind that has made peace impossible in the world. Has education brought us to this? Or has it prevented such a result? These questions trouble me,

imagination and the initiative to apply it in practice. The result is that, in spite of the improved curriculum, the instruction given in our schools is still too bookish. To illustrate this, I could give many examples but I will confine myself to two. Not long ago while inspecting a school situated hardly a furlong from the Musi, I found that the boys of Class IV had never observed the direction in which the river flows. In another school, a High School, my surprise was even greater when the students of Class VIII informed me that it had never occurred to them to watch the direction of the clouds during the South West and the North East Monsoons, respectively. Education has little value unless it helps the child to understand the environment in which he lives. The most effective way of promoting this understanding on his part and at the same time of bringing school work into harmony with actual life is to follow what are called "activity methods." So great is the importance attached to these methods in Germany that the Article on Education in the Federal Constitution lays down, among other things, that instruction in all schools shall be imparted, as far as possible, on the principle of self-activity. In England one sees evidence of the operation of this principle in the crowds of pupils one meets in the streets of big towns marching with their teachers to museums, botanical gardens, zoological gardens, factories and buildings of historic interest. The divergence between school life and life outside the school, which one generally notices in India, will disappear only when the teachers learn to teach through experiment rather than through dictation.

Ladies and gentlemen, if I have offered any advice to teachers, it is because an Inspector of Schools finds the temptation to do so irresistible when he is addressing a gathering of teachers. But I really must stop now, for the teachers who have assembled here in such large numbers to-day have come not to receive advice and inspiration from

ought to be an incentive to still greater efforts on our part in future. With self-improvement and co-operation as our watchwords we can do much to help the Department, which, after all, is our chief aim. For a teacher, the process of self-improvement should go on ceaselessly until he becomes to his pupils a living example of all those virtues, intellectual and moral, which he wishes to inculcate on them.

Under the magnificent and benign rule of our august sovereign, whose interest in education and whose concern for the well-being of the youth of the country are well known, two important steps have been taken to place education in this State on a sound basis. The first is the inauguration of the Osmania University and the second is the reform of the school curriculum. The new curriculum on which the Director of Public Instruction deserves to be congratulated, has given fresh scope for our activities. If you study this curriculum carefully—and it is the duty of every teacher to study it carefully—you will find that, besides being well adapted to the existing social and economic conditions of the State, it embodies some of the latest principles of education. To my mind, the most satisfactory features of this curriculum are the introduction of science as a compulsory subject and the emphasis laid on manual training and physical education. But, however perfect a curiculum may be, it cannot by itself raise the standard of educational efficiency. Just as the fastest horse in the world will lose a race if it is ridden by a bad jockey, in the same way the most perfect curriculum in the world will defeat its object if it is handled by teachers who do not understand the principles underlying it. Of the principles on which our new curriculum is based, there is just one to which I should like to draw the special attention of teachers. This principle is that school life and teaching at every stage should be related as closely as possible to the realities of life. The teachers in our schools do not sufficiently realise the importance of this principle, and such of them as do, have not the

for us financial assistance from Government to enable us to improve and maintain our library. Not long ago, the Archbishop of Canterbury said, "The real test of education is not what a man does with his work, but what he does with his leisure." By maintaining a library, the Association is endeavouring to encourage the teachers to make the right use of their leisure. Apart from this, the library is a great help to us in preparing our reports.

One more aspect of our activities to which I wish to refer briefly is the educational exhibition which is held annually along with the conference and which is the only exhibition of its kind held in the city of Hyderabad. The organisation of this exhibition serves a very useful purpose inasmuch as it gives an impetus to instruction in Drawing and Handicrafts, both of which have considerable educational value. Our warmest thanks are due to Miss Michell, who, as President of the Exhibition Committee, has been indefatigable in making the Exhibition the success, which you will all agree, it has been. A feature of the Exhibition held this year was that girls were allowed to compete with boys in some of the Sections. It is a noteworthy fact that most of the prizes have gone to girls. Let us hope that this will urge the Boys' Schools to pay greater attention to Drawing and Handwork in future.

Since the last Conference was held, the Association has been deprived of one of its most respected and valuable members by the death of Mr. Zahoor Ali. His services to the Association are still too fresh in your memory to need mention. The late Mr. Zahoor Ali was a born teacher, and a public servant who valued his duty more than he valued his life. His death is deeply mourned by all the members of the Association.

I hope I have said enough about the activities of the Teachers' Association to show that the Association supplies a real need, and that it exists not to indulge in mere idle talk but to do solid work. What we have achieved so far

many as 125 teachers belonging to 35 schools attended these lessons on different days during the week immediately preceding the Conference. With his usual modesty, Mr. Ataur Rahman chose to call the lessons Demonstration Lessons, but they were really Model Lessons, given by one who may easily be recognised as a specialist in the teaching of English. The Teachers' Association is deeply indebted to Mr. Azam for organising and to Mr. Ataur Rahman for giving these lessons. With the preliminary ground thus prepared, we may confidently look forward to a very interesting and fruitful discussion this afternoon. English occupies a very important place in the curriculum of all our Secondary Schools, and if it is taught on proper lines, there is no reason why we should not succeed in raising its standard even in schools which do not employ it as the medium of instruction.

The monthly meetings held at the various branches of the Association help to keep the members actively interested in the Association throughout the year. Attendance at these meetings is compulsory for the teachers of all those schools to which the rules of the Association, which have been approved by Government, apply. It is to be hoped that the interest of the members of the Association in the monthly discussions will grow, so that the Branch Secretaries may be spared the unpleasant duty of reporting cases of absence to the authorities. Our distinguished guests who have assembled here to-day may perhaps be curious to know whether attendance at our annual conferences is also obligatory. Well, it was compulsory in previous years, but it was not made compulsory this year, for both days of the Conference this year happen to be holidays. I hope that the low attendance today as compared with previous years is due to no other reason than the wet weather.

The importance of a good library for an Association like ours is obvious. We are very grateful to Mr. Fazl Mohamed Khan, the Director of Public Instruction, for obtaining

former mainly through the efforts of Mr. Shaik Abul Hasan and Mr. Ghiasuddin, and the latter through the efforts of Moulvi Hisamuddin Saheb, Moulvi Syed Hashim Saheb, Moulvi Saadatulla Khan Saheb, Mr. Chandawarkar and Rev. Father Steffanetti. Both the Reports will be placed before the Conference to-morrow with such amendments as may be made at the Sectional Meetings. The Sectional Meeting on Drawing will be presided over by Mr. Syed Mohamed Husain Jafery, Deputy Director of Public Instruction. This is not the first time when Mr. Mohamad Husain has responded to our call for assistance; it will be recalled that 3 years ago he did valuable work for us as Chairman of the Sub-Committee on Vocational Education. We have been equally fortunate in securing as Chairman of the Sub-Committee on Classical Languages an experienced teacher and Arabic scholar like Dr. Abdul Haq. Under the guidance of such eminently suitable Chairmen, the deliberations of both the Sectional Meetings are bound to be successful.

The holding of Sectional Meetings is a special feature of the Conference this year. In addition to the Sectional Meetings on Drawing and Classical Languages, we are going to have a Sectional Meeting on English. Although an admirable report on the Teaching of English was prepared in 1929 by a Sub-Committee presided over by Rev. F. C. Philip, the able and distinguished Vice-President of the Association, the need was felt for discussing some new problems which have arisen since the publication of that report in consequence of the introduction of new text-books. Actuated by his profound sympathy with the Teachers' Association and his deep concern for the improvement of the teaching of English in schools, Mr. Syed Mohamed Azam not only accepted our invitation to preside over the Sectional Meeting on English, but with a view to preparing the teachers of English for this meeting, arranged for a series of Demonstration Lessons to be given at the City College by Mr. Ataur Rahman. I am glad to state that as

started 7 years ago under the patronage of Nawab Masood Jung Bahadur, the then Director of Public Instruction, were (1) to foster *esprit de corps* among the teachers of different schools, (2) to keep them in touch with new educational ideas and methods, and (3) to help them to find by means of co-operative effort a solution of their common difficulties.

These aims the Association has endeavoured to fulfil by holding monthly meetings for the discussion of various practical problems of education, arranging for Demonstration Lessons, appointing Sub-Committees to prepare reports on different subjects of the curriculum, maintaining a quarterly magazine and a library and, last but not least, holding an annual conference and an educational exhibition. The annual conference marks not so much the culmination of our efforts for the year at the end of which it is held as the beginning of fresh efforts for the coming year. A programme of the work to be done during each year is chalked out in advance and until the date of the following annual conference persistent efforts are made to carry out this programme as successfully as possible. Concentrating on two or three subjects every year, we have been able to produce nine reports so far, viz., Reports on the Teaching of English, Teaching of History, Teaching of Geography, Teaching of Mathematics, Teaching of Science, Teaching of Urdu, and on Moral Instruction, Vocational Education and Physical Education. The preparation of these reports has given the members of the Association excellent training in team-work. All the reports have been published in the *Hyderabad Teacher*, and the Director of Public Instruction, who has always been appreciative of our efforts, has recognised the value of some of these reports by bringing them to the special notice of the Heads of schools by means of circulars.

Since the last Conference was held, two more reports have been prepared, one on the Teaching of Drawing and the other on the Teaching of Classical Languages, the

ments in England is a matter of common knowledge to all students of education. We whose work lies in the practical field of education are concerned not merely with the body and mind but also with the soul of the pupils entrusted to our care, and it is therefore our duty frequently to seek advice, guidance and inspiration from philosophers. I consider it a happy augury for the future of education in India that the leading philosophers of the country have begun to interest themselves in educational questions.

Time was when nobody outside the teaching profession took any interest in a gathering of teachers. Indeed, there were many people who shared the view of the cynic who said, "The most pitiful sight in the world is a collection of schoolmasters." Though even now the importance of the service rendered by the schoolmaster does not receive the public recognition which it deserves, there is no doubt that popular interest in education is growing and it is being gradually realised that education is an affair which concerns not merely schoolmasters, not merely parents, but all those who have the future well-being of their country at heart. We have evidence of this changed outlook in this gathering, which a large number of distinguished guests have honoured by their presence. I assure them all that we, the members of the Hyderabad Teachers' Association, greatly appreciate their kindness in responding to our invitation. We are also pleased, and quite naturally, to have in our midst to-day Mr. Fazl Mohamad Khan, who, as patron of the Association and the administrative head of the Education Department, has never failed to give us valuable advice and guidance.

Turning now to the business which lies before the Conference, the Report of the General Secretary of the Association which you will hear presently and a glance at the programme of the Conference, copies of which have already been distributed to you, will give you an idea of the kind of work the Association has been trying to do. The chief aims and objects with which the Association was

The Sixth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association

WELCOME ADDRESS

BY

S. ALI AKBAR,

Chairman of the Reception Committee

Ladies and Gentlemen,

As Chairman of the Reception Committee, it is my pleasant duty to extend a hearty welcome to you all to this, the Sixth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association. Nawab Sir Nizamat Jung Bahadur has done us great honour by consenting to emerge from his almost cloistral seclusion in order to preside over this Conference with the aims and objects of which he cannot but sympathise. We are indeed fortunate to have a scholar of Sir Nizamat Jung's literary eminence and intellectual attainments to guide our deliberations. His fame as a poet has spread far and wide, but he is not merely a poet, he is a thinker and a life-long student who has drunk deep at the founts of both Western and Eastern philosophy. Needless to state, there is much that a philosopher has to say to a gathering of teachers. However skilled you may be in the art of teaching, you are not a teacher in the true sense of the word unless you have ideals. Nor can a system of education which lacks a philosophical background be called a perfect system. The history of education in Germany during the latter half of the 18th and the first half of the 19th century is largely the history of the influence exercised by philosophers, notably Kant and Hegel, on the educational system of that country; while the influence which Locke, J. S. Mill and Herbert Spencer had on educational develop-
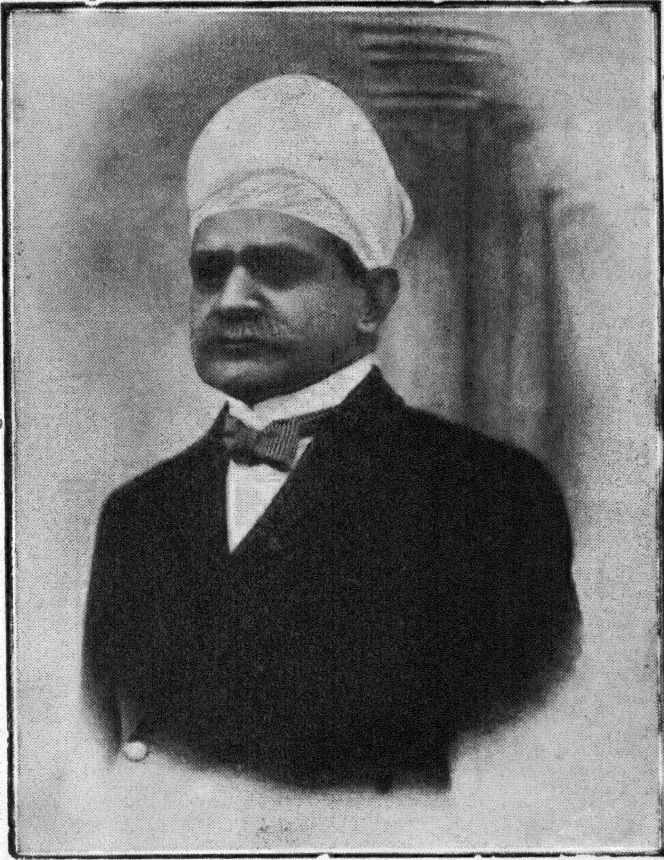
NAWAB SIR NIZAMAT JUNG BAHADUR, Kt.
C. I. E., O. B. E., M. A., L. L. M., (Cantab).
President, Sixth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association.

THE HYDERABAD TEACHER

CONTENTS

PAGES.

THE SIXTH ANNUAL CONFERENCE OF THE HYDERABAD TEACHERS' ASSOCIATION. WELCOME ADDRESS BY S. ALI AKBAR. 55

PRESIDENTIAL ADDRESS BY NAWAB SIR NIZAMAT JUNG BAHADUR, Kt., C. I. E., O. B. E., M. A., L. L. M., (Cantab.). 63

THE PROBLEM OF THE IDLE BOY BY MARMADUKE PICKTHALL, Principal, Chaddarghat High School, Hyderabad Deccan. 72

HOW TO IMPROVE AS A TEACHER. THE CULTIVATION OF A DESIRABLE PERSONALITY BY DR. G. KRISHNAYYA, M. A., (Madras), Ph. D. (Columbia), Education Officer, British Administered Areas, Hyderabad. 78

REPORT OF THE SECTIONAL MEETING ON THE TEACHING OF ENGLISH BY S. B. SAYEED, B. A., (Hons.) B. T. 86

A PLEA FOR RATIONALISING THE CURRICULUM OF GIRLS' SCHOOLS BY SYED WAHAJUDDIN, B. A., B. T., Lecturer, Osmania Intermediate College, Aurangabad. 91

PROCEEDINGS OF THE SIXTH ANNUAL CONFERENCE OF THE HYDERABAD TEACHERS' ASSOCIATION BY THE CHIEF EDITOR. 101

EDUCATION OF "BACKWARD" CHILDREN BY REV. F. C PHILIP, M. A. 108

THE EDUCATIONAL EXHIBITION 111

EDITORIAL 113

The Hyderabad Teacher.

ADVERTISEMENT RATES.							SUBSCRIPTION RATES.
Space.	Whole year.		Six months.		Per Issue.		For the Nizam's Dominions O. S. Rs. 3 annually, (including postage).
	B. G.		B. G.		B. G.		For British India B. G. Rs. 3 a year (including postage).
	Rs.	As.	Rs	As	Rs.	As.	Single copy O. S. As. 12 for H. E. H. the Nizam's Dominions
Full page ...	12	0	6	0	4	0	Single copy B.G. As. 12 for British India.
Half page ..	6	0	3	8	2	0	
Quarter page	3	0	1	12	1	0	
Per line ...	0	10	0	8	0	6	

The Urdu Section is published separately also. Subscription Re. 1 As. 14 a year.

Members of the Hyderabad Teachers' Association can obtain back numbers of THE HYDERABAD TEACHER at a reduced price.

Apply to

S. M. KHAIRATH ALI, MANAGER,
"The Hyderabad Teacher,"
Gun Foundry, Hyderabad-Deccan.

Vol. VII. REGISTERED ASAFIA NO. 47. No. 2.

THE
HYDERABAD TEACHER

Quarterly Magazine of the Teachers' Association,
Hyderabad-Deccan

Under the Patronage of
Khan Fazl Mohamed Khan Esq., M. A.,
Director of Public Instruction.

OCTOBER—DECEMBER, 1932.

SECUNDERABAD-DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.

1932.

Annual Subscription Rs. 3.

Vol. VII. No. 2.

THE HYDERABAD TEACHER

OCTOBER—DECEMBER, 1932.

SECUNDERABAD-DECCAN

PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.

1932.

جلد (۷)

شمارہ (۳)

زیر سرپرستی جناب خان فضل محمد خاں صاحب ایم۔ اے ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مجلس ادارت:۔ سید علی اکبر ایم۔ اے (کنٹب) مدیر مسؤل
سید فخرالحسن ملائی اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) مدیر
محمد عبدالنور صدیقی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) شریک مدیر

مقاصد

(۱) طبقۂ اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدار کرنا۔
(۲) طبقۂ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا۔
(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔
(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔
(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

قواعد

(ا) رسالہ کا نام حیدرآباد ٹیچر ہوگا اور ہر سہ ماہی پر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا
(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔

اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی تین روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ)
صرف اردو حصہ (عہ ۱۲/) سالانہ قیمت فی پرچہ اردو انگریزی (۱۲/) صرف اردو (۸/)

(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہو سکے گا۔
(د) صرف وہی مضامین درج ہو سکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔
(ر) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہئے۔
(س) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ہذا رہے گا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	عـــہ	صہ	سے ۱/
نصف صفحہ	صہ	عـہ ۸/ ۱۲/	عہ ۸/
ربع صفحہ	عـہ ۸/	عہ ۶/	۱۵/
فی سطر	۱/	۸/	۶/

اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن میں طبع ہو کر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر مہتممی تعلیمات بلدہ سے شائع ہوا

جلد (۷) شمارہ (۳)

زیر سرپرستی جناب فضل محمد خان صاحب ایم۔اے ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مجلس ادارت:۔

سید علی اکبر ایم اے (کنٹب) مدیر مسئول

سید فخر الحسن ملا بی اے بی ٹی علیگ مدیر

محمد عبدالنور صدیقی بی اے بی ٹی علیگ شریک مدیر

حیدرآباد ٹیچر

بابت ماہ اسفندار سنہ ۱۳۴۲ف م جنوری سنہ ۱۹۳۳ء

جلد (۷) فہرست مضامین شمارہ (۳)

نشان سلسلہ	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	علم و متعلم	جناب مولوی سید علی محمد صاحب اجلال	
۲	کند ذہن اور غبی لڑکے	جناب نورالحسن صاحب بی اے بی ٹی علیگ۔	۵
۳	تعلیم و تربیت کی تکمیل گھر اور مدرسہ میں	ڈپ ریڈ۔ سی ٹی (گلاسکو) مددگار مدرسہ فوقانیہ نامپلی ترجمہ جناب مولوی محسن خانصاحب متین	۱۳
۴	کنڈرگارٹن اور سست ذہن بچے	اقتباس از رپورٹ جلسہ ماہانہ شاخہائے انجمن اساتذہ بلدہ	۲۳
۵	شذرات		۳۴
۶	اقتباسات		۴۰
۷	طریقہ تعلیم ریاضی	جناب ڈی۔ سی۔ بھوگلے صاحب بی اے بی ٹی	۴۹-۵۱ ۵۲

علم و متعلم

از سید علی محمد اجلالؔ مددگار مدرسہ وسطانیہ جنجل گوڑہ سرکار عالی

یہ ولولہ انگیز نظم استادوں اور عہدہ داران تعلیمات کے مجمع کثیر کے سامنے انجمن اساتذہ بلدہ کی چھٹی کانفرنس کے موقع پر پڑھی گئی تھی۔

اے عزیز قوم و روح ملت و جان پدر — اے نہال باغ ہستی طالب علم و ہنر
گلشن امید کے اے تازہ نخل آرزو — ناز و نعمت کا پلا ہے نعمتوں والا ہے تو
ہر صدا پر تیری آتی ہے صدا لبیک کی — ہے موافق کس قدر آب و ہوائے زندگی
آہ تیری پر اثر نالہ ہے تیرا دل شکن — سب ہیں پروانہ ترے اور تو ہی شمع انجمن
ایک قطرہ بھی پسینہ کا ترا گر جائے تو — خوں بہانے کے لئے اپنا ہر اک تیار ہو
تو نہ ہو ناراض اس کا رہتا ہے سب کو خیال — تو کرے جس بات کی ضد اور نہ ہو وہ کیا مجال
ناز اٹھانے کے لئے ماں۔ باپ خدمت کیلئے — ہیں مہیا جملہ ساماں تیری راحت کیلئے
دیکھ آئینے میں اپنے پیکر تصویر کو — میرے دل سے پوچھ اپنی عزت و توقیر کو
تو ابھی ناداں ہے کم سن ہے تجھکو کیا خبر — آ۔ ادہر آ۔ تجھکو سمجھاؤں یہ قصہ مختصر

اس لئے خاطر تری منظور ہے ہر ایک کو
تاکہ تو تحصیل علم و فضل میں مصروف ہو

علم کی تو جانتا ہے کیا ہے قدر و منزلت؟ — صاحبان علم کی ہے تیرے دل میں معرفت
ہاں نہیں کان آشنا ہیں تیرے اس آواز سے — مجھ سے سن لے تو ابھی واقف نہیں اس راز سے
علم کر حاصل کہ تو ہو جائے فخر خاندان — علم و حکمت پیکر انسان کی ہے روح رواں
علم ہی کی عالم ایجاد میں توقیر ہے — اس مرقع میں دل آویز اک یہی تصویر ہے
علم پر موقوف ہے سب کاروبار زندگی — علم سے دنیا میں ہے ساری بہار زندگی
خانۂ تاریک دنیا کا یہ ہے روشن چراغ — نور جس کا دیکھکر ہے مہر کے سینے میں داغ
علم ہی دنیا میں ہے حاجت روا مشکل کشا — قول یہ ضرب المثل ہے عالموں کی رد بلا

علم ہی دنیا میں ہے کشور کشا لشکر شکن
ذرہ ذرہ پر زمانے کے یہی ہے تخم زن

علم ہی کے آئینہ میں ہے تجلی طور کی
تجھکو تصویریں نظر آئیں گی اس میں نور کی

علم و حکمت ہی ہے وہ سرچشمۂ آب حیات
جس کا پانی پی کے ہو جائے گا خضر کائنات

علم کی وادی کے ہر ذرہ میں ہے کان طلا
اس خزانے میں ہیں لاکھوں نسخہائے کیمیا

بحر حکمت کا ہر ایک قطرہ جواہر خیز ہے
ایک یہی دولت ہے ایسی جو طرب انگیز ہے

علم کے محتاج ہیں سب بادشہ ہو یا گدا
صاحبان علم ہی ہیں در حقیقت بادشاہ

اس خزانے کو کوئی رہزن چرا سکتا نہیں
لیکے پھرئیے دشت و در میں چور کا کھٹکا نہیں

عالموں کی سلطنت فانی نہیں قائل ہیں سب
ان کے احکاموں پہ انکے بعد بھی عامل ہیں سب

علم کی دولت وہ ہے ہوتی نہیں اسمیں کمی
صرف ہوتی جائے جتنی اتنی بڑھتی جائیگی

دل میں ہر ذرہ کے اہل علم نے گھر کر لیا
علم سے دنیا کی ہر شئے کو مسخر کر لیا

گو نہیں ہیں دہر میں وہ ان کی تصنیفیں تو ہیں
خود نہوں اجزائے پریشاں انکی تالیفیں تو ہیں

ہم کو ان کی ارتقائی منزلیں معلوم ہیں
آجتک وہ صفحہ ایجاد پر مرقوم ہیں

نام ان کے دہر میں باقی رہیں گے حشر تک
ان کی شہرت ہے زمانے میں سما سے تا سمک

نیوٹن اور لب نتز۔ برنولی۔ فراڈے اور ٹولر
کانٹ اسپی نوزا ہیگل ہیوم و بیکن ڈاکٹر

ڈاروِن ہربرٹ۔ کپلر میکس ول۔ ڈیکارٹے
کلون اور ہیلی۔ بریڈلے۔ ڈالٹن اور جیول تھے

ہرشل اور ریلے گلیلیو لیپ لس۔ کوپرنکس
تھی حیات فلسفہ جس میں وہ تھے ان کے نفس

بو علی سینا۔ فلاطوں۔ اور بطلیموس تھے
شیخ ابو نصر اور بہمن یار و جالینوس تھے

قطب علامہ کوئی لقمان کوئی بقراط تھا
ابن یونس کوئی خوارزمی کوئی سقراط تھا

ابن ہیثم۔ کوئی نظّام اور کوئی فخر دین
با قرداماد تھا کوئی محقق بالیقین

مشرق و مغرب میں تھا ہر ایک ان میں انتخاب
آسمان علم پر ہر فرد ان کی آفتاب

اب قدم آگے بڑھا لیکن بدل کے چال کو
رشک ماضی تو بنا دے اپنے استقبال کو

باغ عالم میں گل امید کی خوشبو ہے تو
ملت و ملک و وطن کا قوت بازو ہے تو

ہے تری نشو و نما سے قوم کی نشو و نما
ارتقا سے تیرے ہے اہل وطن کا ارتقا

تجھ میں استعداد ہے اور جوہر قابل ہے تو
نقش ابھر آئینگے جلدی سادہ لوح دل ہے تو

دیکھ تو تیار ہیں سب تیری خدمت کیلئے
یہ غنیمت وقت ہے تحصیل حکمت کے لئے

دیکھنا ہے ایک دن نخل تمنا کی بہار
باپ تجھ پر کر رہا ہے مال و زر اپنا نثار

عالم و فاضل مقرر ہیں پڑھانے کے لئے
علم کی ہیں ڈگریاں ہمت بڑھانے کیلئے

شاہ بھی ہیں مہربان وہ کون سلطان العلوم
آسمان علم پر جو بدر ہیں بین النجوم

مدرسے قائم کئے کھولی ہے یونیورسٹی
بن گیا ہے اب محیط علم کا مرکز یہی

روکش یونان و یورپ ہو گیا ملک دکن
ہیں علوم مشرق و مغرب یہیں پر خیمہ زن

قابل تحسین ہے تعلیمات کا نظم و نسق
پر نگار اب ہو گیا تعلیم کا سادہ ورق

محکمہ کو ان عناصر پہ ہے اپنے افتخار
ان کی تعریف و ثنا میں ہے رجز خوان بار بار

عہدہ داروں سے لگے ہیں محکمہ کو چار چاند
جن کے آگے پڑ گئی ہے روشنی سورج کی ماند

طالب العلم اے عزیز از جان من تو یاد رکھ
پند یہ اجلال کی روح وطن تو یاد رکھ

جو تجھے تحصیل کرنا ہے اسے تحصیل کر
عالموں کی صف میں آجائیگی اب تعجیل کر

گر یوں ہی پڑھ پڑھ کے اہل فن نکلتے جائیں گے
اس زمیں سے علم کے چشمے ابلتے جائیں گے

دیکھ لیں گے سیر ہم بھی ایک دن یونان کی
طالب العلمو جو کوشش تم نے تا امکان کی

کند ذہن اور غبی لڑکے

از مولوی سید نور الحسن صاحب ۔ بی ۔ اے ۔ بی ٹی ۔ (علیگ) ڈپ ۔ یڈ سی ۔ ٹی (گلاسگو)

غبی لڑکوں کی شناخت اور ان کے غبی پن کے اسباب کی تشخیص

مدارس کے نظم و نسق میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ کند ذہن و غبی بچوں کی خاطر خواہ تعلیم و تربیت کا ہے سب سے پیشتر ہمیں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ کند ذہن و غبی بچوں سے کیا مراد ہے۔

ڈاکٹر سیرل برٹ Dr. Cyril Burt نے کند ذہن بچوں کی یوں تعریف کی ہے۔

ہر ایک بچہ کو جو اوسط معیار تعلیم سے گرا ہوا ہو غبی و کند ذہن نہیں کہا جا سکتا اور نہ اس کو جماعت سے علیحدہ تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔ کند ذہن صرف انہی کو کہنا چاہئے جن کے دماغ میں کوئی خاص فتور نہ ہو لیکن پھر بھی کسی نہ کسی سبب سے اپنے ہم جماعت لڑکوں کے ساتھ نہ چل سکتے ہوں اور مدارس تحتانیہ کی تعلیم کو آسانی سے حاصل نہ کر سکیں۔

بچے جن کی تعلیمی حالت خاطر خواہ نہ ہو اور اوسط سے بہت گری ہوئی ہو غبی کہلاتے ہیں۔ کند ذہن لڑکے وہ بھی ہیں جو تحتانیہ تعلیم کے زمانے میں اپنے سے نیچے درجہ کے بچوں کے برابر بھی معلومات نہ رکھتے ہوں۔ مثلاً اگر دس برس کے بچے کی عام معلومات سات برس کے بچے کے بھی برابر نہ ہو تو یقیناً بچہ غبی و کند ذہن ہے۔ اور اس کے لئے اشد ضروری ہے۔ کہ اس کو خاص تعلیم گاہ میں تعلیم دی جائے۔

ہندوستانی تعلیم گاہوں میں کند ذہن بچوں کی تعداد پندرہ فی صدی یا اس سے کچھ زائد ہے ان بچوں کی تعلیم و تربیت کا کوئی خاص انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ ان کو عام مدارس کی تعلیم سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ برخلاف اس کے وہ دن بدن نکمے ہوتے جاتے ہیں۔ وہ منہ کھول کر اور آنکھیں پھاڑ کر درجوں میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اور ان کی سمجھ میں خاک نہیں آتا کہ مدرس کیا بک رہا ہے۔ مدرس اپنا قیمتی وقت اس لاحاصل کوشش میں صرف کرتا ہے۔ کہ ان کی حالت کو سنبھالے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ درجہ کے ذہین بچوں کا وقت رائگاں جاتا ہے۔

مدرس کے لئے یہ امر ناگزیر ہے۔ کہ وہ اپنے ذاتی تجربہ اور والدین کی امداد سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ بچوں کی تعلیمی کمزوری کا باعث کیا ہے۔ کہ آیا یہ بچے پیدائشی کند ذہن ہیں۔ یا ماحول کے اثر سے یہ کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ ہزاروں بچے کمزور دل و دماغ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ اکثر کی کمزوری دماغ کا باعث خراب تندرستی لاپرواہی اور غیر صحیح تعلیم و تربیت ہوتی ہے۔ ہر مدرس کو چاہئے کہ اس قسم کے بچوں کی تدریجی تعلیمی کیفیت کو قلمبند کرتا رہے۔ دماغی کیفیت کے ساتھ ساتھ۔ اخلاقی، سماجی اور جسمانی حالات پر بھی خاص نظر رکھنا چاہئے۔ ماحول کا اثر بچے کی تعلیم و تربیت اور اخلاق پر غیر محسوس ذرایع سے پڑتا ہے۔

اس قسم کا انفرادی ریکارڈ بچے کی زندگی کی بولتی ہوئی تصویر ہوگا۔ مرض کی تشخیص آسان ہو جائیگی۔ اور تشخیص مرض کے بعد علاج میں سہولتیں پیدا ہو جائیں گی اگر مشکلات بیرونی ہیں تو آسانی سے انکا سدباب ہوسکتا ہے۔ اگر بچہ کی کمزوری دماغ کی وجہ جسمانی، اخلاقی، سماجی خرابیاں ہیں۔ جن کی سطور فوق میں تصریح کر دی گئی ہے۔ تو اس خرابی کا علاج ممکن ہے اور آسانی سے ہوسکتا ہے۔

لیکن اگر پیدائشی خرابیاں ہیں یعنے اگر بچہ قدرۃً کمزور دل و دماغ لیکر پیدا ہوا ہے تو اس کے لئے ایک خاص قسم کے علاج کی ضرورت ہوگی۔ اس قسم کے بچوں کا مسئلہ یہ نہیں کہ اُن کو ذہین و فہیم بنایا جائے بلکہ اس بات کی کوشش کرنا چاہئے کہ ان کے طبعی شوق پر ہوشیاری سے صیقل کیجائے اور ان میں اچھے شہری بننے کی صلاحیت پیدا کر دی جائے۔ تاکہ وہ مستقل مزاجی سے اپنی روزی خود کما سکیں اور دوسروں کے دست نگر نہ رہیں۔ بعض ماہرین سائنس کا خیال ہے کہ بچے پیدائشی غبی و کند ذہن پیدا ہوتے ہیں۔ اس موقع پر بہتر ہوگا کہ توارث اور ماحول کے اثرات پر ایک سرسری نظر ڈال لیجائے۔

توارث اور ماحول

نباتات ہوں یا حیوانات یہ امر مسلمہ ہے کہ ان کے وجود میں آتے ہی ماحول سے وہ متاثر ہوسکتے ہیں۔ توارث اور ماحول کے اثرات نباتات اور حیوانات کے خواص و عادات اور کیریکٹر کا سبب ہوتے ہیں۔ سائنس کے ماہرین توارث کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ برخلاف اس کے حکمار نفسیات ماحول کے قائل ہیں۔

اس امر سے کون اختلاف کر سکتا ہے کہ انسان کی اولاد انسان اور حیوان کی اولاد حیوان پیدا ہوتی ہے۔ اور نہ اس سے کوئی منکر ہوسکتا ہے کہ بری صحبت کا اثر بُرا پڑتا ہے۔ اور اچھی صحبت کا اچھا۔ جاہل ماں اگر بچے کو شیر خواری کے زمانے سے افیون دینا شروع کر دے تو بچے کے اعصاب کمزور پڑ جاتے ہیں۔ جس کا بُرا اثر اس کے دل و دماغ پر پڑتا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ بچوں میں ماں باپ کے عادات و خصائل آیا توارث کا نتیجہ ہیں یا جبلّت نقل کا ظاہرہ ہے۔ کہ ماں باپ کی گود میں بچہ تربیت پاتا ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ ان کے عادات و خصائل

کی نقل وہ بھی کرتا ہو قسمت اگر دو جڑواں بھائیوں کو پیدا ہوتے ہی علیحدہ کر دے اور وہ مختلف ماحول میں پرورش پائیں تو سن بلوغ کو پہونچنے پر محلوں میں تعلیم پائے ہوئے بچے کی ذہنیت غالباً جھونپڑی میں پروان چڑھے ہوئے بچے کی ذہنیت سے مختلف ہوگی۔ اصلیت یہ ہے کہ ماحول ایک زبردست اثر انسان کی فطرت پر ڈالتا ہے۔ پیدائشی کند ذہن بچوں کے دماغی ساخت میں ضرور کچھ نہ کچھ خامی رہ جاتی ہے۔ لیکن یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ بچہ پیدائشی غبی ہے یا ماحول کے اثرات نے اس کے دماغ پر اثر ڈالا ہے کون انکار کر سکتا ہے کہ بعض بچوں میں باریکیوں کے سمجھنے کی قابلیت زیادہ ہوتی ہے۔ اور بعض میں کم۔ لیکن ماہرین سائنس اب تک نہ بتا سکے کہ اس اختلاف کا اصلی سبب کیا ہے۔ اس ضمن میں (پیمائش ذہن) Mental Tests کا ذکر کرنا لازمی ہے۔ کہ ان پیمائشوں سے دماغی اہلیت کو نا پا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ پیمائش مختلف حالتوں میں مختلف نتائج بہم پہونچاتی ہیں مثلاً شہری بچوں اور گاؤں کے بچوں کی ذہنیت علیحدہ ہوتی ہے۔ لہذا ان کی پیمائشیں بھی مختلف ہونی چاہئیں۔ ماحول، فضا، تعلیم و تربیت والدین کی معاشرتی زندگی، سب باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیئے اگر ان تمام باتوں کو ملحوظ خاطر نہ رکھا گیا تو نتائج غیر صحیح ہوں گے۔ مختصر یہ کہ جب تک بچے والدین کے ساتھ رہیں گے تو وارثت اور ماحول میں امتیاز ایک امر محال ہے۔

پیمائش ذہنی کے نظریہ کو پہلے پہل ایک فرانسیسی عالم نفسیات الفرڈ بینے نے پیش کیا۔ اس کے خیال میں ہر بچہ میں قدرتی استعداد ایک معین مقدار میں ہوتی ہے مختلف عمر کے بچوں کے لئے عام مختلف سوالات بنائے گئے اور جب پیمائش ذہن کی فہرست تیار ہوگئی تو بچوں کی ذہنی عمر دریافت کر کے ضعیف العقل اور صحیح العقل میں امتیاز ممکن ہوگیا۔ مثلاً اگر دس برس کا لڑکا صرف ۶ برس کے بچے کے برابر معلومات رکھتا ہے تو اس کی ذہنی عمر ۶ برس کے بچے کے برابر ہوگی۔ تین سال اگر بچہ پیچھے ہو تو "بینے" کی رائے میں یقیناً خاص مدرسہ میں ایسے بچہ کو تعلیم دینا چاہیئے۔ یہ سنگ بنیاد تھا۔ جس پر رفتہ رفتہ ایک عمارت پیمائش ذہنی کی بن رہی ہے۔ مابعد کے ماہرین نفسیات نے بہت کچھ کمی و بیشی بینے کے اصولوں میں کی اور خامیوں کو دور کیا۔ ذکاوت کا درجہ دریافت کرنے کے لئے ذہنی اور پیدائشی عمر دونوں کا

لحاظ رکھنا پڑتا ہے ۔ موجودہ زمانہ میں ہجائی، تعلیمی اور فنی ہر طرح کی پیمائشات موجود ہیں۔

پیمائش ذہنی کے اصولوں نے غبی و ذکی طلبار کی پہچان ممکن ہی نہیں بلکہ ایک حد تک نہایت آسان کردی. علاوہ بریں جیسا کہ سطور فوق سے ظاہر ہے کہ اگر معلم متعلم کی تدریجی تعلیمی کیفیت کی فہرست مرتب کرتا ہے ۔ اور ہر طالب علم کی انفرادی حالت و کیفیت سے واقف ہو تو وہ بآسانی بتا سکتا ہے کہ ان میں سے کون لڑکا غبی ہے۔ اور کونسا لڑکا ذکی ۔ نہ صرف یہ بلکہ اس قسم کی فہرست سے یہ بھی نتیجہ بآسانی اخذ کیا جاسکتا ہے ۔ کہ زید کے غبی ہونے کے کیا اسباب وعلل ہیں ۔

اب صرف یہ مسئلہ بحث طلب رہ گیا کہ غبی طلبار کی تعلیم و تربیت کن تعلیمی اصولوں کے تحت ہونا چاہیئے۔

غبی لڑکوں کی اصلاح کے تدابیر و معالجات شیر خواری کے زمانہ میں ہندوستان میں کسی خاص قسم کی تعلیم دینے کا سوال موجودہ صورت میں پیدا ہی نہیں ہوتا ۔ یہ جسم کی نشو و نما کا زمانہ ہے ۔ لہذا یہ کافی ہے کہ بچوں کو تازہ ہوا میں پرورش پانے کا موقع دیا جائے ۔ اصول صحت کو مد نظر رکھا جائے ۔ چھ برس کی عمر میں جب بچہ پہلی مرتبہ مدرسہ کی صورت دیکھتا ہے ۔ تو چاہیئے کہ کند ذہن اور غبی بچوں کو علٰحدہ جماعت میں کسی ہوشیار اور تجربہ کار معلم کی نگرانی میں رکھا جائے ۔ انکا نصاب تعلیم بھی ایک خاص نہج پر ہونا چاہیئے ۔ اور مدرس کو انفرادی تعلیم کا زریں اصول ہمیشہ مد نظر رکھنا چاہیئے ۔ ان تمام قوتوں کو اُبھارنا چاہیئے ۔ جن کے ظہور کا اب تک موقع نہ ملا ہو ۔ ہر بچہ کی ضروریات کو ملحوظ خاطر رکھکر تعلیم اس طرح سے دیجائے کہ بچہ میں کمتری کا احساس پیدا نہ ہو۔

تعداد طلبار حتی الامکان کم ہونا چاہیئے ۔ زیادہ سے زیادہ بیس طلبا جماعت میں ہوں کیونکہ صرف ایک ہی صورت ہے کہ معلم انفرادی طور پر ہر متعلم کی ذاتی کیفیت اور حالت پر نظر رکھ سکتا ہے جہاں تک ممکن ہو ہم سن لڑکے اور لڑکیاں ایک ہی جماعت میں تعلیم پائیں ۔ بعض مدارس میں جہاں علٰحدہ جماعتیں مستقل طور پر غبی لڑکوں کے لئے مہیا نہیں کیجاسکتیں وہاں اس درجہ میں ایک علٰحدہ جماعت غبی لڑکوں کی قائم

کیجا سکتی ہے ان کا نصاب اور طریق تعلیم درجہ سے جدا ہونا چاہئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مختلف مضامین کی تعلیم مختلف جماعتوں کو وقت واحد میں یکساں دیجائے۔ تاکہ وہ طلبار جو کسی خاص مضمون میں کمزور رہیں۔ نیچی جماعت کے طلبار کے ساتھ تعلیم حاصل کر سکیں۔

طلبار کو سب سے نیچی جماعت میں کسی ایک خامی کی وجہ سے برسوں روکے رکھنا بے حد مضر ہے ان کے ذہن کند ہو جاتے ہیں۔ ان کی طبیعتیں پژمردہ اور حوصلے پست پڑجاتے ہیں۔ سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ جب خاصی عمر کے غبی لڑکے ابتدائی جماعتوں میں شریک ہوتے ہیں۔ تو عموماً ان کو کھیلنے کودنے سے روکا جاتا ہے۔ معلم سمجھتا ہے کہ ان کے لئے یہ مفید ہوگا کہ وہ اپنے کھیل کود کا وقت تحصیل علم میں صرف کریں۔ اس طرح پر وہ اپنی تعلیمی کمی کو پورا کر لیں گے لیکن اس اصول سے لڑکوں کو بجائے فائدے کے نقصان ہوتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ ایسے لڑکوں کو کھیل میں حصہ لینے اور فوقیت حاصل کرنے کی ترغیب دیجائے تاکہ باہمی مسابقت کی وجہ سے ان کا حوصلہ بلند ہو اور اخلاق درست ہوں۔ جب مدرسہ کی زندگی اس طرح پر خوش گوار بن جائے گی تو ان کو خود بخود تعلیم سے دلچسپی اور شوق پیدا ہو جائے گا۔ ان لڑکوں کو دماغی کمزوریوں کا باعث ایک بڑی حد تک خرابی صحت، تازہ ہوا کی کمی، آرام کا میسر نہ آنا، ماں باپ کا فارغ البال نہ ہونا، اور مضر صحت غذا ہے۔

"مرے پر سو درے" یہ کہ تحتانیہ جماعتوں میں سخت گیری سے کام لیا جاتا ہے معصوم بچے، ناعاقبت اندیش مدرسین کی تلون مزاجی کے تختۂ مشق رہتے ہیں۔ بجائے محبت و پیار و ہمدردی وانسانیت کے اُن سے سختی کے لہجے میں بات کی جاتی ہے۔ پھول سے دل، جگر پانی کر دینے والے احکامات سے کُمھلا جاتے ہیں۔ رخساروں کی سرخی کی جگہ ڈر و خوف کی زردی چھا جاتی ہے۔ یہ ڈر ایک مرتبہ ان کے دل پر بیٹھ جانے کے بعد جسمانی نمو کو روکتا ہے۔ وہ طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں کہ غبی اور کمزور بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ایسا ماحول مہیا کریں کہ وہ ہشاش بشاش رہیں۔ اُن کی فطری دلچسپیوں میں حصہ لیں اور ان ہی دلچسپیوں میں کمال پیدا

کرنے کی ترغیب دیں۔ تکلیف دہ کتابی تعلیم پر زور دینے کی بجائے دستی مشاغل میں گوئے
سبقت لیجانے کا جوش ان میں پیدا کریں۔ بجائے مار پیٹ کے ان سے ہنس بولیں۔ اور
اس طرح ان کی ہمتوں کو بڑھائیں۔ جب ہی ممکن ہے کہ یہ اعضاء بیکار پھر کار آمد ہوں۔
نہ صرف یہ کہ ان میں ایک نئی زندگی کی روح پھونک جائیگی بلکہ سماج جو ان کی وجہ سے
دم توڑ رہا ہے تازہ دم ہو جائے گا۔ آگے چل کر یہی ہستیاں قوم و ملک کی پشت و
پناہ ہو سکتی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ بہترین فنی تعلیم حاصل کر سکیں۔ جو کچھ بھی پڑھایا جائے
اس کی غرض و غایت ان پر ہویدا ہونا لازمی ہے۔ نصب العین اگر ان کی سمجھ سے
باہر ہوا تو اسباق میں دلچسپی ہونا محال ہے۔ آنکھوں سے دیکھ اور ہاتھوں سے چھو کر
وہ اشیاء کی اہمیت دس گنا زیادہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ لہذا کتابی تعلیم سے کہیں زیادہ
مادی۔ ٹھوس اور مفید چیزوں سے تعلیم دینا چاہئے۔ جہاں تک ممکن ہو تازہ ہوا میں تعلیم
دیجائے کھیل کود کے آلات مہیا کئے جائیں۔ مختلف مقامات کی سیر کرائی جائے اور بازار
میں لے جا کر اشیاء کے مشاہدہ کا موقع دیا جائے۔ ریت، لکڑی، کارڈ بورڈ، رسی، چمڑا، ٹین
کی قسم کی چیزوں کے ذریعہ بآسانی تعلیم دی جاسکتی ہے۔

گھریلو چیزوں کے بنانے یا درست کرنے میں مہارت دیجائے۔ لکھنا، پڑھنا، ہجے، حساب
کتاب یہ تمام مضامین دستی مشاغل کے ذریعہ سے پڑھائے جائیں۔ کپڑوں کی تراش خراش
کھانا پکانا، مصوری، سنگ تراشی کے ذریعہ سے بچوں میں کتابت آسانی سے حروف
شناسی اور حساب کتاب کا شوق و ذوق پیدا کیا جاسکتا ہے۔

دستی مشاغل کے علاوہ جامد ٹھوس چیزوں کے ذریعہ سے تعلیم بآسانی دیجاسکتی ہے۔
ان چیزوں کے دیکھنے چھونے اور آوازوں کے سننے کا موقع دیا جائے۔ میڈیم مانٹیسوری
نے ثابت کر دکھایا ہے۔ کہ خاص قسم کے آلات استعمال کرنے سے نہ صرف اعضاء میں اس
قسم کی چیزوں کے استعمال کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ قوت ادراک میں بھی پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔
ماڈل اور تصاویر کا استعمال ناگزیر ہے۔ طلسمی فانوس کے ذریعہ سے یا متحرک تصاویر
کے ذریعہ سے اگر تعلیم دیجائے تو زیادہ اچھا ہوگا۔ قدرتی مناظر سے دلچسپی پیدا کرنا لازمی ہے
پھول پھل مختلف قسم کے جانور۔ موسموں کی تبدیلی اور ان کا ملک کی پیداوار پر گہرا اثر نیچر اسٹڈی
کے ذریعہ سے ذہن نشین کرایا جاسکتا ہے۔

بڑے طلبا کو کسی خاص فن میں تعلیم دینا چاہئے۔ تاکہ وہ آیندہ زندگی میں ایسے فن سے مستفیض ہوسکیں اور ان کو اپنے پیشے میں ایک گونہ دلچسپی پیدا ہوجائے۔

سب سے زیادہ بدبختی یہ ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ فرصت کے اوقات میں کیا کریں اور اکثر اوقات کا کاٹنا دشوار ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوجوان آوارہ اور بدچلن ہوجاتے ہیں۔ مدرسہ کا فرض ہے کہ فرصت کے اوقات کیلئے مشغلے فراہم کرکے اور ان شاغل میں بچوں کا رجحان دیکھ کر شوق پیدا کرائے۔ ہزاروں بچے جن کو لکھنے پڑھنے کا شوق نہیں ہوتا گانے مصوری۔ اور ورزش جسمانی میں فوقیت لے جاسکتے ہیں۔

مدرسہ کے نصاب میں صرف وہ ہی مضامین ہونا چاہئے جسمیں بچوں کو دلچسپی ہو اور جن کا تعلق قریبی ان کی آیندہ زندگی سے ہو۔ موجودہ صورت میں مدرسوں میں ایسے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ یا اس طرح پڑھائے جاتے ہیں۔ کہ جس کا کوئی تعلق قریبی ان کی آیندہ زندگی سے نہیں ہوتا۔ اور اسی وجہ سے جو کچھ وہ مدرسہ میں پڑھتے ہیں بیکار ثابت ہوتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ سب بھول جاتے ہیں۔

ساعت تعلیمی ہر مضمون کے لئے علٰحدہ علٰحدہ رکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ بہتر ہے کہ جن مضامین میں بچہ کو دلچسپی ہے ان ہی کے ذریعہ سے دیگر مضامین پڑھائے جائیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بچہ کی معلومات ماحول کی تمام اشیاء کے متعلق پختہ کرادی جائیں۔ انفرادی کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ تاکہ شخصی دلچسپی اور آزادی عمل کے اصول ہاتھ سے نہ جانے پائیں۔ مختصر یہ کہ طریقہ تعلیم ایسا ہونا چاہئے۔ جس سے بچوں کو سبق سے شوق پیدا ہو اور اس طرح تعلیم ان کے لئے پرلطف ہوجائے۔ بچوں کو اس بات کا عادی کرنا چاہئے کہ وہ خود تحقیقات کریں اور نتائج اخذ کریں اور اپنی طبیعت سے بات پیدا کرنے لگیں۔

تعلیم و تربیت کی تکمیل گھر اور مدرسہ میں

میرزا حسین کاظم زادہ نے (جن کی کتاب راہ نو جلد دوم باب یازدہم صفحہ (۱۴۳-۱۵۷) سے ترجمہ کیا گیا ہے اس مقابلہ میں گھر اور مدرسہ میں تعلیم و تربیت کی تکمیل کی ضرورت پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

وہ کمسن بچوں کی تربیت کے بارہ میں لکھتے ہیں۔ ہمارے گھروں میں بچوں کو دبستانی زندگی کے قابل بنانے کے لئے ایسے اسباب مہیا نہیں ہیں جن کے ذریعہ ان کی دماغی اور جسمانی قوی کی کامل طور پر نشو نما ہو سکے۔

اس مقصد کی تکمیل کے لئے ملک میں فروبل کے اصول کے مطابق "باغ اطفال" کنڈرگارٹن اسکولز کے قیام کی سخت ضرورت ہے جہاں کمسن بچوں کو آزادانہ زندگی گذارنے، کھیلنے کودنے اور قسم قسم کے مشاغل میں عملاً حصہ لینے کا موقع ملتا ہے۔ اور اس سے ایک طرف تو قانون فطرت کے مطابق ان کی عقلی اور جسمانی قوتوں کی تربیت ہوتی ہے اور دوسری طرف وہ زندگی کی مختلف شاخوں سے مانوس ہو جاتے ہیں۔

یقین ہے کہ اس موقع پر جب کہ کنڈرگارٹن کے متعلق انجمن اساتذہ بلدہ نے ایک کمیٹی کا تقرر کیا ہے جو آئندہ کانفرنس کے سامنے اپنی مرتبہ رپورٹ پیش کرے گی اصول کنڈرگارٹن کے بارہ میں ایک ہمسایہ قوم کے خیالات جو بازیگاہ علم میں لمبے لمبے قدم بڑھا رہی ہے دلچسپی اور فائدہ سے خالی ہونگے

متین

تربیتی نقطہ نظر سے مدرسہ کے فرائض

بچہ جس روز سے کسی مدرسہ میں قدم رکھتا ہے، اس کی زندگی میں ایک بڑا انقلاب پیدا ہوتا ہے، یہ انقلاب ہمارے مدارس میں بہت سخت اور شدید ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کہ گھر اور مدرسہ کی زندگی میں کچھ بھی مشابہت نہیں پائی جاتی۔ ہمارے بچے، مدرسہ داخل ہونے سے پہلے اپنی مخصوص فضا میں کامل آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگرچہ ہم اپنے گھروں میں کوئی خاص طریقۂ تربیت نہیں رکھتے جو بچوں کو مدرسہ کے لئے تیار کرے۔"

تاہم بچے گھر میں مدرسہ کی بہ نسبت زیادہ آزاد ہوتے ہیں۔

بچے مدرسہ میں ضابطہ اور لائحہ عمل کے پابند ہوتے ہیں۔ ان کی آزادی محدود ہوتی ہے۔ جس وقت جائیں اور جہاں چاہیں نہیں جاسکتے جس چیز کی جانب ان کا دل راغب ہو اس میں مشغول نہیں رہ سکتے جب انھیں کھانے کی اشتہا معلوم ہو نہیں کھا سکتے جس چیز کے وہ دلدادہ اور شائق ہوں اس سے نہیں کھیل سکتے وہ جہاں بیٹھنے کے خواہش مند ہوں نہیں بیٹھ سکتے۔ مختصر یہ کہ انھیں اپنے تمام افعال و حرکات میں مدرسہ کے آئین و قوانین کے مطابق عمل کرنا پڑتا ہے۔ ایران کے مدارس اس حیثیت سے سپاہیوں کی ایک چھوٹی سی قیام گاہ کے مشابہ ہیں۔ اگرچہ ان پر برے اخلاق و عادات سے روکنے، ایک منظم زندگی کا عادی بنانے اور خود سری و مطلق العنانی کے راستہ سے پھیرنے کے لئے۔ جن کے وہ اپنی گھریلو زندگی میں خوگر ہوتے ہیں۔ مدرسہ کو ایک حد تک سختی کرنی چاہئے اور اس طور پر کہ وہ سپاہیوں کی ایک قیام گاہ کا نمونہ ہو جائے لیکن یہ قیام گاہ قدیم ایران کے فوجی مکانوں کے مشابہ یا ایک قید خانہ کی طرح نہو، بلکہ ایک ایسی جگہ ہو جہاں جانے والے قید خانوں سے بالکل دور ہوں مدرسہ انسانیت کا بستان اور علم معرفت کا گلشن ہو! چنانچہ فرانس کا شاعر وکٹر ہیگو کہتا ہے: "جو شخص ایک مدرسہ کا در کھولدیتا ہے گویا وہ ایک زندان کا در بند کر دیتا ہے" "مدرسہ انسان سازی کا ایک کارخانہ ہے۔ یہ وہ تعبیر ہے جو ہماری جدید مطبوعات اور ہمارے موجودہ عہد کے انشا پردازوں کی زبان زد ہے اور فی الواقع مدرسہ کے اصلی معنے کو ظاہر کرتی ہے مدرسہ ایسا مقام ہے جہاں آنے جانے والے اور جس میں ایک عمر گذار دینے والے انسان بن کر نکلتے ہیں۔ ...... لیکن یہ دیکھنا چاہئے کہ انسان کون ہو سکتا ہے اور انسانیت کی شرائط کیا ہیں؟ اس باب میں اہل زمانے کے عقائد کچھ بھی ہوں لیکن میری نظر میں انسان ایسے شخص کو کہنا چاہئے جو سنجیدہ اخلاق اور قوی ارادہ رکھتا اور استقامت و فاداری اور فرض شناسی کا مجسمہ ہو اور زندگی کی شاہ راہ پر قوی امید، جرأت اور آزادی کے ساتھ قدم رکھے! حق پرستی، سچائی، اور صداقت کو اپنا شعار بنائے، خودداری پاک طینتی اور خلوص کو اپنا رہبر قرار دے۔ ظلم منافقت اور دروغ گوئی سے دور رہے۔ اپنی عزت اور بزرگی کو کسی چیز کے معاوضہ میں

نہ بچے اور ترقی و نیک نامی کی راہ میں اپنے آپ کو ناامیدی اور پست خیالی کے پنجہ میں نہ پھنسائے۔

ہمارے مدارس اس قسم کی تربیت سے بہت دور ہیں۔ اور صرف عاجز و کمزور، ذلیل و خوار اور اپاہج نوجوانوں کی پرورش کرتے ہیں۔ چونکہ ہمارے مدارس فن تعلیم و تربیت کے اصول سے نابلد ہیں اسی وجہ سے ہمارے گھر اور مدرسہ کی زندگی کے درمیان ایک گہری خلیج اور ایک سنگین دیوار حائل ہے کیونکہ ایک طرف تو ہمارے مدرسین نے ابتک تعلیم و تربیت کے معنوں اور اس کے حقیقی فائدوں کا پتا ہی چلایا ہے اور نہ اس کے متعلق انہوں نے کچھ کوشش کی ہے اور دوسری طرف خاندانوں نیز اطفال کو اصول کے مطابق کامل طور پر تربیت دی ہی نہیں جاتی۔

بخلاف اس کے ممالک یورپ میں اس طرح عمل نہیں ہوتا! وہاں ایک جانب تو خانگی تعلیم و تربیت کے اصول، فن تربیت کے قواعد کے مطابق ہوتے اور بچوں کو مدرسہ کی زندگی کے لئے تیار کرتے ہیں۔ اور دوسری جانب دیگر مدارس بھی خانگی و اجتماعی زندگی کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہوتے ہیں۔ جس وقت بچہ داخل مدرسہ ہوتا ہے تو وہ اپنے روزانہ مشاغل میں کچھ زیادہ فرق نہیں پاتا بلکہ اس کے برعکس یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر وہ روزانہ کھیل میں اپنے ساتھ چند دوست رکھتا ہوگا۔ تو مدرسہ میں اس سے سو گنے زیادہ ہی ہوں گے۔ اگر اس کے گھر میں صرف ماں باپ ہوں گے جو اس پر نظر شفقت رکھتے ہوں گے۔ اس کی ضرورتوں کو رفع کرتے اور اس کی خواہشیں پوری کرتے ہوں گے مدرسہ میں مدرسین، منتظم اور مہتمم وغیرہ جیسے متعدد اشخاص ہوتے ہیں۔ جو بمنزلہ مہربان والدین، خدمت گذار اور جان کھپانے والے افراد کے ہوتے ہیں۔ قسم قسم کے کھیل گھر سے نسبتہً زیادہ ہوتے ہیں؛ مدرسہ کے باغیچہ اور تفریح گاہ گھر کی نسبت بہت زیادہ بڑی اور خوشنما ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ بہتیرے نقشے، عکسی و قلمی تصویریں، کمرہ ہائے ورزش کتابیں اور کھیل کے سامان مدرسہ میں مہیا ہوتے ہیں جو گھر میں میسر نہیں ہوتے! اسی طرح یورپ کا ایک بچہ بھی مدرسہ میں اپنے آپ کو اجنبی اور دنیا میں نیا تصور نہیں کرتا وہ نہ گھبراتا ہے اور نہ روتا۔ وہ نہ بھاگنے کی فکر میں لگا رہتا ہے اور نہ مدرسہ اور درس سے اکتا جاتا ہے اس وجہ سے کہ وہ آئے دن زندگی اور گھر کے شرائط سے بے بہرہ اور دور

مکمل کود اور گھر کی لذتوں اور خوش حالیوں سے محروم نہیں رہتا۔

حقیقت میں، مدرسہ اجتماعی اور گھریلو زندگی کا نمونہ ہونا چاہئے۔!....
مدرسہ ایک ایسا پل ہے جس پر سے ہم گھریلو یا انفرادی زندگی کے ذریعہ اجتماعی زندگی کی طرف گذرتے ہیں!۔

اسی نقطہ نظر سے مدرسہ کے دو اہم فرائض ہیں: ایک طرف تو بچوں کو ایسے ماحول میں تعلیم و تربیت دے جو ان کے خاندانی ماحول سے کچھ زیادہ فرق نہ رکھتا ہو یعنے جیسا ہم نے بیان کیا ہے بچے کو ایک اجنبی ماحول میں نہ ڈالے جو گھریلو زندگی سے زیادہ فرق رکھتا ہو، اور دوسری طرف اس کو ایسی اجتماعی زندگی کے لئے تیار کرے جس میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد اسکو داخل ہونا پڑیگا۔ یہ اجتماعی زندگی ہی معرکۂ حیات ہے۔

اگر ہم مدرسہ کے اس سب سے پہلے فریضہ کو بھی نظر انداز کر دیں تو بھی مدرسہ کو ذیل کی شرائط کا پابند رہنا ہوگا۔

اول۔ طلبہ کے درس و تعلیم اور ان کے مشاغل میں تنوع اور رنگا رنگی ہو تاکہ جو بچے اپنے گھر میں مختلف مشاغل کے عادی ہو گئے ہیں۔ اور کبھی مسلسل ایک دو گھنٹوں تک ایک ہی چیز کے ساتھ جو درس جیسی سخت تر ہو مشغول نہیں رہے ان کا ذہن دقت اور کوشش کے زیر اثر خراب و خستہ نہ ہو بلکہ اس کے برعکس، مشاغل کی رنگارنگی ان کے قوائے دماغی کی خستگی کو رفع کر دے!

دوم۔ مدرسہ کی عمارت اور باغیچہ وسیع، خوشنما، ہوادار پاک صاف ہو تاکہ بچوں کے شوق اور میلان کو جذب کرے اور حفظ صحت کے اصول کے مطابق ہونے کے سبب سے۔ ان کے جسمانی اور دماغی قویٰ کو سستی اور بیماریوں سے سامنا نہ کرنا پڑے بلکہ جس قدر ممکن ہو باعتبار زیبائش بہترین درختوں، پھلواریوں اور سبزہ زاروں کے بھی مکمل ہو تاکہ بچے اس مقام کو گھر اور کوچہ و بازار پر ترجیح دیں۔

سوم۔ بچوں کے ساتھ اس محبت، مہربانی اور شفقت میں جو ان کے اپنے والدین ان پر کرتے رہتے ہیں کمی نہ کرنی چاہئے کیونکہ بچہ ابھی اس سن میں دلداریوں اور نوازشوں کا محتاج ہوتا ہے اور اس کے احساسات بے حد نازک اور الطاف مہربانی کے خوگر ہوتے ہیں۔

چہارم۔ ورزش جسمانی اور علمی وفنی کھیلوں کا بچوں کے لئے کافی طور پر انتظام رکھیں۔ یہ ورزش اور کھیل تعلیم کے ابتدائی سالوں میں۔ خاص کر ابجد خوان طلبا کی جماعتوں میں زیادہ ہونے چاہئیں اور مذکورہ مشاغل ایسے ہوں جو شوق بھی پیدا کریں اور فرحت بخش بھی ہوں ان کو قاعدے قانون اور مضامین لازمی کے تحت نہ رکھیں؛ اس وجہ سے کہ یہ وقت کھیل کی نوعیت سے خارج سمجھا جاتا ہے اور بجائے دماغی نشوونما اور تفریح کے ان کا بار بہت ہی سنگین اور بچوں کے دماغ کو تاریک و پریشان کر دیتا ہے!...... بلکہ کھیل کے انتخاب اور دوست اور ساتھیوں کے انتخاب میں ان بچوں کو آزادی دینی چاہئے۔ صرف ان کی جبلتوں کی نگرانی اور رہنمائی اور ان کی غلطیوں کی اصلاح کرنی چاہئے اور جس قدر ان کو ممکن ہو ان کو رغبت اور شوق دلانا چاہئے۔

پنجم مدرسے کے ضوابط۔ بالخصوص ابتدائی مدارس کے۔ اتنے سخت نہ رکھنے چاہئیں جو طالب علم کو بالکل مقید اور بے بس بنا دیں۔ یہ مسئلہ نہایت اہم ہے اور دوسری فصلوں میں ایک حد تک اس کی نسبت روشنی ڈالی گئی ہے یہاں اس کے اعادہ کی اس لئے ضرورت ہے کہ اگرچہ ہم بچوں کے مدرسہ داخل ہونے کے وقت ان کی آزادیوں سے بہت کچھ حصہ سلب کر لیتے اور ان کو سخت اور ناموافق قوانین کا پابند کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ قوانین ایسے نہ ہونے چاہئیں۔ جو ان کے دماغی وجسمانی نشوونما میں مانع ہوں اور ان کی استعدادوں اور جذبات کو ترقی و نمو سے روک دیں۔

یورپ کے اکثر ممالک میں خانگی (گھریلو) تربیت کی خامیوں کی تکمیل اور بچوں کو ابتدائی مدارس میں داخل کرنے کے لئے "تربیت خانے" "بستان اطفال" کے نام سے قائم کئے گئے ہیں۔ جہاں بچے تین سال کی عمر سے چھ سال کی عمر تک لئے جاتے ہیں۔ اور وہاں ان کی خاص طور پر تربیت و پرورش ہوتی ہے۔ جو بہترین نتائج پیدا کرتی ہے۔ یہاں ہم مناسب سمجھتے ہیں۔ کہ ان "بساتین" پر بھی ایک سرسری نظر ڈالیں۔

۲۔ بستان اطفال

سویسانی مبصر ژان، ژاک، روسو نے تعلیم و تربیت کے بارے میں اپنے عہد میں بہت بڑا انقلاب پیدا کیا، وہ گھر کی اور فطری تربیت

زور دیتا اور آغوش مادر کو بچہ کا فطری مدرسہ تصور کرتا تھا۔ اپنے عہد کے مدارس کو
ناپسند کرتا اور ان پر سختی کے ساتھ تنقید کرتے ہوئے کہتا کہ یہ فطری تربیت سے خالی
ہیں اور بچوں کو تربیت کرنے کے بجائے بار ڈالتے ہیں۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے
وسط میں طرز تعلیم کے مصلح پٹالوجی نے عالم وجود میں قدم رکھا، اس نے "روسو"
کے تخیل اور نظریوں کو جامۂ عمل پہنایا اور اپنے عہد کے تعلیم و تربیت کے طریقوں پر
جدید اصول کا اضافہ اور علم و معرفت کی دنیا میں قابل ستائش خدمت بالخصوص
فن تربیت سے متعلق انجام دی جس کی تفصیل اس کتاب میں کسی اور جگہ پر بیان کی گئی
ہے۔ اسی صدی کے آخر میں ایک اور درخشاں ستارہ سرزمین جرمنی میں طلوع ہوا
جس کے سبب سے ان دونوں مبصرا اور سویتانی مربی کے تخیل اور اصلاحات کے نتائج
نے عملی قوت حاصل کر کے فن تربیت کی دنیا کے لئے ایک نیا راستہ پیدا کر دیا۔ اس
مہربان مربی (تربیت دہندہ) کا نام فروبل ہے۔

فریڈرک فروبل جو "بساتین اطفال" کا اولین بانی ہے، سال ۱۷۸۲ء عیسوی
میں تولد ہوا اور اکثر محترم ہستیوں — خاصکر جماعات انسانی کے تربیت دہندوں
کی طرح اپنے عہد شباب کو نہایت تکلیف و عسرت کی حالت میں گذارا اور یہاں تک
کہ سال ۱۷۹۹ء میں جب وہ شہر "ینا" کے دار الفنون (جامعہ) میں زیر تعلیم تھا،
تہیدستی کی وجہ سے اپنے سلسلۂ تعلیم کو ترک کرنے پر مجبور ہوا۔ اس کے بعد اس نے
سال ۱۸۱۷ء میں ایک کتاب "تربیت انسان" کے نام سے شائع کی۔ اس کتاب
میں وہ عام طور سے تربیت کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے
تربیت صحیح سے یہ مراد ہے کہ بچے کی تمام استعدادیں اور قابلیتیں ایک ساتھ اور
ایک ہی جگہ پر ورش پائیں، تنہائی اور انفرادی شکل میں نہیں یعنے قوتوں اور
قابلیتوں کی پرورش میں عملاً تناسب و یکسانیت ملحوظ رہے۔

اس نے سال ۱۸۳۱ء میں سوئیزرلینڈ جا کر شہر لوزان میں ایک "تربیت خانہ"
کی بنیاد رکھی اور سال ۱۸۳۵ء میں یتیم خانہ "بورگدورف" کی نگرانی اپنے ذمہ لی اور
یہی وہ مقام ہے جہاں وہ ایک مدت تک بچوں کی ذہنی کیفیات کے دریافت کرنے
میں مصروف رہا، کتابوں اور فن تربیت کے ماہرین کی تحریرات کا گہری نظر سے

مطالعہ کیا۔ کمسن بچوں کی تربیت کی اہمیت پہلے سے زیادہ اس کی نظر میں قائم ہوئی اور ایک عرصہ تک اسی موضوع کے متعلق، تفکر و تحقیق میں مصروف رہا، یہاں تک کہ اس نے سال ۱۸۳۷ء میں جرمنی واپس جاکر اپنی زندگی کو کمسن بچوں کی تربیت کے لئے وقف کر دیا اور سال ۱۸۳۹ء میں پہلے پہل اس نے شہر "بلانکن بورک" میں "بستان اطفال" کی بنیاد رکھی۔ اس "بستان اطفال" نے بہت جلد عوام اور حکومت کی نظر توجہ کو اپنی طرف جذب کر لیا اور ان کی دلچسپی کا موجب بنا، چونکہ ان "بساتین کے اہتمام کے لئے ایسے خصوصی تربیت دہندوں کی ضرورت تھی جو اس کے تخیل اور نظریوں کو سمجھیں اس لئے سال ۱۸۵۰ء میں اس نے تربیت دہندگان اطفال کی فراہمی کی غرض سے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی اور وہیں انہیں، بچوں کی تربیت کے قوانین و فرائض کی تعلیم دی۔

اس کے بعد وہ تعلیم و تربیت کے قواعد و اصول کی نشر و اشاعت اور تصنیف و تالیف اور "بساتین اطفال" کے کاروبار کی نگرانی میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ ایک کتاب "بچوں کو خود زندگی بسر کرنے کے لئے چھوڑ دو" کے نام سے شائع کی۔ نیز اس کتاب "مکتوبات متعلق بہ بساتین اطفال" بیحد مقبول ہوئی اور اسی تاریخ کے بعد سے اس کے تربیت کے متعلق نظریے اور تخیل یورپ کے اکثر ملکوں میں قبولیت کی نظر سے دیکھے اور جاری کئے گئے۔

فروبل کے تربیتی نظریوں اور اصول کا چند سطور میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے: گھریلو تربیت کمسن بچوں کی پرورش کے لئے ناکافی ہے؛ اس وجہ سے کہ ایک جانب تو تمام خاندان تربیت کے ضروری وسائل اور سامان فراہم نہیں رکھتے اور دوسری جانب ایک خاندانی دائرہ بہت ہی مختصر اور محدود ہوا کرتا ہے، بچہ اپنے اطراف صرف تین چار نفوس سے زیادہ کو نہیں دیکھتا، درآں حالے کہ وہ ایک بڑی جماعت کے درمیان زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے، بچہ کی تربیت زندگی کے ابتدائی سالوں میں، گھر میں اور خاندان کے درمیان، اس کو اس کی اپنی استعداد کے موافق نہیں دی جاتی؛ بچہ جھجکنے والا جھگڑالو، وحشی، اداس، بدخو اور ڈرپوک اور بالفاظ دیگر اس کی زندگی کا ایک ہی رخ، ایک ہی پہلو نشو و نما پاتا ہے اور اس قسم کی تربیت زندگی کی

ستیزہ گاہ میں اقبال مندی کی بقا کے لئے کافی نہیں اور چونکہ یہ ابتدائی تربیت زندگی کے تمام ادوار میں اثر انداز ہوتی ہے اس لئے بچے مدرسہ کی تدریس سے زیادہ بہرہ مند نہیں ہوتے اور جس وقت یہ بڑے ہو کر سماجی زندگی میں قدم رکھتے ہیں۔ اس وقت جتنی چاہئے اتنی روانی عمل، کوشش، دانشمندی، مہارت، اور بصیرت کے اثر سے بالکل عاری اور اپنی قوم کے لئے ایک عضوِ معطل ثابت ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر کمسن بچوں کی تین سال کی عمر سے چھ سال کی عمر تک جو تعلیم کا ابتدائی زمانہ ہے "بساتین اطفال" میں خصوصی اصول و قواعد کے ذریعہ تربیت کرنی چاہئے تاکہ وہ ایک طرف تو مدرسہ داخل ہونے اور اس میں تعلیم پانے کے لئے قبل از قبل تیار اور قابل ہو جائیں۔ اور دوسری طرف ان کی تمام استعدادیں اور قابلیتیں ایک خاص نسبت و قوت کے ساتھ پرورش پائیں۔

جیسا کہ "بستان اطفال" کے نام سے سمجھا جاتا ہے یہ عمارت مدرسہ نہیں کہلاتی، نہ ان میں جماعت ہوتی ہے اور نہ وہاں درس دئے جاتے ہیں۔ بلکہ وہ ایک بستان سرا ہے جہاں بچے زندگی بسر کرتے کھیل کود میں وقت گزارتے اور پرورش پاتے ہیں۔ فروبل کے تخیل کے اعتبار سے یہ "بساتین اطفال" نہ صرف خاندان کے قائم مقام ہوتے ہیں۔ بلکہ کھیلوں، مشغلوں اور بچوں کی باہمی معاشرت کے وسیلہ نوع انسانی کی اصلاح حال کے لئے نہایت ضروری اور مفید ہیں اس وجہ سے کہ یہ کھیل اور کھلونے جو یہاں بچوں کو مشغول رکھتے ہیں۔ ان کے وجود اور ان کے حواس کی پرورش کرتے اور فطری طور پر اور کامل آزادی کے ساتھ ان کی نشوونما میں مدد دیتے ہیں۔

ان بساتین میں غالباً بچے سیر اور بعض طفلانہ کھیلوں میں مصروف رہتے اور ان کے مخصوص کمروں میں، اقسام کے مشاغل (مثلاً: کاغذ اور مقوی کا کاٹنا، ان کا موڑنا اور چپکانا اور یہاں تک کہ بعض چیزوں کا سینا) ان کے لئے مہیا کئے گئے ہیں قصوں کا سیکھنا اور ان کی نقالی (اداکاری) اور نظموں اور کہانیوں کا آواز سے پڑھنا بھی بچوں کے مرغوب ترین مشاغل میں داخل ہے۔ نیز اکثر وہ چھلے اور رنگ برنگ کے ڈبوں کے ساتھ کھیلتے اسی دوران میں رنگوں کی شناخت پیدا کرتے

امداد دیکھتے ہیں۔ اور اچھلنے کودنے اور فطری و آزاد ورزشوں کے ذریعہ تقویت حاصل کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض ان میں سے حروف الف بار کے ساتھ، جو لکڑی اور مقوی سے تیار کئے جاتے ہیں کھیلتے اور بتدریج حروف کی شکلوں سے آشنا ہوتے ہیں۔ اور بقدر امکان ہاتھ منہ دھونے لباس پہننے، غذا کھانے اور تمام قسم کے کاموں اور مشاغل میں حصہ لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ آزادانہ اور مستقل طور پر اپنی آپ نگرانی کرتے اور زندگی کی ضرورتوں سے واقف ہو جاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اس قسم کی تربیت کی مدد سے بچے قانون فطرت کے مطابق نشو و نما حاصل کرتے ہیں اور اس سے ان کی جسمانی قوت بڑھتی اور ان کے حواس کی تربیت ہوتی اور ان کے قوائے عقلیہ ترقی پاکر کام کے قابل ہو جاتے ہیں، ان کی روح اور دل حقایق و رجحانات اور فطری و انسانی دنیا سے آشنا ہو کر زندگی کے مختلف شعبوں سے اُنس پیدا کرتے ہیں۔

اس طرز تربیت کے اساس سے بچوں کو ان کے طبعی میلان کے مطابق آزادی دینا مراد ہے تربیت دہندہ کا نگرانی، سیر کرانا، معاونت رہنمائی اور محبت کے سوا کوئی اور کام نہو۔ یعنی تربیت دہندہ کا طرز عمل یہاں حاکمانہ اور جابرانہ نہ ہو بلکہ رہنمائی و معاونت کی شکل میں ظاہر ہو۔

اس وقت یورپ کے ہر ایک ملک میں اس نوعیت کے متعدد "بستان اطفال" موجود ہیں۔ اگر ہم ایران میں بنیادی اصلاحیں عمل میں لاکر تعلیم کو پختہ بنیاد پر رکھنا چاہیں۔ تو اس سے ابتدا کرنی پڑے گی۔ سب سے پہلے خصوصی تربیت یافتہ اساتذہ (استادوں اور استانیوں) کی اس کام کے لئے ایک جماعت تیار کرنی پڑے گی اور پھر کمسن بچوں کو "بستان اطفال" میں پرورش کرنے کے ہی دوران میں انکی ہی دوران میں ان کی ماؤں کو اس امر کی اجازت دیں کہ وہ آکر اپنے کمسن بچوں کی تربیت اور ان کی زندگی کی حالت اور انتظام کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور اپنے گھر میں اسی طریقہ کے ساتھ عمل کریں۔ اس قبیل کے بساتین (بالک باغوں) کا قائم کرنا نونہالان وطن کی تربیت کے لئے ملک و قوم کی بہت بڑی خدمت ہے اور خدائے تعالی کے نزدیک یہ کار خیر بہت بڑے ثواب کا موجب ہے حقیقت میں

اس سے بڑھکر اور کیا احسان و بزرگی ہو سکتی ہے کہ پاکدل و بے بس معصوم بچوں کو تربیت صحیح کی نعمت سے بہرہ ور بنا دیں۔

اگر وہ افراد جو ہمت اور حمیت و شرافت کے جذبے کے مالک ہیں۔ اگر وہ اشخاص جو خود یتیم رہے ہوں اور کوئی سرپرست و مربی نہ رکھتے ہوں اور انتہائے یاس و اشک غم کے ساتھ (کس مپرسی کی حالت میں) بڑے ہوئے ہوں، اگر وہ سربرآوردہ شخصیتیں جو ان پڑھ والدین کی بے پروائی اور غفلت کی وجہ سے پست حال ہو کر اپنی حالت پر افسوس کرتی ہوں، اگر وہ زمانہ فہم و تعلیم یافتہ خاندان جو اپنے وطن کی خدمت اور نیکنامی کی آرزو و شوق رکھتے ہوں، ان لاکھوں معصوم اور بدنصیب بچوں کی دجو ایران کے گوشوں اور نادان ماؤں کی آغوش میں بلک رہے ہیں) حالت پر توجہ کریں اور ان کے لئے تربیت خانے، سیدا گھر اور بالک باغ بنا دیں اور ان کی تربیت کی غرض سے ہمہ تن مصروف ہو جائیں تو وہ اپنے نام کو زندہ جاوید بنا سکتے اور ایران کی نوزادنسلوں کو موجودہ مخرب اخلاق گرداب سے نجات دلا سکتے ہیں۔

لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ ہمارے ملک میں جو لوگ صاحب ثروت ہیں وہ ہمت و حمیت کے جذبے سے بالکل خالی ہیں اور جو لوگ صاحب حمیت ہیں وہ تنگدستی کے بھنور میں غوطے کھا رہے ہیں!

ترجمہ: ابو المحاسن محمد محسن خان متین

کنڈرگارٹن اور پسماندہ بچے

ناظرین حیدرآباد ٹیچر بخوبی واقف ہوں گے کہ آیندہ کانفرنس انجمن اساتذہ کے سامنے مندرجہ بالا دو عنوانوں پر رپورٹیں پیش ہوں گی ان رپورٹوں کی ترتیب کے لئے کمیٹیاں مقرر کی جاتی ہیں۔ جو سال بھر تک کامل غور و خوض کے بعد اپنے خیالات قلمبند کرتی ہیں۔ ہم اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ کمیٹیوں کے پیش نظر عنوانات پر انجمن اساتذہ کی ہر شاخ میں بحث و مباحثہ ہوتا ہے جس کے نتائج سے کمیٹیوں کو بہت کچھ مدد ملتی ہے۔ ہم عرصہ سے اس فکر میں تھے کہ شاخہائے انجمن کی کارروائیوں سے ناظرین رسالہ کو روشناس کرائیں لیکن بعض وجوہ سے ممکن نہ ہوسکا۔ اب جناب میر غلس صاحب انجمن کی خاص توجہ سے ہم اس قابل ہوئے ہیں کہ اس خواہش کو عملی جامہ پہنا سکیں چنانچہ سہ ماہی گذشتہ کی کارروائیوں سے کنڈر کارٹن اور پسنڈی طلبا کے متعلق جو مفید و کارآمد مواد ملسکتا ہے۔ وہ ہم پیش کر رہے ہیں۔ ہم کو توقع ہے کہ آیندہ بھی معتمد صاحبان مقامی اپنی شاخ کی روئداد روانہ فرما کر ہمیں شکر گذاری کا موقعہ عطا فرمائیں گے فقط

ادارت

مدرسہ فوقانیہ دارالشفا، بوجہ شیوع طاعون صرف ایک جلسہ بعنوان ”کمزور طلبہ کی شناخت اور اسباب کمزوری کی تشخیص“ ماہ آذر میں ہوا۔ اس جلسہ میں مولوی سید محمد رضا صاحب و مولوی امجد علیصاحب و مولوی سید تراب علیصاحب نے تقریریں فرمائیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ”طلبہ تعلیم میں اس وجہ سے کمزور رہتے ہیں کہ انھیں موزوں غذا، لباس ہوا اور مقام رہایش نصیب نہیں ہوتا۔ بعض طلبا کو کسی مضمون سے دلچسپی نہ ہونے سے بھی کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ غیر واضح تفہیم، کئی کئی سال تک ایک ہی جماعت میں رہنا، ناواجبی ترقی، ناکافی تحریری کام گیمس میں زیادہ انہماک، والدین کی عدم نگرانی، دیر حاضری اور غیر حاضری کمزوری کے بہت بڑے اسباب ہیں۔

مدارس وسطانیہ زیدی نسی ازا مقررہ عنوانات میں سے تین عنوانات پر تقریریں ہوئیں۔ طلباء میں رہنمائی کی اہلیت پیدا کرنے کے متعلق بالاتفاق یہ رائے قرار پائی کہ طلبہ کو حقیقی تاریخ پڑھائی جائے اور سوانح عمری کا مطالعہ کیا جائے نیز طلبہ ہائے تقاریر وغیرہ کا انتظام کیا جائے جس میں بچوں پر ذمہ داری کا بوجھ ڈالا جائے۔ موجودہ مدارس میں چھ سال سے کم عمر طلباء کی تعلیم کے بارہ میں جو بحث چھڑی اس میں اکثر لائق حضرات نے حصہ لیا۔ عام خیال یہ تھا کہ مدارس وسطانیہ سے اجرت تعلیم معاف کر دی جائے اور ابتدائی تعلیم کنڈرگارٹن کے اصول پر دی جائے یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا۔ کہ چھوٹے بچوں کی خاطر خواہ تعلیم صرف عورتیں ہی دے سکتی ہیں اس لئے اگر ممکن ہو تو ہر مدرسہ کے اسٹاف میں کمی کر کے معلمات کا تقرر کیا جائے۔

مدارس وسطانیہ مستقر لورہ پسنڈی طلباء کی شناخت اور پسنڈی پن کے اسباب کی تشخیص کے بارہ میں مولوی قاری سید جمیل الدین صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ کمزوری طلباء کے مختلف اسباب ہوتے ہیں بعض کے تو والدین کمزور ہوتے ہیں۔ یا ارکوئی بیماری رکھتے ہیں اور اس کے اثرات ان کی اولاد میں منتقل ہوتے ہیں۔ دیر رسی اور غیر حاضری بھی بڑا سبب ہے۔ آزاد صاحب کے نزدیک وجہ یہ ہوتی ہے کہ والدین اور بعض اوقات مدرسین ۹ سال بھر تک طلبہ کی کمزوریوں سے غافل رہتے ہیں۔ طلبہ سالانہ امتحان میں ناکام ہو جاتے ہیں تو اس وقت افسوس اور تعجب ہوتا ہے اور اپنے اثرات کو کام میں لا کر ناکام طلبہ کو اعلیٰ جماعت میں ترقی دلا دیتے ہیں۔

چھ سال سے کم عمر بچوں کی تعلیم کے لئے موجودہ مدارس میں کیا انتظام ہونا چاہئے؟ اس سوال کے جواب میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ ہمارے مدارس میں اسٹاف کم اور ناموزوں ہے اس لئے چھوٹے بچوں کی تعلیم بہت دشوار ہے انگلستان میں دو سال کی عمر کے بچوں کے لئے بھی تعلیم کا انتظام ہے اگر ہمارے ہاں بھی ویسا ہی انتظام کیا جائے تو عمدہ نتائج مترتب ہو سکتے ہیں۔ موجودہ حالت میں کمسن بچوں کی ایک جماعت لحاظ عمر و ذہنیت قائم کی جائے۔ ضروری تعلیمی اشیاء مہیا کی جائیں۔ اور کنڈرگارٹن کے اصول پر تعلیم دیں۔ مدرس لائق، تجربہ کار، متحمل اور سمجھدار ہو۔ اور چونکہ کم عمر بچے

عورتوں سے زیادہ مانوس رہتے ہیں۔ اس لئے ان کی تعلیم کے لئے معلمات ہی بہتر موزوں ہو سکتی ہیں۔

مدرسہ وسطانیہ شاہ علی بنڈہ پھسڈی طلبا کے متعلق دو جلسے ہوئے۔ پھسڈی طلبا کا مفہوم غلط سمجھا گیا۔ اور غبی و کند ذہن طلبہ کو درست کرنے کے کئی مفید طریقے پیش کئے گئے چنانچہ کہا گیا کہ بعض طلبہ اپنے شکوک مدرس کے ڈر سے نہیں ظاہر کرتے اسی لئے آخر کار بہت کمزور ہو جاتے ہیں۔ پس مدرسین ایسا برتاؤ کریں کہ طلبا استاد کو اپنا ہمدرد و شفیق سمجھنے لگیں بعض حالتوں میں یہ بھی ضروری ہے۔ کہ استاد کمزور طلبا کو معلوم کر کے انفرادی توجہ مبذول کرے۔ بلکہ جماعت میں طریق نشست اس طرح ہونی چاہئے کہ ہر ذہین طالب علم کے بازو میں ایک سست ذہن لڑکا جگہ پائے۔ سزا سے احتراز ضروری ہے کیونکہ اس سے طلبہ میں خوف پیدا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ خوف کی صورت میں رہی سہی عقل بھی جواب دیدیتی ہے۔ جناب صدرنشین صاحب نے البتہ اپنے قیمتی خیالات سمجھا کر بیان کئے اور فرمایا کہ یورپ میں پھسڈی طلبہ کی کمزوری کو رفع کرنے کے لئے مختلف طریقے رائج ہیں۔ مثلاً جرمنی میں سارے ضلع یا شہر کے پھسڈی طلبہ کا ایک خاص اسکول ہوتا ہے۔ یہاں نصاب تعلیم بھی ہوتا ہے جو ذہین و اوسط طلبہ کے لئے مقرر ہوتا ہے البتہ فرق یہ ہوتا ہے کہ اس کے اہم موضوعات کو سہل کر کے ان پر مشقیں دی جاتی ہیں لیکن اس طریقہ میں نقص یہ ہے کہ اس سے طلبہ کے اخلاق پر ناخوش گوار اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ مدارس عوام میں بری نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور ان مدارس کو مدارس حمقاء کا نام دیا جاتا ہے۔ مگر خاص خاص آلات تعلیم اور موزوں اساتذہ کی کمی کے سبب یہ طریقہ ہمارے لئے قابل عمل نہیں ہے۔ البتہ امریکہ کی مثال ہمارے لئے قابل تقلید ہے۔ یہاں ہر اسکول میں پھسڈی طلبہ کی خاص کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے خاص مضامین کی مشقیں دیجاتی ہیں۔ بالخصوص کھیل کے میدان میں ان طلبہ سے کام لیا جاتا ہے۔ اس طریقہ میں فائدہ یہ ہے کہ پھسڈی طلبہ کو اوسط درجہ کے طلبا کے ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع ملتا ہے اور اسطرح پھسڈی طلبہ میں خودداری باقی رہتی ہے۔

مدرسہ وسطانیہ جنگلگوڑہ موجودہ مدارس میں چھ برس سے کم عمر طلبہ کی تعلیم کے متعلق مقررین نے خیال ظاہر فرمایا کہ جماعت صغیر کی برخاست کیوجہ سے چھوٹے بچوں کی تعلیم خاطرخواہ نہیں ہوسکتی۔ اس لئے موجودہ مدارس میں کنڈرگارٹن کے اصول پر تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے۔ چونکہ اس غرض کے لئے خاص موزونیت اور خاص اہلیت کے اساتذہ کی ضرورت ہے اس لئے ہر مدرسہ میں ایسے موزوں اساتذہ کا انتظام کیا جائے اور ان کو خاص طور سے طریقہ تعلیم کنڈرگارٹن سے واقف کرایا جائے۔ تاکہ وہ بچوں کو اس طرح تعلیم دیں کہ کھیل معلوم ہو اور ساتھ ہی ساتھ تعلیم بھی ہوتی رہے۔

مولوی فصیح الدین صاحب صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ رین بازار نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ چونکہ بچے عورتوں سے فطرۃً زیادہ مانوس ہوتے ہیں اس لئے چھ سال سے کم عمر والے لڑکوں کو مدارس نسوان میں تعلیم دیجائے۔

پھسڈی طلبا، کی تعریف مولوی شیخ محبوب صاحب نے یہ کی کہ وہ لڑکے ہیں جن میں کسی سبب سے عارضی طور پر کمزوری پیدا ہو جاتی ہے ان لڑکوں کی کمزوری کا اگر سبب معلوم کر لیا جائے تو یہ تعلیم سے خاطرخواہ بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔ یہ بالاتفاق ضروری خیال کیا گیا کہ ایسے لڑکوں کی الگ جماعت قائم کی جائے اور ان کی تعلیم کسی خاص مدرس کے ذمہ کر دی جائے تاکہ وہ اپنی کمزوری کو رفع کرلیں اور جب وہ پھر اوسط درجہ پر آجائیں تو انھیں معمولی طلبا کے ساتھ تعلیم میں شریک کیا جائے

مدرسہ وسطانیہ گولکنڈہ شاخ گولکنڈہ میں "پھسڈی طلبا کی شناخت اور اس کے اسباب کی تشخیص" کے موضوع پر متعدد پر مغز تقریریں ہوئیں جن کے اثنا میں کہا گیا کہ عملی تجربوں اور عام مشاہدوں سے لڑکوں کے عموماً تین طبقے ہوسکتے ہیں پہلا طبقہ وہ ہے جو قدرتاً ذہین اور محنتی ہوتا ہے۔ جس کو ہم ذکی کہتے ہیں۔ دوسرا وہ جو ذہین تو ہوتا ہے لیکن لاپروائی کے سبب متوسط قرار دیا جاتا ہے۔ اور تیسرا پھسڈی کھلاتا ہے۔

پھسڈی پن کے یوں تو کئی وجوہ ہو سکتے ہیں لیکن عموماً دو بڑے وجوہ ہوتے ہیں۔ ایک تو ماں باپ کی بیجا محبت۔ دوسرا استاد کی بے التفاتی۔

پھسڈی لڑکوں کی شناخت یہ ہے کہ وہ استاد کی نگہ سے دور رہنا چاہتے ہیں

تعلیم میں لاپرواہ ہوتے ہیں۔ مدرسہ میں آوارہ پھرتے رہتے ہیں۔ اور اکثر سوتے رہتے ہیں۔ حیلہ جو ہوتے ہیں۔ اور بیماری کا اکثر بہانہ کیا کرتے ہیں۔

ایک دوسرے نظریہ سے پھسڈی لڑکوں کی دو اور قسمیں ہوتی ہیں (ایک) شاہی پھسڈی۔ (دوسرے) مفلس پھسڈی۔ قسم اول میں دولت کا بیجا اصراف باعث ہوتا ہے اور قسم دوم میں بے زری۔ اس لئے کہ دولتمند لڑکے اپنی توجہ اور وقت کو لباس و کتب کی نمایش میں ختم کرتے ہیں۔ اور استاد کسی شکایت وغیرہ کے خیال سے سختی نہیں کرتا اور مفلس لڑکوں کی بے سامانی کے باعث ملتفت نہیں ہوتا۔

پھسڈی پن کے اور بھی کئی وجوہ ہو سکتے ہیں۔ مثلاً جسمانی کمزوری۔ اخلاقی کمزوری۔ ماحول غربت اور ماں باپ کی کم التفاتی۔ اگر ایک ذہین لڑکے کی جسمانی کمزوریوں کا تدارک نہ کیا جائے تو وہ پھسڈی ہو جاتا ہے۔ مثلاً کمزوری بصارت۔ سماعت۔ اظہار خیالات وغیرہ بھی کمزور و پھسڈی بنانے کے لئے کافی ہے۔ اخلاقی کمزوری بھی ذہین سے ذہین کو پھسڈی بنا دیتی ہے غربت کی وجہ بھی ابتدائی تعلیم میں خامیاں رہ جاتی ہیں۔ اور آیندہ پھسڈی پن کا باعث ہوتی ہیں اساتذہ کی مغربی طرز تعلیم کی نقل پیندی و امتحانی نقائص سے بھی بعض لڑکے پھسڈی ہو جاتے ہیں۔ اگر اس کے لئے اسپشل کلاس قائم کیجائے تو نہایت مفید ہے پھسڈی پن کو روکنے اور پھسڈی لڑکوں کو ذہین بنانے کے لئے مناسب ہے کہ چھوٹی جماعت پر تجربہ کار مدرس ہو۔ تاکہ ابتدا سے تعلیم باقاعدہ ہو اور کسی قسم کی کمزوری پیدا نہو سکے ابتدا میں بچوں کو کمزور قصے کہانیاں نہ سنائی جائیں۔ بچوں کو بری صحبتوں سے بچایا جائے۔ جسمانی کمزوریوں کا تدارک کیا جائے۔ سزا میں احتیاط برتی جائے۔ دولتمند لڑکوں میں دولت کا احساس نہونے دیں اور مفلس لڑکوں کی ضروریات متعلق مدرسہ کو عملی ترکیبوں سے کام لیا جائے مثلاً انعام۔ امتیازی نمبرات وغیرہ بچوں کو بیکار رہنے اور کاہلی کی عادت سے بچایا جائے۔

چھ سال سے کم عمر بچوں کی تعلیم کے متعلق بھی جو بحث ہوئی اس میں اکثر ممبران نے دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا اور مفید تقریریں کیں۔ ان تقریروں کا ماحصل یہ ہے کہ

چھوٹے بچوں کی ابتدائی تعلیم پیش خیمہ ہوتی ہے ان کی آیندہ تعلیم و زندگی کا۔
اس عمر میں جس قدر ان کے جسم و دماغ کی اعلیٰ تربیت ہوگی آیندہ وہ استعداد عالی مرتبہ
ہوں گے۔ ان کی تعلیم کے لئے ایک تجربہ کار و نفسیات سے واقف مدرس کی ضرورت
ہے اس کے لئے عورتیں ہی مفید و موزوں ثابت ہوئی ہیں۔ گذشتہ زمانہ میں ابتدائی
تعلیم کا انتظام عورتوں ہی کے ذریعہ ہوا کرتا تھا یہ طریقہ ممالک مغربی میں اب بھی رائج
ہے۔ چھوٹے بچوں کی تعلیم کے انتظامات اندرون ۶ سال ہی پورے کر دئیے جائیں
ان کے لئے بہ نسبت معلم کے معلمہ نہایت مفید و موزوں ثابت ہو سکتی ہیں۔ اس لئے کہ
چھوٹے بچوں کے میلانات وغیرہ کو ان کی والدہ بہ نسبت اوروں کے خوب جانتی ہیں۔

موجودہ مدارس میں موجودہ حالت میں انتظام کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ایسی
جماعت پر ٹرینڈ مدرس ہوں ان کی تعلیم بطور کھیل ہونی چاہئے اور بجائے کتابی
تعلیم کے اشیاء محسوسہ کے ذریعہ تعلیم کا انتظام ہونا چاہئے۔ اس کے لئے تعلیم کنڈر گارٹن
نہایت مفید و موزوں ثابت ہوئی ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ مدرسہ کی کتابی
تعلیم کے پیشتر بچوں کے قوائے جسمانی و دماغی کی باقاعدہ نشو نما ہو۔ بچوں کی
فطری دلچسپی محسوسات میں زیادہ ہوتی ہے۔ کنڈر گارٹن کی تعلیم میں بجائے قیمتی
اشیاء کے معمولی چیزوں سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ریت، گارے کے پتوں
تیلیاں، کنکنی، مٹی، بیج، گولیاں۔ رنگین تصاویر۔ نمونہ جات گلی و نقشہ جات اور
انگریزی و اردو حروف کے خوشنما کارڈ وغیرہ مذکورہ بالا وسائل کے ذریعہ
حسابی و ادبی تعلیم وغیرہ بخوبی ہو سکتی ہے۔

طلبہ کو آزادی دی جائے اور ان کو اس بات کا اختیار دیا جائے کہ وہ
ہر چیز کو بنائیں یا توڑیں۔ بچوں کی غیر ارادی توجہ سے کام لیا جائے۔ دوران کا
نظام الاوقات ایسا ہو جس میں ہر ۱۵ منٹ کے بعد تعلیم کا ڈھنگ بدلا جائے
اور کچھ وقفہ دیا جائے۔ کیونکہ چھوٹے بچے اس سے زیادہ کسی چیز پر توجہ نہیں دے سکتے
ان کی تعلیمی نگرانی و طرز گفتگو گھر اور مدرسہ ہر دو جگہ یکساں ہونی چاہئے
تعلیم میں سزا کو دخل نہ دیا جائے۔ کیونکہ سزا سے تعلیم میں بجائے شوق و رغبت کے
خوف و نفرت پیدا ہوتی ہے۔ مدرسہ ان کے لئے خوشگوار اور کھیل کا مقام ہو اور۔

ان کی تعلیم بطور کھیل کے ہو۔

چونکہ جسمانی حرکات کا اور حواس خمسہ کے استعمال کا اثر نظام دماغی میں تغیر پیدا کرتا ہے۔ اس لئے تعلیم میں اس کا لحاظ ہو کہ بچوں کے حواس خمسہ ہر وقت کام کرتے رہیں اس طرح کھیل و فطری دلچسپیوں کے ذریعہ ان کی تعلیم ترقی پاتی رہے۔ لیکن یہ سب چیزیں اسی وقت ممکن ہیں۔ جب کہ ان کا مدرس بچوں کے فطری میلانات سے واقف و وتجربہ کار ہو۔

مدرسۂ فوقانیہ نیا میلی حفظان صحت پر تقریر فرمانے کے لئے ڈاکٹر مہندراج صاحب کو مدعو کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دوران تقریر میں فرمایا کہ علم حفظان صحت ایک وسیع علم ہے۔ ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ اصول حفظان صحت کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے تاکہ صحت برقرار رہے اور وہ عرصہ تک زندہ رہ سکے۔ اگر اساتذہ صاحبان بچوں کی طرف توجہ کریں تو کثرت اموات کا بہت کچھ انسداد ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد ہوا کے فوائد و خواص پر بحث کرتے ہوئے رائے ظاہر کی کہ مدرسہ کی عمارت میں اچھے روشن دان ہونے چاہئیں تاکہ صاف ہوا داخل اور خراب ہوا خارج ہوتی رہے۔ اس کے بعد آپ نے بیان کیا کہ زندگی کے برقرار رکھنے کے لئے پانی کی جیسی کچھ ضرورت ہے وہ ظاہر ہے۔ ہمکو شہر میں صاف کیا ہوا پانی میسر آسکتا ہے، لیکن دیہات میں صاف پانی جو مضر اجزا سے پاک ہو بہت کم دستیاب ہوسکتا ہے ایسے مقامات پر پانی کو صاف کرکے استعمال کرنا چاہئے۔ مدرسہ کے محل وقوع کے متعلق بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ مدرسہ کی عمارت ایسے مقام پر ہرگز تعمیر نہ کی جائے جہاں کہ کھیلے یا دو دو خانے ہوں کیونکہ خوق اور غلاظت کے سڑنے سے مختلف امراض کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی خیال ظاہر فرمایا کہ بچوں کو بیٹھنے کے لئے کافی جگہ ملنی چاہئے۔ کیونکہ قریب قریب بیٹھنے سے ایک بچے کے مرض کا اثر دوسرے بچے پر ہوتا ہے اگر کوئی بچہ مرض متعدی میں مبتلا ہو تو اس کے صحتیاب ہونے تک رخصت دیدینی چاہئے تاکہ اس کے مدرسہ آنے کی وجہ سے دوسرے بچے متاثر نہ ہوں۔ آپ نے کہا کہ دانتوں اور مسوڑوں کی خرابی سے بھی اکثر امراض پیدا ہوتے ہیں۔ دانتوں کی صفائی کا خاص طور پر

لحاظ رکھا جائے ورنہ مضر مادے پیٹ میں داخل ہو کر مختلف امراض پیدا کریں گے قدیم طرز کے پخانے اور پیشاب خانے ایسی حالت میں ہوتے ہیں کہ ان سے اکثر امراض پیدا ہوتے ہیں۔ اگر موجودہ ترقی یافتہ طریقے پر پائخانے اور پیشاب خانے تیار ہو جائیں تو اکثر امراض کا سدباب ہو سکتا ہے۔

غذا پر بحث کرتے ہوئے آپ نے بیان کیا کہ گوشت کا امتحان کیا جانا چاہئے کہ آیا وہ تازہ ہے یا باسی گھی کے ڈبوں کا بھی امتحان ہونا چاہئے۔ کہ اس میں کوئی جانور مر کر سڑ تو نہیں گیا ہے۔ ان اغراض سے محکمہ صفائی قائم ہے۔ مگر ان امور کی طرف پوری طرح توجہ نہیں کیجا رہی ہے اساتذہ بھی مدد کریں تو امراض کا قلع قمع ہو سکتا ہے۔ آپ نے ایسی غذاؤں کے استعمال کا مشورہ دیا جن میں کیلسیم کی مقدار زیادہ ہو۔ اپنے اس بیان کی توضیح کی غرض سے آپ نے میووں اور دودھ کے استعمال پر زور دیا۔

مدارس میں پانی کا جو انتظام ہے اس کو قابل اصلاح ٹھیرا کر ان امور کی جانب توجہ دلائی۔ گھڑوں میں روزانہ صاف پانی نہیں بھرا جاتا ہے۔ گھڑے پر کوئی چیز ڈھانکی نہیں جاتی ہے ایک ہی گلاس سے سب پانی پیتے ہیں۔

آپ نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ مدارس میں لڑکوں کی عمر اور قد کے لحاظ سے فرنیچر مہیا نہیں کیا جاتا ہے اس لئے بچے قبل از وقت کبڑے ہو جاتے ہیں۔

آپ نے اساتذہ کو یہ مشورہ دیا کہ بچوں کو بالکل جھک کر یا اکڑ کر بیٹھنے نہ دیا جائے بلکہ ان کو قدرتی طریقے پر بٹھایا جائے۔

آخر میں آپ نے اساتذہ سے یہ توقع ظاہر کی کہ وہ آیندہ نسل کو صحت مند بنائینگے

مہر کے جلسہ میں مولوی محمد سلطان صاحب نے بچوں میں قیادت کے موضوع پر مبسوط تقریر فرمائی۔ تین مختلف جلسوں میں غبی بچوں کی شناخت اور اس کے اسباب کے متعلق بحث ہوئی اور اس امر پر بھی روشنی ڈالی گئی کہ ایسے بچوں کے لئے موجودہ مدارس میں کیا انتظام ہونا چاہئے۔ ان مباحث میں مولوی محمد سلطان صاحب اور مولوی نور الحسن صاحب نے نمایاں حصہ لیا۔ موخر الذکر صاحب نے اپنی تقریر بڑی مہربانی سے سپرد قلم فرما کر ہمکو عنایت فرمائی ہے جسے ہم نے مستقل مضمون کی حیثیت سے اس اشاعت میں شایع کیا ہے۔

شاخ گرامر اسکول سہ ماہی اول ۱۳۴۲ف میں دو جلسہ بصدارت مسٹر فلپ منعقد ہوئے
پہلے جلسے میں مستقر کے مدارس ثانویہ کے صدر مدرس اور چند مدرسین موجود تھے کنڈر
گارٹن پر مس ریڈ صدر معلمہ پرائمری ڈپارٹمنٹ مدرسہ عالیہ نے تقریر کی جس کا
اقتباس علٰحدہ شائع کیا جا رہا ہے مس موصوفہ نے نہایت دلچسپ نمونہ کا سبق دیا۔
مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعلیمات نے اس اہم سوال پر بحث کی
کہ کس عمر میں بچے کو مدرسہ بھیجنا چاہئے۔ صاحب موصوف کے خیال میں اس کا انحصار
گھر اور مقامی حالات پر منحصر ہے اگر گھر پر بچہ کی نگرانی اور تربیت باحسن الوجوہ ہوسکتی
ہے تو چھوٹے بچوں کے لئے گھر مدرسہ سے بہتر تعلیم گاہ ہوسکتا ہے لیکن عام طور پر گھروں
میں عمدہ تعلیم و تربیت ممکن نہیں ہے خصوصاً جبکہ ماں تعلیم یافتہ نہ ہو ایسی حالت
میں بچہ کو کنڈرگارٹن میں شریک کرنا مفید ہے اب رہا مقامی حالات تو دیہات
میں جہاں بچوں کو کھلی ہوا میں آزادی سے پھرنے اور مطالعہ قدرت کا کافی موقع ملتا ہے
وہاں کنڈرگارٹن کی اتنی ضرورت نہیں رہتی ہے۔ آخر میں مقرر صاحب نے یہ بتایا کہ کنڈر
گارٹن کے لئے قیمتی سامان کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ بہت کچھ سامان خود مدرس تیار
کرسکتا ہے۔

مولوی شیخ ابو الحسن صاحب صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ دار العلوم نے اپنے
مدرسہ کے کنڈرگارٹن کا انتظام بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہاں بہت کچھ سامان
مدرسین نے تیار کیا ہے۔

دوسرے جلسہ میں سست ذہن (BACKWARD) بچوں کی تعلیم پر مس ڈوکی
مددگارہ گرامر اسکول نے ایک نہایت دلچسپ تقریر کی۔
سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعلیمات بھی موجود تھے صاحب موصوف نے
اس موضوع پر تقریر کرتے ہوئے بیان کیا کہ اکثر مدرسین MENTAL TESTS
سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ان کے ذریعہ سے سست ذہن طلبہ کی شناخت نہیں
کرسکتے لیکن اگر مدرس میں ہمدردی ہو تو اس کے لئے یہ کوئی مشکل امر نہیں ہے افسوس
ہے کہ عام طور پر مدرسین اپنی سہولت کے لحاظ سے تیز ذہن لڑکوں کی جانب زیادہ
اور سست ذہن بچوں کی طرف کم توجہ کرتے ہیں۔ آخر میں صاحب موصوف نے جرمنی کی

مثال دیتے ہوئے کہا کہ سست ذہنی کم سنی ہیں معلوم کرنا چاہئے۔

ایک اور رکن نے یہ رائے ظاہر کی کہ ڈالٹن پلان کا طریقہ سست ذہن بچوں کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگا کیونکہ اس سے طلبہ کو انفرادی طور پر تعلیم دیتے ہیں۔ بڑی مدد ملتی ہے۔

مس دلبسٹر صدر معلمہ شلٹ ابتدائی گرامر اسکول نے مذکورہ بالا رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ سست ذہنی ابتدائی مدارج میں معلوم کرنا چاہئے۔ اور سست ذہن بچوں کو جلد سے جلد ان کے دوسرے ہم عمر طلبہ کے معیار پر آنے کی کوشش کرنی چاہئے ڈالٹن پلان ابتدائی مدارج کے لئے زیادہ مفید نہیں ہے۔

جلسہ مرکزی انتظامی کمیٹی مرکزی انتظامی کمیٹی انجمن اساتذہ کا ایک جلسہ ۱۷ آذر ۱۳۴۲ ف دفتر صدر مہتمم تعلیمات بلدہ میں زیر صدارت ایف سی فلپ نائب صدر انجمن ہذا منعقد ہوا جس میں (۱۶) اصحاب تشریف فرما تھے۔

۱۔ ماہانہ جلسہ ہائے انجمن کے متعلق حسب ذیل مضامین مقرر ہوئے۔

الف۔ مدارس ابتدائی چھ سال سے کم عمر کے طلبہ کے لئے کیا انتظامات کرنے کی ضرورت ہے۔

ب۔ کمزور طلبا اور ان کی کمزوری کے اسباب دریافت کرنا۔

۲۔ یہ تصفیہ ہوا کہ کم از کم ایک نمایندہ کو انجمن ہذا کی جانب سے آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرز اسوسی ایشن کی آیندہ سالانہ کانفرنس میں جو بمقام لاہور منعقد ہوگی شرکت کے لئے روانہ کیا جائے۔

۳۔ کونسل آل انڈیا فیڈریشن سنہ ۱۹۳۳ء کے لئے حسب ذیل حضرات کو بطور نمایندہ منتخب کیا گیا۔

۱۔ جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب)

۲۔ " " شیخ ابوالحسن صاحب بی۔ اے۔ ایل ٹی۔

۳۔ ڈاکٹر کرشنیا صاحب۔ پی ایچ ڈی

۴۔ مسٹر چندر راو کر۔ ایم اے۔

۵۔ جناب سید محمد شریف صاحب مشہدی۔

۴ - حسب سابق ریورنڈ لطیف سی فلپ اور مولوی شیخ ابوالحسن صاحب انجمن ہذا کے نائب صدر منتخب ہوئے - اور مولوی محمد شریف صاحب مشہدی کا انتخاب حسب سابق معتمد عموی کی خدمت پر کیا گیا -

۵ - لائبریری انجمن اساتذہ کے قواعد جو لائبریری سب کمیٹی نے مرتب کئے تھے - پیش ہونے پر منظور کئے گئے -

مرکزی انتظامی کمیٹی انجمن اساتذہ کا دوسرا جلسہ بتاریخ ۷ ار بہمن ۱۳۴۲ ف بصدارت عالیجناب مولوی سید علی اکبر صاحب صدر انجمن ہذا دفتر صدر مہتممی تعلیمات بلدہ میں منعقد ہوا جسمیں گیارہ اراکین تشریف فرما تھے -

۱ - مولوی سید محمد شریف صاحب مشہدی کے زمانۂ رخصت میں معتمد عمومی انجمن اساتذہ کی خدمت کو انجام دینے کے لئے سید حسن الدین صاحب کا انتخاب کیا گیا -

۲ - مولوی سید محمد شریف صاحب مشہدی کے لئے مصارف شرکت کانفرنس مبلغ لہ ۱۵۰ سکہ کلدار کی منظوری دی گئی -

حسب ذیل اراکین کی ایک سب کمیٹی اس غرض کے لئے مقرر کیگئی کہ کنڈر گارٹن کے متعلق رپورٹ تیار کی جائے -

۱ - جناب مولوی سید علی اکبر صاحب — صدر
۲ - مس ولبسٹر -
۳ - " " ٹائلر
۴ - مسز گارڈن -
۵ - مولوی عبدالنور صاحب صدیقی — معتمد

اور یہ تصفیہ ہوا کہ دو سب کمیٹیاں پہاک ور ڈ طلبہ کے متعلق رپورٹ مرتب کرنے کے لئے مقرر کی جائیں - ایک سکندر آباد کے لئے اور دوسری حیدر آباد کے لئے -

ڈاکٹر کرشنیا صاحب کو سکندر آباد کی سب کمیٹی کا صدر منتخب کر کے ان سے درخواست کی گئی کہ وہ سکندر آباد کی سب کمیٹی کے لئے اراکین منتخب فرمائیں - اور حسب ذیل حضرات کا انتخاب حیدر آباد کی سب کمیٹی کے لئے عمل میں آیا -

۱۔ جناب مولوی سالم بن سعید صاحب   صدر
۲۔ ,, ,, فیض محمد صاحب
۳۔ ,, ,, نور الحسن صاحب۔
۴۔ ,, ,, فخر الحسن صاحب۔
۵۔ غلام دستگیر صاحب۔

دوسری سہ ماہی ۱۳۴۲ف کے لئے حسب ذیل مضامین مقرر کئے گئے۔

۱۔ کمسن طلبہ کی تعلیم میں کھیل کی قدر و قیمت خصوصاً کنڈرگارٹن کے اصول کا لحاظ کرتے ہوئے۔

۲۔ ہوم ورک (سست ذہن) طلبہ کا لحاظ کرتے ہوئے۔

۳۔ تعلیم کنڈرگارٹن کا سازوسامان۔

روئداد جلسہ سالانہ مدرسہ وسطانیہ کوہیر شریف ضلع بیدر حسب عملدرآمد قدیم مدرسہ وسطانیہ کا جلسہ سالانہ زیر صدارت جناب مولوی سید معین الدین صاحب مہتمم تعلیمات ضلع بیدر بتاریخ ۱۷؍ آذر ۱۳۴۲ف منعقد ہوا جس میں شرکاء کی تعداد تقریباً چھ سو کے علاوہ جناب تحصیلدار صاحب تعلقہ بیدر و معززین و ساہوکار قصبہ و اساتذہ مدارس مواضعات گرجواڑہ۔ دگوال کوہلی۔ مچلہ۔ دکنوارم وغیرہ بھی مدعو و شریک تھے۔

جلسہ کا نظام العمل ۱۴؍ آذر سے مقرر تھا چنانچہ پہلے روز ہاکی میاچ دوسرے روز فٹ بال اور تیسرے روز کرکٹ میاچ ہوا۔ اس کے بعد ۱۷؍ آذر ۱۳۴۲ف کو ۱۰ بجے سے اسپورٹس ہوتے رہے اور ۴ ساعت شام سے جلسہ تقاریر و تقسیم انعامات شروع ہوا۔

جلسہ کی ابتدا مولوی محبوب خانصاحب مدرس مدرسہ (گرجواڑہ) نے آیات

متبرکہ قرآنی کی تجوید تلاوت سے کی اور مولوی عبدالقیوم صاحب مولوی فاضل و منشی فاضل صدر مدرس مدرسہ کی تحریک و مسٹر راد ہاکشن کی تائید پر جناب معین الدین صاحب بی یس۔ سی کرسی صدارت کو رونق بخشی۔

جناب صدر نے اولاً اسٹاف مدرسہ کی جانب سے مدرسہ ہذا کے تعلیمی ممتاز و نیز اسپورٹس میں گوے سبقت برندہ طلبہ کو تقریباً پچاس انعامات تقسیم کئے اور پھر معتمد انجمن اساتذۂ مدرسہ نے مدرسہ کی مبسوط رپورٹ سنائی۔

بعد ازاں مسٹر رادھاکشن بی اے اول مددگار نے علم جغرافیہ کی وسعت پر ایک پرمغز تقریر کرتے ہوے معاشی وسیاسی حیثیت سے تعلیم جغرافیہ کی ضرورت و اہمیت کو بتلایا پھر مسٹر رانگواچاری مددگار مدرسہ نے بزبان انگریزی تعلیم سائنس کی ضرورت پر نہایت مدلل و مبرہن تقریر کی ان کے بعد مسٹر نرسہوال چاری مددگار مدرسہ نے ملنگی زبان میں بعنوان (تعلیم کا اثر اخلاق پر) عام فہم تقریر کی۔

اس کے بعد بروئے نظام العمل طلبہ کی تقاریر مقرر تھیں مگر مغرب ہو جانے کے باعث ان کو ملتوی کر دیا گیا۔ اور جناب صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں مدرسہ کی اپنی ساعی میں کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے اسٹاف کے اتحاد عمل کی ستائش کی اور اسی سلسلہ میں اہل قصبہ کو مدرسہ کے متعلق ان کے فرائض اور تعلیمی تحریکات سے مزید دلچسپی کی اپیل کی

تقسیم انعامات تحتانیہ قصبہ ڈار ہونہ تعلقہ احمد پور ضلع بیدر

بتاریخ ۱۹ بہمن ۴۲ف مدرسہ ہذا کا جلسہ تعلیمی و تقسیم انعامات بوقت ۳½ بجے شام زیر صدارت عالیجناب مولوی سید تمکین الدین صاحب بی یس۔ سی۔ بی ٹی مہتمم تعلیمات ضلع بیدر شریف منعقد ہوا۔ میدان بازی گاہ میں ٹین شیڈ۔ (تیار کر کے) رنگ برنگ کی بیرقوں سے نہایت آراستہ کیا گیا تھا جناب دیسکھ صاحب و مولوی عبدالوہاب صاحب منصبدار و جناب منتظم صاحب پولس معہ عملہ و وکلاء و معززین و ساہو و اولیاء و شار طلباء و صدر مدرس صاحبان و اساتذہ صاحبان مدارس ہڈولتی۔ چاپولی۔ ہیڈرگلی۔ کمنہ۔ گھرسور۔ نلگیر نے اپنی شرکت سے جلسہ کی رونق کو دوبالا فرمایا۔ جلسہ کا آغاز قرارت و قومی ترانہ سے ہوا۔ جناب دیسکھ صاحب کی تحریک صدارت و مولوی محمد عبدالحمید صاحب صدر مدرس کی تائید سے عالیجناب مہتمم صاحب کرسی صدارت پر رونق افروز ہوے۔ مولوی محمد عبدالحمید صاحب کوہیری صدر مدرس مدرسہ ہذا نے

رپورٹ مدرسہ ثانی۔ طلبار نے خانگی وسرکاری تعلیم۔ دیہاتی وشہری زندگی۔ دولت
اور وقت وچوری پر اردو ومرہٹی وانگریزی میں مکالمات کئے۔ ونیز مہابھارت
کا ایک مختصر ڈراما کیا گیا۔ جس سے حاضرین بہت محفوظ ہوئے لڑکوں نے انگریزی و
مرہٹی نظمیں بھی نظمیں بھی سنائیں۔ جناب دلسکھ صاحب نے مدرسہ کی ترقی و مولوی محمد عبدالحمید
صاحب کو میری کی کوشش و تعلیمی دلچسپی کا اظہار فرماتے ہوئے مدرسہ کی ہرطرح امداد
واعانت کا وعدہ کیا۔ اور فی الحال (عـــہ) روپیہ کے سلیٹ وکتب نادار طلبا کیلئے
عطا فرماکر اپنی تعلیمی دلچسپی کا ثبوت دیا۔ مولوی محمد عبدالوہاب صاحب منصبدار نے
مولوی محمد عبدالحمید صاحب کو میری صدر مدرس اور ان کے مددگار صاحبان کی انتھک
کوششوں کا اظہار فرماتے ہوئے منجانب رعایا استدعا پیش کی کہ حالیہ صدر مدرس صاحب
کی کوشش و دلچسپی سے جماعت پنجم قائم ہوگئی ہے۔ مدرسہ نے ہر حیثیت سے نمایاں ترقی
کیا آئیندہ مدرسہ کو مڈل اسکول کا گریڈ عطا فرمایا جائے یا کم از کم جماعت ششم کے افتتاح
کی اجازت عطا ہو۔ ونیز موصوف نے انسان کو "تعلیم کی ضرورت" کے عنوان پر ایک
فاضلانہ مضمون پڑھ کر حاضرین کو اپنے زرین خیالات سے مستفیض اور مبلغ (ے) کے
گرانبہا عطیہ سے نادار طلبہ کو کتب سے مستفید فرمایا۔ مولوی محمد زکا اللہ صاحب مسیحا
حیدرآبادی نے ایک مدحیہ قصیدہ سنایا۔ اس کے بعد عالیجناب صدر نشین صاحب نے
اپنے دست مبارک سے کتب انعامی تقسیم فرماکر علم کی ضرورت پر ایک بسیط ومعنی خیز
تقریر فرمائی اور حاضرین کو کئی تمثیلات کے ذریعہ حصول علم کی ترغیب وتحریص دلائی
اور یہ بتلایا کہ ہماری فیاض گورنمنٹ دوسری حکومتوں کے مقابلہ میں کس قدر روپیہ
صرف کر رہی ہے رعایائے وطلبار وشار سے مخاطب ہو کر تعلیمی سہولت بہم پہنچانیکا
وعدہ فرمایا۔ مابعد جناب صدر مدرس صاحب مدرسہ ہذا نے عالیجناب صدر نشین صاحب
وحاضرین کی شرکت جلسہ وجناب دلسکھ صاحب ومنصبدار صاحب کے عطیہ کا شکریہ ادا کیا
اعلیحضرت بندگانعالی مدظلہ العالی وشہزادگان بلند اقبال کی دعا کے ساتھ ½ ۵ بجے
شام جلسہ برخاست ہوا۔

مدرسہ تحتانیہ قصبہ مرداگدہ مدرسہ ہذا کا سالانہ تعلیمی جلسہ بتاریخ ۱۴ اردی ۱۳۴۲ ف زیر صدارت
عالیجناب مولوی کریم احمد خانصاحب بی اے۔ یم۔ بی۔ مہتمم تعلیمات

ضلع گلبرگہ شریف بعد ختم معائنہ مدرسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں معززین قصبہ ہذا نیز اطراف و اکناف کے مدرسین اور دو تین مواضعات کے با اثر حضرات شریک تھے بعد ختم قرأت و حمد باری تعالیٰ صدر مدرس مدرسہ نے روئداد مدرسہ پڑھی اس کے بعد ناگیا وجیرام ونارائن و محمد سالم وکھوباجی ونرسیا و محمد حسین وبُٹل وبالا رام وغیرہ نے شراب کی قبائح و مذمت میں ایک ڈرامہ نہایت عمدگی سے بلا رعب طلبہ ادا کر کے ایک اچھا اثر حاضرین کے دلوں پر پیدا کیا اور نارائن وجیرام وکھوباجی دبند پائے مناظرہ علم و دولت کو خوش اسلوبی سے ادا کر کے دو تین دفعہ چیرز لئے۔ بعد ازاں نرسیا و ماسٹر یا و سائیا طالب علموں نے تجارت و زراعت و علم پر بزبان تلنگی نہایت عذب بیانی سے مکالمہ کر کے حاضرین کو محظوظ کیا۔ اس کے بعد کچھ انعامی کتب نیز سامان نوشت و خواند معطیہ صدر مدرس مدرسہ ہذا جملہ (۵۵) انعامات کو صدر ذی حشم نے اپنے دست مبارک سے تقسیم فرما کر جملہ طلبا کی حوصلہ افزائی فرمائی آخر میں حاضرین جلسہ کی عطر و پان سے تواضع کیگئی۔ اور بعد ملاحظہ نمایش "جو طلبا، مدرسہ ہذا کی دستکاری و صناعی و جانکاہ کوشش کا نتیجہ تھا۔ جلسہ برخاست ہوا۔

تحتانیہ دھولپیٹھ مدرسۂ ہذا کے طلبہ جماعتہائے چہارم و سوم حسب اجازت جناب صدر مہتمم صاحب تعلیمات بلدہ بتاریخ (۲۰) شہریور ۱۳۴۱ف مع اسٹاف مدرسہ تعلیمی تفریح کی غرض سے قلعہ گولکنڈہ و مقابر سلاطین قطب شاہی ٹھیک (۶) بجے مدرسہ سے معمولی سواریوں میں روانہ ہوئے۔

تیز رفتار سواریوں کا انتظام اس وجہ سے نہیں کیا گیا کہ قدرتی مناظر اور عام کیفیات کی دیکھ بھال کا موقع جس قدر معمولی سواریوں میں نصیب ہوتا ہے وہ ہرگز ہرگز تیز رفتار سواریوں میں نہیں نصیب ہوتا۔

طلبہ کے اصرار پر سب سے پہلے مقابر سلاطین قطب شاہی پہونچے طلبہ کے لئے اس سے تفریح کا مقام اس گرد و نواح میں کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا بہر حال ان شاہان سلف کے مقبروں کو فرداً فرداً بتلایا گیا بالخصوص ان کی تاریخ ولادت اور تخت نشینی اور سنہ وفات وغیرہ کو بھی بتلایا گیا۔ اس معائنہ کے بعد طلبا کو اس کیفیت کی جانب رجوع کیا گیا۔ کہ یہ وہ سلاطین سلف ہیں جو آج سے تقریباً تین سو برس

قبل اس سرزمین پر برسر حکومت تھے جن کے اقتدار اور حکومت کا شاہد تاریخ کا ہر ورق ہے۔

چار مینار اور مکہ مسجد وغیرہ وغیرہ جن کی یادگار ہیں۔ آج کس بیکسی کی حالت میں اس مقام پر دفن ہیں۔ جہاں تم اور ہم کھڑے ہوے ہیں۔ اس سبق کو بالخصوص طلبہ کے چند ایسے سوالات سے زیادہ اہمیت ہوگئی ہے کہ کیا ہر ذی اقتدار کے مرنے کے بعد یہی عمل ہوتا ہے؟ باوجود اس کے کہ بادشاہ وقت تھے لیکن آج ان کے قبروں پر ایک شخص تک نظر نہیں آتا بجز اس کے کہ چند ملازمین اس مقام کی نگرانی کے لئے مقرر ہیں۔

وقت کے لحاظ سے سب سے اول بادشاہ سلطان قلی قطب شاہ کے مقبرہ کے پاس بعد فاتحہ ترانہ دکن پڑھا گیا۔ اس موقع پر مولوی محمد رسول صاحب مددگار مدرسۂ ہذا نے طلبہ کو ان شاہان سلف کے حالات اور ان کے زندگی کے کارنامہ کو سلسلہ وار بطور سبق مختصر اور جامع لفظوں میں تفہیم کرایا۔

اسٹاف مدرسہ نے بچوں کے کھانے وغیرہ کے انتظام میں خاص دلچسپی لی تھی اور نہایت سلیقہ سے دو پارٹیاں کرکے ہندو اور مسلمان کے الگ الگ دسترخوان بچھوائے گئے اور طلبہ مدرسین نے ملکر کھانا کھایا اور اس کے بعد چائے نوشی ہوئی۔

تقریباً (۵) بجے گنبدوں سے قلعہ گولکنڈہ روانہ ہوے طلبہ کو قلعہ بتلایا گیا اور بالاحصار پر پہونچکر اس مقام کی خصوصیت اور ابوالحسن تاناشاہ کے تمام حالات اور قلعہ گولکنڈہ کی فتح وغیرہ کی نسبت مجملاً تبلائی گئی اس مقام پر ترانہ دکن پڑھوا کر اعلیحضرت بندگانعالی خلد اللہ ملکہ کے لئے (۳) چیرز دلوائے گئے وہاں سے نہایت آرام اور اطمینان کے ساتھ طلبہ کو ان کے مکانات پر پہنچا دیا گیا۔

اس تعلیمی تفریح سے طلبہ کو جسقدر مسرت اور ان کے معلومات میں اضافہ اور دلچسپی ہوی وہ ان کی زندگی کا پہلا موقع تھا اور ایسی تعلیمی تفریح طلبہ کے لئے بیحد مفید ثابت ہوی۔

رویداد سالانہ قصبہ پنجرو تعلقہ کلنگور ضلع بیدر

مدرسہ تحتانیہ قصبۂ پنجرو میں ۲۷ شہریور ۱۳۴۱ف بوقت ۴ ساعت شام بصدارت مولوی محمد عبدالعزیز خاں صاحب نائب مددگار ناظم

سررشتہ انجمن امداد باہمی منعقد کیا گیا تھا۔ پبلک قصبہ و طالب علموں کا ایک کثیر مجمع تھا جلسہ کا افتتاح پہلے حمد سے کیا گیا جس کو حیات خاں طالب علم جماعت چہارم نے خوش الحانی سے ایک دل افروز نظم سنائی۔ اس کے بعد مسٹر سدانندم مددگار مدرسۂ ہذا نے ایک نمونہ کا سبق تمام پبلک کے سامنے دیا جو بہر حیثیت کامیاب رہا اس کے بعد مولوی شرف الدین صاحب مددگار نے علم اور اس کے فوائد پر تقریر کی جو دلچسپ رہی۔ اسکے بعد میر محی الدین علی طالب علم اور اس کے فوائد پر تقریر کی جو دلچسپ رہی۔ اس کے بعد میر محی الدین علی صاحب طالب علم جماعت چہارم نے سچائی پر ایک مضمون پڑھا۔ اور خوب پڑھا۔ پھر سدانندم صاحب نے تلنگی زبان میں تعلیم کی ضرورت بتلاتے ہوئے خانگی و سرکاری تعلیم کے فرق کو واضح کیا۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ انکی تقریر بہ ہر طریق کامیاب رہی اس کے بعد مولوی سید عبدالعزیز صاحب صدر مدرس مدرسہ ہذا نے مدرسہ کی مختصر تاریخ یک سالہ رپورٹ سنائی۔ او ضمنی طور پر پبلک کی ان ذمہ داریوں کو بھی واضح کیا جو لڑکوں کی تعلیم کے متعلق ان پر عائد ہوتی ہیں آخر میں چندہ کی تحریک پیش کرتے ہوئے اعلیحضرت بندگانعالی کی درازی عمر و اقبال کی دعا پر ختم کی اس کے بعد صدر صاحب نے اپنی پر مغز تقریر سنائی۔ جناب صدر مدرس صاحب مدرسہ نے تقریر فرماتے ہوئے تعلیم و تربیت کی ضرورت کو واضح فرمایا۔ اور خود بھی حضور پرنور کے حق میں دعائے خیر فرماتے ہوئے۔ اپنے گران قدر چندہ کا بھی اعلان فرمایا۔

اس کے بعد ہندوؤں و مسلمانوں کی چار نوشی کے لئے علحدہ علحدہ کمرے جو مقرر کئے گئے تھے۔ اس میں یہ سب منتقل ہوگئے اور نہایت اطمینان کے ساتھ ان دونوں فریق نے چاء نوش فرمائی۔ غرض حاضرین کی چاء پان سے تواضع کرنے کے بعد سکوں کے ساتھ سر مغرب یہ مجمع منتشر ہوا۔

اقتباسات

لڑکوں کا سلسلہ انجمن اساتذہ شاخ چادر گھاٹ کی سرپرستی میتھوڈسٹ بوائز ہائی اسکول کے ہال میں مسٹر ٹریسی اسٹرانگ نے نہایت دلچسپ تقریر فرمائی تھی۔ مسٹر ٹریسی انجمن نوجوانان مسیحی کے ممبر ہیں جو بین الاقوامی کمیٹی برائے کار اطفال میں بمقام جنیوا قابل قدر کام کر رہے ہیں صاحب موصوف کو دنیا کے اکثر ممالک کی سیر و سیاحت کا اتفاق ہوا اس لئے وہ مختلف اقطائے عالم کے بچوں کی ضروریات اور انکے مسائل سے کما حقہٗ واقف ہیں اس لئے موصوف کے خیالات خصوصاً ایسے زمانہ میں جبکہ بقول صدر جلسہ مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے صدر مہتمم تعلیمات بلدہ ہر طرف یہ غل ہے کہ بچے کے قوائے ذہنیہ کو چھوڑ دو اور ذاتی سعی اور اظہار ذاتی کے ذریعہ نشو و نما پانے دو" بیحد مفید اور مشعل راہ ثابت ہونگے ہم ذیل میں صاحب موصوف کی فاضلانہ تقریر کا اقتباس ہدیہ قارئین کرتے ہیں۔

"بعض مسائل دنیا بھر کے نوجوانوں میں مشترک ہیں۔ انجمن نوجوانان مسیحی اور تحریک کشافہ ان میں سے بعض مسائل کی عقدہ کشائی کر رہی ہے اور بین الاقوامی امن و آشتی کی ترقی میں کوشاں ہے جدید تعلیمی طریقہ اظہار خیال کی ترغیب و تحریص کرتے ہیں۔ ان کا آلہ کار یا تو کھیل اور تعلیمی سیر و سیاحت ہوتی ہے یا تحریک کشافہ جو انتہائی سرعت کیساتھ ساری دنیا میں پھیل گئی ہے۔ اور تعمیر کردار، خدمت خلائق، اور اظہار خیال کا موقعہ بہم پہونچاتی ہے۔ یہ چیزیں نصاب مدرسہ میں عنقا ہیں۔

اساتذہ کے ذمہ ایک نہایت اہم فرض ہے یعنے ان کا کام نوجوانوں کے کردار کو استوار کرنا ہے اور اگر وہ اپنے موقعوں سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ تو ان کو اس معاملہ میں وہ اثر حاصل ہے جو بڑے بڑے غیر مدرسی تنظیمات کو حاصل نہیں۔ یہ فی الجملہ درست ہے کہ فی زمانہ نوجوانوں کو اپنا مستقبل کچھ امید افزا نہیں نظر آتا انکو معلوم ہے کہ بیکاری اکثر نوجوانوں کے حصہ میں آئی ہے، ملازمت کی بے اطمینانی چند خوش قسمت لوگوں کی کامرانی اور یہ احساس کہ زندگی کے فرائض کی انجام دہی کیلئے مدرسہ کی تعلیم کچھ زیادہ کار آمد نہیں یہ سب باتیں بحران کو مستقبل کی طرف سے مایوس اور تحصیل علم سے لا پرواہ کر دیتی ہیں۔ اس لئے نوجوانوں نے اپنے جتھے بنا لئے ہیں۔ تاکہ وہ آزادی یا کسی نہ کسی شکل میں جوہر دکھانے کا موقعہ حاصل کر سکیں خواہ وہ قومیت یعنی حب الوطنی اور مفاد ملکی کے لئے ایثار نفس ہو، خواہ اشتراکیت (یعنی جماعت اور جماعتی اتحاد) ہو۔ اگر ان منصوبوں کو کچلا جائے تو یہ پوشیدہ طور سے پھیلتے ہیں، اور امن عامہ کیلئے باعث خطر ہوتے ہیں۔ البتہ اگر ان کے ساتھ ہمدردی کیگئی تو آفت ٹل جاتی ہے۔ جاپان خطرناک خیالات یا اشتراکیت کو دباتا ہے، اور مدارس میں سیاست پر مباحثہ کی ممانعت کرتا ہے لیکن طالب علم کہیں نہ کہیں سے خیالات معلوم کر لیتے ہیں اور

اور مارکسی یا فاسسٹی۔

ہو جاتے ہیں۔ امریکہ میں اختلاف آراء پر آزادی سے بحث و مباحثہ کی اجازت ہے کیونکہ اگر کسی شخص کی رائے کا احترام کیا جائے تو وہ بھی دوسروں کی رائے کی توقیر کرے گا یہ طریقہ ان خفیہ تنظیموں کو تسخیر کرنے کا جو جاپان اور دوسرے ملکوں میں امن عامہ کیلئے حقیقی خطرہ ہو رہی ہیں۔ یہ کیسی بدبختی ہے کہ بچوں کو وطن پرستی کے نام سے دوسری قوموں سے تعصب کرنا سکھایا جاتا ہے اس قسم کی تعلیم کا اندوہ ناک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بسا اوقات ایک ملک کے بچے دوسرے ملک کے بچوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اس احساس کا علاج یہ ہے کہ آزادی اور بے باکی کے ساتھ مباحثہ ہو لیکن فریقین ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کریں۔ مباحثوں میں ایک فریق کی شکست پیش افتادہ بات ہے لیکن جب دوستانہ مباحثہ ہو تو کسی فریق کی بھی شکست نہیں ہوتی۔ اختلاف رائے آزادی کے ساتھ ظاہر ہو سکتا ہے بغیر اس کوشش کے کہ دوسروں کو زبردستی اپنا ہم خیال بنائیں۔ مباحثہ میں ہمیشہ یہ مدنظر ہونا چاہئے کہ اختلاف بالحرمتہ ہو اس سے اگر دوستداری نہیں تو کم از کم رواداری تو ضرور نشو و نما پائیگی۔"

چھ سال سے کم عمر کا بچہ صحت تعلیم

ذیل میں ہم اس دلچسپ و سبق آموز تقریر کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں جو مسٹر ڈی صدر شاخ پرائمری مدرسہ عالیہ نے انجمن اساتذہ بلدہ شاخ چادرگھاٹ کے ایک جلسہ میں اساتذہ کرام کے ایک بڑے مجمع کے سامنے فرمائی تھی اس پر مغز تقریر میں چھوٹے بچوں کی نفسیات اور اس کی نگہداشت پر کافی وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے ہمیں کامل یقین ہے کہ یہ لکچر ان اساتذہ کے لئے بہت فائدہ مند ہو گا۔ جو ان معصوم ہستیوں کی تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ چھ سال سے کم عمر بچہ کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے یہ ننھے بچے اتنے کم سن ہیں کہ یہ معمولی مدرسہ کا کام پابندی کے ساتھ نہیں کر سکتے تھوڑی دیر کے لئے بھی ان کو خاموش بٹھانا ان کی صحت کیلئے سخت مضر ہے نیز ان کو کتابی تعلیم بھی نہ دینی چاہئے کیونکہ اس عمر میں آنکھ کے چھوٹے جوارح پوری طور پر نشو و نما نہیں پاتے اس لئے آنکھوں پر زیادہ بار ڈالنا مناسب نہیں۔ اکثر حضرات اعتراف کریں گے کہ اگر اس کا احساس ہو چلے کہ مدرسہ میں کم سن بچہ کی زندگی کے ابتدائی سال کس قدر اہم ہیں تو اس سے قوم کی صحت اور جسمانی ساخت کو بہت کچھ فائدہ پہنچنے کی توقع ہے۔

یہیں سے کنڈرگارٹن کی ابتدا ہوتی ہے بچہ کی زندگی کے یہ ابتدائی سال جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا بہت اہم ہیں۔ یہ یا تو اس کی زندگی کو سدھار دیتے ہیں یا اس کو بگاڑنے کا موجب بنتے ہیں۔

اس لئے اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ اس کے کام اور اس کے کھیل کے موقعہ پر نہایت احتیاط سے نگرانی

رکھی جائے۔ اس منزل پر اس کی تعلیم میں چال چلن اور خصائل کی تربیت خاص اہمیت رکھتی ہے کنڈر گارٹن کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ بچہ کو طرز ماندو بود دکھائے۔ فروبل کے قول کے بموجب سچی تعلیم زندگی ہی ہے۔ سب سے چھوٹے ہندوستانی بچے اس قدر جلد بڑھ جاتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کی ایک منزل کو ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اور بچہ ہونے سے پہلے ہی بڑے ہو جاتے ہیں۔ کنڈر گارٹن ایسے بچوں کو بچہ ہونے کا احساس کراتا اور ان کو کھیلنا بھی سکھاتا ہے۔

کھیل کے ذریعہ بچے کے حواس نشو نما پاتے ہیں۔ اور ان میں استعداد بھی پیدا ہوتی ہے "مانٹیسوری" نے قوت لامسہ قوت باصرہ اور قوت سامعہ کو ترقی دینے کے لئے تربیت حواس کے آلات کے ذریعہ بہت کچھ احسان کیا ہے اگرچہ مانٹیسوری کا آلہ بہترین ہے پھر بھی تو فروبل کے تحفہ اور نہ ہی مان ٹیسوری کا آلہ تربیت حواس اس مقصد کیلئے کافی ہیں کنڈر گارٹن کے معلم کو خود اپنا آلہ اختراع کرنا چاہئے۔ بچہ تبدیلی چاہتا ہے۔ ہماری طرح وہ بھی روزانہ ایک ہی شئے کو کام میں لاتے لاتے اکتا جاتا ہے۔

بچہ کا پرواز خیال بلا کا ہوتا ہے۔ اور استاد اس کے قصہ گوئی کے خداداد وصف سے کام لے سکتا ہے اور اس طرح جماعت کے کمرہ کو جنگل یا پریوں کے محل میں جیسا کہ کہانی کے لحاظ سے ضرورت ہو بدل سکتا ہے ہر روز قصہ گوئی کے لئے خاص وقت مقرر ہونا چاہئے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اظہار خیال کا موقع دیا جانا چاہئے۔ ضروری ہے کہ بچہ یا تو کہانی کو تمثیل یا تصویر میں کھینچیں بعض اوقات وہ مٹی کے نمونے بھی بنا سکتے ہیں۔ اور کاغذ تراش سکتے ہیں کہانیوں کا انتخاب احتیاط سے کرنا چاہئے۔ چھوٹے بچوں کی زندگی میں تصاویر خاص اہمیت رکھتی ہیں بے لطف اسباق کی کتابوں کو ہفتوں تک رٹنے کی بہ نسبت بچہ صرف اپنی فرصت کے اوقات ہی میں تصاویر کو دیکھ کر بہت کچھ سیکھ جاتا ہے تعلیمی استعمال کے لئے تصاویر سادہ، واضح اور خوبی سے رنگی ہوئی ہونی چاہئیں وہ اصل کے مانند ہونی چاہئیں ورنہ بچہ کو غلط تصور پیدا ہوگا جس کی اصلاح آئندہ بہت ہی مشکل ہوگی۔

ترنم بھی کنڈر گارٹن کا اہم ترین جزو ہے ہر ایک بچہ کا طبعی میلان ترنم کی جانب ہوتا ہے۔ اور ہندوستانی بچوں کو خاص کر ترنم فطری طور پر حاصل ہے۔ بلاشک مدرسہ میں ایک پیانو اور ایک گراموفون کی موجودگی بہت بڑی چیز ہے لیکن وہ مدارس جو ان میں سے کسی ایک کو بھی حاصل نہیں کر سکتے ترنم کے ذریعہ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر بچے حقیقی طرز زندگی کے مطابق کھیلنے کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ اگر نمونہ کی دوکان یا گھر نمونہ کی ریل گاڑی یا موٹر کار کا حصول ممکن ہو تو بہت سے ایسے کھیلوں کو ترتیب دیا جا سکتا ہے جن میں کئی عملی مسائل شامل ہوں اور جن کو حل کرنے کے لئے خود بچہ کو بھی بہت کام کرنا پڑے۔ یہ بجائے خود ایک تعلیم ہے۔ آخر میں بچوں کو گفتگو کرنے کی ترغیب دینی چاہئے۔ کنڈر گارٹن ایک خوشی کا گھر ہونا

چاہیے جس میں استاد ایک مہربان لیکن موقعہ بہ موقعہ سبق دینے والے دوست کی طرح ہو ہندوستانی بچے مدرسہ میں بہت خاموش اور کم گو ہوتے ہیں شاید وہ اپنے استاد کی موجودگی سے خوف زدہ ہوتے ہیں اور غالباً یہ اس وجہ سے ہے کہ ان کا استاد خود ہی لکھتا ہے اور بچہ کو کچھ کہنے کا موقع نہیں دیتا ہے بچہ کام کرنے ہی سے سمجھ سکتا ہے نہ کہ سیکھنے سے کنڈر گارٹن کا کامیاب معلم وہی ہے جو معلم ہونے کے خیال کو محو کر سکے اور وہ جو بچہ کی سطح پر آ سکے اور بچہ ہی کے نقطۂ نظر سے زندگی کا مطالعہ کرے "

تعلیم ذریعہ گول میز کانفرنس کے زمانہ میں ہماری ریاست ابد مدت کے حالات پر مدبرین انگلستان کے بڑے مجمع میں جناب نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر نے جو فاضلانہ خطبہ دیا تھا اس کے اثنار میں ممدوح نے یہاں کی تعلیمی حالت پر بھی بخوبی روشنی ڈالی خصوصاً ذریعہ تعلیم کے متعلق نہایت پر لطف اور دلنشین طرز میں اظہار خیال فرمایا جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے ظاہر ہوگا۔

"میں اس وقت آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کی اولاد کی تعلیم بجائے ان کی اپنی زبان کے یا ایسی زبان کے جو ان سے قریب کا تعلق رکھتی ہے مثلاً لاطینی فرانسیسی یا جرمنی کے بالکل غیر زبان میں جیسے عربی اور چینی ہے دی جائے تو آپ کیا کہیں گے یہی وہ سوال ہے جس کے عمل پر آج ہندوستانی طلبار کی قسمت کا انحصار ہے اگر یہی طریقہ تعلیم آپ کے طلبار میں رائج کیا جائے تو آپ کیا فرمائیں گے؟ بلا شبہ تو ایک خاص تعداد خوش دماغ طلبار کی ہر جگہ ہوتی ہے جن کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ٹھیر سکتی اور ان کی ترقی میں حائل نہیں ہو سکتی لیکن ایک متوسط دماغی قابلیت کے طالب علم کا کیا حال ہوگا؟ نہ صرف وہ اپنے نصاب کے امتحان میں ناکامیاب ہوگا۔ بلکہ اس کا تمام زاویہ نگاہ منقلب ہو کر اس کی دماغی نمو ٹھس بن جائے گی اور تعلیم اس کے قوائے دماغی و اخلاقی کو اجاگر کرنے کی جگہ الٹے نتائج برآمد کریگی۔

آپ انگلستان میں بیٹھکر بہت کم اندازہ کر سکتے ہیں کہ کتنے لاتعداد طلبا ہندوستان میں مدرسہ اور جامعہ کی کٹھن منزل طے کرتے ہوئے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ناکام طلبار کی فیصد تعداد تشویشناک حد تک پہنچ گئی ہے۔

آپ نے یہاں پر مسٹر شاستری کے جیسے جادو بیان مقررین کی تقریریں سنیں جس سے شاید آپ کا یہ خیال ہوگا کہ انگریزی زبان میں ہندوستانی آسانی سے درک حاصل کر سکتے ہیں جن کی انگریزی آپ کے مداحیہ صحافت کا لطف و تفنن ہے میرے لئے یہ امر مذاق نہیں بلکہ ایک تلخ حقیقت ہے جس کو آپ بیٹھکر لطف اندوز نہیں ہو سکتے علاوہ ازیں ایسے طلبا بھی ہوتے ہیں جن کی افتاد طبیعت کسی خاص شعبہ علم کیلئے بہترین صلاحیت رکھتی ہے لیکن کسی زبان کا سیکھنا ان کی خداداد قابلیت سے باہر ہے۔ ایک ہونے والے اعلیٰ ریاضی دان کیلئے یہ ناممکن ہو سکتا ہے کہ وہ زبان کی دقتوں پر حاوی ہو۔ اگر ایسی صورت ہے تو اس کی ترقی کی کوئی راہ کھلی ہوئی نہیں

نہیں ہے بہ حیثیت ریاضی داں اس کی زندگی ختم ہو چکی اور شاید اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے دماغی پیداوار کو ناقابل تلافی نقصان پہونچا میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی صاحب فہم اس امر سے انکار کر سکتا ہے کہ ہندوستانی طلبا کو ہندوستانی زبان میں تعلیم دینے کے اصول کی حد تک ہم ٹھیک راستہ پر ہیں۔ اور میں اس سلسلہ میں چند ایسے استادہستیوں کا نام بتا سکتا ہوں جن کو ہمارے اصول سے پوری ہمدردی ہے سر آشوتوش مکرجی کا میں نام لوں گا جن کی یہ تمنا تھی کہ بنگالی زبان کو کلکتہ یونیورسٹی میں وہی حیثیت ملجائے جو اردو زبان کو حیدرآباد میں حاصل ہے۔ ابتدا میں ہم کو ان تمام دلائل سے دوچار ہونا پڑا جس کا بیان لارڈ میکالے کے "مشہور" (جس کو میں مہلک کے لفظ سے تعبیر کر سکتا ہوں) روئداد میں آیا ہے ہم سے کہا گیا کہ اس زبان میں نصابی کتب نا پید ہیں ایسا ادب موجود نہیں ہے جو جدید مضامین سے بحث کرتا ہو اور زبان میں وہ سکت نہیں ہے جس سے موجودہ خیال کا اظہار ہو سکے اس کا جواب ہم صرف یہی دے سکتے ہیں کہ جاپان نے ان مشکلات پر کامیابی حاصل کی اور ہم بھی ایسا ہی کر سکتے ہیں میں آپ سے دریافت کرونگا کہ کیا ازمنہ وسطہ کی انگریزی موجودہ ہندوستانی زبانوں سے زیادہ قوت اظہار رکھتی تھی؟ زبانیں نئے خیالات کی فضا میں سرعت کے ساتھ وسعت پذیری پیدا کر لیتی ہیں"۔ (ادحسن کار)

تعلیم نسواں کا مقصد

علیا حضرت شہزادی در شہوار خانم نے اپنے فاضلانہ مقالہ میں تعلیم نسواں کے مقصد کے متعلق جن پاکیزہ اور بیش بہا خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ ذیل میں اقتباساً درج کیے جاتے ہیں امید ہمیں امید ہے کہ اس بصیرانہ مشورہ پر عمل کر کے ہم کم از کم تعلیم نسواں کے معاملہ میں صحیح راستہ پر گامزن ہو سکیں گے

"اس میں کلام نہیں کہ علوم مشرقی کی یونیورسٹی سے علوم مشرقیہ کی سند حاصل کرنے کے بعد طالبات کیلئے سرکاری بی اے، ایم اے ہونے پر انکو تعلیمی رنگ اور شاید دیگر محکمہ جات میں بھی ممتاز عہدے اور معقول مشاہرہ نصیب ہو سکیں گے۔ لیکن یہ کہاں جائز ہے کہ لڑکوں کی تعلیم کے باب میں ہم جو غلطی کر چکے ہیں اس کا اعادہ تعلیم نسواں میں بھی کیا جائے اور عورتوں کی تعلیم کا مقصد بھی سرکاری ملازمت ہی قرار پائے۔ یہ واقعہ ہے کہ ملازمانہ ذہنیت کے تحت میں اکثر لوگ لڑکیوں کی تعلیم کا مقصد بھی سرکاری ملازمت ہی قرار دینا چاہتے ہیں اور چونکہ حصول ملازمت کے لئے سرکاری اسناد لازمی ہیں اسلئے تعلیم نسواں کا رخ یونیورسٹی کی طرز و نصاب تعلیم کیجانب پھیرنے کے خواہشمند ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو بعض طالبات مدرستہ النبات کے والدین کو سرکاری مدارس میں داخل کرنا پسند کریں لیکن کوئی دلیل نہیں ہو سکتی جب آزاد ذہنیت جو فطرت سلیمہ کا خاصہ ہے غالب آئیں گی تو یہ پست خیالی جاتی رہے گی۔

طالبات مدرستہ النبات کے دلوں میں سرکاری سندات کا خیال پیدا کرنا مدرستہ النبات کی تحقیر اور بالواسطہ علم کی تحقیر ہے لہٰذا اگر اس کا مفہوم یہ ہے تو لڑکیوں کو تو علم کی خاطر علم حاصل کرنے دیا جائے انکی نگاہوں میں مدرستہ النبات کی عظمت اور وقار بڑھاؤ تاکہ وہ علوم دینیہ سے متمتع ہو کر ہماری آئندہ نسل کی اصلاح و تہذیب میں کامیاب ہو سکیں۔

(انسوتہ بکس)

۱۶ میں سے ، تفریق کرنے سے کیا نتیجہ حاصل ہوتا ہے اگر یہ اس تختہ کے ذریعہ سے دیکھنا ہو تو ۱۶ اور ۷ کو ایک ہی قطار میں دیکھ لو۔ اگر ۱۶ اور ۷ کو عمودی قطار میں دیکھا جائے تو ان اعداد کی تفریق کا جواب اسی ۱۶ کی افقی قطار میں بائیں طرف پہلے ہی خانہ میں (۹) پایا جائے گا۔ اگر ۱۶ اور ۷ کو افقی قطار میں دیکھ لیں تو ۱۶ اور ۷ کی تفریق کا جواب۔ اسی ۱۶ کی عمودی قطار میں اوپر کی طرف پہلے خانے میں (۹) پایا جائیگا۔

اسی طرح یہ تختہ اکائیوں کی جمع کے لئے بھی کام دے سکتا ہے۔ مثلاً ۹ اور ۷ کا حاصل جمع اگر نظری طور پر معلوم کرنا ہو تو پہلی افقی قطار ۹ اور پہلی عمودی قطار میں ۷ دیکھ لیں اور اسی ۹ کی عمودی قطار اور اسی ۷ کی افقی قطار جہاں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ اس خانہ میں جو ہندسہ (یہاں پر ۱۶) نظر آئے گا۔ وہی ۹ اور ۷ کا حاصل جمع ہو گا۔

۸ امیں سے اکائیاں تفریق کرنے کی کافی مشق کرانے کے بعد ایسے سوالات دئے جائیں۔ جس میں مفروق منہ (بڑا عدد) ۲۰ سے زاید ہو اور مفروق (چھوٹا عدد) کا اکائی کا ہندسہ مفروق منہ کے اکائی کے ہندسے سے بڑا ہو۔

مثلاً ۔ ۲۳ ۔ ۱۶ ۔ ۳۴ ۔ ۱۸ وغیرہ ابتدا میں یہ مناسب ہوگا کہ بچے یہ سوالات جمع معکوس کے طریقے سے حل کریں اور ایسی صورت میں وہ دہائی کی تکمیل کا خیال رکھیں۔ مثلاً ۲۳ ۔ ۱۶ میں بچے اس طرح جواب نکالیں کہ ۱۶ اور ۴ برابر ۲۰ = ۲۰ اور ۳ برابر ۲۳ لہذا جواب ۷ ہوا۔ ۳۴ ۔ ۱۸ میں ۱۸ اور ۲ برابر ۲۰ ۲۰ اور ۱۰ برابر ۳۰ ۳۰ اور ۴ برابر ۳۴۔ جواب ۲ + ۱۰ + ۴ = ۱۶ ہوا

دو ہندسے اعداد کی حاصل والی تفریق

مثال ۸۵ ۔ ۴۷ ۔ یہ مثال حسب ذیل طریقہ پر بچوں سے حل کرائی جائے۔ (۱) ۸۵ میں ۴۰ نفی کئے جائیں تو ۴۵ رہیں گے اور بعد میں ۷ تفریق کئے جائیں تو جواب ۳۸ آئیگا۔ زبانی عمل (۸۵، ۴۵ ۳۸) جواب یا (۱۱) ۸۵ میں سے پہلے ۷ تفریق کریں تو ۷۸ رہیں گے اور بعد ۷۸ میں سے ۴۰ تفریق کریں تو جواب ۳۸ آئے گا۔ زبانی عمل (۸۵ ۷۸ ۳۸) یا (۱۱۱) ۴۷ سے ۷۷ بنانا اور بعد میں

۸ جمع کرکے ۸۵ تک پہونچنا۔ زبانی عمل (۴۷)، ۳۰، ۳۸ جواب۔
یا (۷) ۴۷ سے ۵۵ تک پہونچنا اور بعد میں ۳۰ جمع کرنا۔ زبانی عمل (۴۷)، ۸، ۳۸ جواب۔

اگران سب طریقوں کی اگر کافی مشق ہوجائے تو ان میں سے جو طریقہ بچوں کو آسان معلوم ہو وہ طریقہ اختیار کرے جواب جلد اور صحت کے ساتھ نکال سکیں گے۔

تفریق کے مروجہ طریقے

حاصل والی تفریق کے سوالات مختلف طریقوں سے حل ہوسکتے ہیں جن میں سے چند ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں۔

۱۔ طریقہ تحلیلی
۲۔ طریقہ مساوی جمع
۳۔ طریقہ تکمیلی جمع

ان طریقوں میں سے کونسا طریقہ بہتر اور کونسا ناقص ہے اسکی نسبت کوئی ایک رائے بالاتفاق قائم نہیں ہوی کوئی طریقہ اس وقت تک خاطرخواہ نہیں ہوسکتا جب تک اس سے عملی انکشاف نظر نہ آسکے۔ بچوں کی تفہیم کے لئے کونسا طریقہ مفید ہوگا۔ اس کا انحصار زیادہ تر استاد کی لیاقت علمی استعداد اور ذاتی شخصیت و تجربہ پر ہی ہوتا ہے تاہم متذکرہ بالا تینوں طریقوں کا تفصیلی بیان ذیل میں درج کیا جاتا ہے تاکہ مدرس اس کو غور سے پڑھے اور تجربہ کرکے دیکھے کہ آیا کوئی ایک ہی طریقہ سے بچوں کو تعلیم دیجائے یا سب طریقے حسب ضرورت و موقع استعمال میں لائے جائیں۔

چھوٹی جماعتوں کے مدرسین اکثر تحلیلی طریقہ کو پسند کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اس طریقہ سے تفریق کا عمل بچوں کو بالکل واضح طور پر تھوڑے ہی وقت میں سمجھا سکتے ہیں۔ بعض مدرسین جو بڑی (اعلیٰ) جماعتوں کو تعلیم دیتے ہیں طریقہ مساوی جمع کو پسند کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ طریقہ مساوی جمع معقول اور تیز رو ہے۔

تفریق بہ طریقہ تحلیلی

ابتدائی طبقوں کے طلبا کو سمجھانے کے لئے طریقہ تحلیلی سے تفریق بتانا بہ نسبت دوسرے طریقوں کے آسان ہے اس طریقہ میں

مفروق منہ (بڑا عدد) کی تحویل کرنے سے اس کی اصلی مقدار (قیمت) میں کچھ فرق نہیں ہوتا
مثال ۴۵ - ۱۷، سوال مذکور پہلے مروجہ طریقہ پر لکھا جائے یعنی دہائی اور اکائی
کے خانوں میں اعداد کے ہندسے باترتیب لکھدیے جائیں۔ تفریق کا عمل کرنے میں بچوں کو
مشکل معلوم ہوگی کیونکہ بڑے عدد کی پانچ اکائیوں میں سے چھوٹے
عدد کی ۷ اکائیاں تفریق نہیں ہوسکتیں اب اس مشکل کو رفع کرنے کی
غرض سے بذریعہ سوال وجواب یہ بات اخذ کرائی جائے کہ ۴
دہائیوں میں سے ایک دہائی لیکر اس کو اکائیوں
کی صورت میں تبدیل کیا جائے (اس کے قبل بذریعہ
اشیا محسوسہ اسی قسم کے حل میں ایک دہائی کا بند
کھولنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی تحریری عمل میں
دہائیوں کی اکائیاں بنانے کی ترکیب اسی سابقہ واقفیت کی بنیاد پر سمجھائی جائے)

اکائی	دہائی
۵	۴
۷	۱

اکائی	دہائی	=	اکائیاں	دہائی
۱۵	۳	=	۵	۴
۷	۱	=	۷	۱
۸	۲			

ایک دہائی کی دس اکائیاں اور اصلی ۵ اکائیاں ملکر کل ۱۵ اکائیاں ہوئیں اور دہائیوں
میں سے ایک دہائی اکائیوں میں تبدیل کرنے کی وجہ سے باقی دہائیوں کی تعداد بجائے
۴ کے ۳ رہی۔ اس طرح ۴۵ کی تحویل ۱۵ اکائیوں اور ۳ دہائیوں میں کی گئی لیکن عدد
مذکور کی اصلی مقدار (قیمت) میں کچھ بھی فرق نہیں ہوا ۴۵ کی تحلیل کرنے پر مفروق کی اکائیاں
اور دہائیاں مفروق کی اکائیوں اور دہائیوں سے زیادہ ہونیکی وجہ سے تفریق کے عمل میں بچوں کو مشکل باقی نہیں رہی اب وہ آسانی سے جواب بتا سکیں گے کہ ۱۵ اکائیوں میں سے ۷ اکائیاں تفریق کرنے سے ۸ اکائیاں باقی رہیں گی اور ۳ دہائیوں میں سے ۱ دہائی منہا کرنے سے ۲ دہائیاں باقی رہیں گی اور اس طرح ۴۵ - ۱۷ کا جواب ۲۸ بتائیں گے

بذریعہ شکل طریقہ تحلیل کا عمل زیادہ واضح ہوسکتا ہے

مثال ۳۴۴ - ۱۵۸

	اکائی	دہائی (۱۰)	سیکڑہ (۱۰۰)
مفروق منہ			
مفروق	۸	۵	۱
حاصل تفریق	۶	۸	۱

عمل۔ (ا) ۴ میں سے ۸ تفریق نہیں ہو سکتے ۴ میں سے منہا کرنے کے بعد پھر اور ۴ منہا کرنے کے رہ جاتے ہیں لہٰذا دہائی کے خانہ سے ایک دہائی لے کر اس کی ۱۰ اکائیاں بنائیں ۱۰ میں سے باقی کے ۴ منہا کرنے سے ۶ رہتے ہیں۔ جو اکائی کے درجہ میں لکھدئے جائیں۔

۴ دہائیوں میں سے ایک دہائی اکائیاں بنانے کے لئے لیگئی تھی اب ۳ دہائیاں رہیں جن میں سے ۵ دہائیاں منہا نہیں ہو سکتیں پہلے ۳ دہائیاں منہا کرنے پر اور ۲ دہائیاں منہا کرنے کی رہ جاتی ہیں۔ سیکڑے میں سے ایک سیکڑہ لیکر اس کی ۱۰ دہائیاں بنائیں ان میں سے منہا کرنے پر ۸ دہائیاں رہتی ہیں جو دہائی کے خانہ میں لکھدی جائیں

۳ سیکڑے میں سے ایک سیکڑہ دہائیاں بنانے کیلئے لیا گیا تھا اب ۲ سیکڑے باقی رہے ان میں سے ایک سیکڑہ منہا کرنے پر باقی ایک سیکڑہ رہا جو سیکڑہ کے خانہ میں درج کیا جائے۔ جواب ۱ سیکڑہ ۸ دہائیاں یعنے ۱۸۶ بچوں سے اخذ کرایا جائے عمل کرتے وقت زیادہ تر بچوں سے کام لیا جائے۔ تاکہ ہر ایک بات ان کی سمجھ میں آجائے۔ اور خوب سمجھ لے۔

(ب) دوسرا عمل حسب ذیل بھی کیا جا سکتا ہے۔

۴ میں سے ۸ تفریق نہیں ہو سکتے لہٰذا دہائی کے خانہ میں سے ایک دہائی لے کر اکی ۱۰ اکائیاں بنائیں۔ اور اصلی ۴ اکائیاں ان میں جمع کیجائیں جملہ ۱۴ اکائیاں ہونگی۔ ۱۴ اکائیوں میں سے ۸ اکائیاں منہا کرنے پر باقی ۶ اکائیاں رہتی ہیں جو اکائی کے درجہ میں لکھدی جائیں۔

اب دہائیاں ۳ رہیں ۳ دہائیوں میں سے ۵ دہائیاں منہا نہیں ہو سکتیں لہٰذا سیکڑے کے خانہ میں سے ایک سیکڑہ لے کر اس کی دہائیاں بنالیں اور ۳ دہائیاں ان میں ملائیں جملہ ۱۳ دہائیاں ہوں گی ۱۳ دہائیوں میں سے ۵ دہائیاں تفریق کرنے پر باقی ۸ دہائیاں رہتی ہیں جو دہائیوں کے خانہ میں درج کی جائیں۔

سیکڑے دو رہے ان میں سے ایک سیکڑہ منہا کرنے پر باقی ایک سیکڑہ رہتا ہے۔ جو سیکڑے کے خانہ میں لکھدیا جائے جواب ۱۸۶ بچوں سے اخذ کرایا جائے۔ مثال مذکور کا حل۔

	اکائیاں	دہائی	سیکڑہ		اکائی	دہائی	سیکڑہ
۳۴۴ بعد تحویل	۱۴	۱۳	۲	=	۴	۴	۳
	۸	۵	۱	=	۸	۵	۱
جواب	۶	۸	۱		۶	۸	۱

مثال ۵۴۳ - ۳۵۴ کا عمل حسب ذیل کیا جاسکتا ہے۔

	اکائی	دہائی	سیکڑہ		اکائی	دہائی	سیکڑہ
۵۴۳ بعد تحویل =	۱۳	۱۳	۴	=	۳	۴	۵
۳۵۴	۴	۵	۳		۴	۵	۳
جواب	۹	۸	۱		۹	۸	۱

رفتہ رفتہ بچوں کو اس طرح عادی بنایا جائے کہ وہ تحویل کا عمل دل میں ہی کرکے حاصل تفریق دریافت کرسکیں۔ مثلاً ۱۳ - ۴ = ۹ اکائیاں ۱۳ - ۵ = ۸ دہائیاں ۴ - ۳ = ۱ سیکڑہ جواب ۱۸۹۔

طریقہ تحلیل میں اکائی دہائی وغیرہ کی امداد کے لئے دہائی سیکڑہ وغیرہ بالترتیب مستعار لئے جاتے ہیں۔ مگر واپسی کا عمل نہیں کیا جاتا۔ یہ طریقہ ادنی جماعتوں کے مدرسین پسند کرتے ہیں کیونکہ یہ طریقہ عام فہم ہے۔ دلائل وثبوت کی وجہ سے یہ طریقہ بچوں کی سمجھ میں جلد آتا ہے البتہ مفروق منہ میں صفر کا سلسلہ واقع ہو تو بچوں کو کس قدر دقت محسوس ہونے کا اندیشہ ہے لیکن یہ دقت بھی مفروق اور مفروق منہ ہر دو سے ایک ایک کم کردی جائے تو رفع ہوسکتی ہے۔ مثلاً ۱۰۰ - ۲۷ کی تفریق کراتے وقت ۱۰۰ اور ۲۷ ہر دو میں سے ایک ایک کم کردیا جائے تو یہی سوال ۹۹ - ۲۶ کی صورت میں تبدیل ہوسکتا ہے جو آسانی کے ساتھ بچے حل کرسکیں گے۔ یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ ایک دفعہ مفروق منہ کی تحلیل کرنے پر بچے کسی جانب سے (دائیں سے بائیں طرف یا برعکس) تفریق کا عمل کرسکتے ہیں۔ اور ہر دو صورتوں میں وہی جواب آتا ہے۔

تفریق بہ طریقہ مساوی جمع

یہ طریقہ اس اصول پر مبنی ہے کہ غیر مساوی اعداد میں اگر مساوی اعداد جمع کئے جائیں تو دو اعداد کے اصلی فرق میں کچھ تبدیلی نہیں ہوتی فرق وہی قائم رہتا ہے۔ جو ابتدا میں ہوتا ہے۔ مثلاً۔

۹ - ۵ = ۱۹ - ۱۵ = ۱۱۹ - ۱۱۵ وغیرہ - اس کی وضاحت کے لئے دو بچوں کی عمروں کی مثال موزوں ہوگی۔ کیونکہ جب تک دونوں کی زندگی قائم رہے گی انکی عمر کا فرق بھی قائم رہے گا۔ ان کی ذاتی عمر میں کتنی بھی تبدیلی ہو۔ مثلاً ایک بچے کی عمر ۸ سال کی ہے دوسرے کی عمر ۵ سال کی ہے دونوں کی عمر میں ۳ سال کا فرق ہے۔ ۶ سال کے بعد بڑے کی عمر ۸ + ۶ یعنے ۱۴ ہوگی اور چھوٹے کی عمر ۵ + ۶ = ۱۱ ہوگی فرق تو ۳ ہی سال کا قائم رہے گا۔ مثال ۴۵ - ۱۷ کی تفریق مساوی جمع کے طریقے سے حسب ذیل سمجھائی جائے۔ بچوں کو یہ معلوم ہے کہ ۵ میں سے ۷ منہا نہیں ہو سکتے مفروق منہ اور مفروق میں ۱۰ جمع کرنے پر وہ اعداد بالترتیب ۵۵ اور ۲۷ ہونگے۔ اس صورت میں بھی بچوں کو وہی دقت پیش آئے گی۔ پھر اس طرح مساوی اعداد جمع کرنے سے بچوں کی مشکل کو رفع کرنے کے لئے مندرجہ ذیل طریقہ اختیار کیا جائے۔ ۵۵ کی تحویل ۱۵ + ۴۰ میں ہو سکتی ہے کیونکہ اس صورت میں ۱۵ اکائیوں میں سے ۷ اکائیاں منہا ہو سکتی ہیں۔ ۵۵ = ۱۵ اکائیاں + ۴ دہائیاں اور ۲۷ = ۷ اکائیاں + ۲ دہائیاں سوال مذکور حسب ذیل تختہ سیاہ پر لکھکر حل کیا جا سکتا ہے اور بچوں سے بھی یہ کرایا جا سکتا ہے

	اکائیاں	دہائیاں		اکائیاں	دہائیاں
۵۵ =	۱۵	۴	=	۵	۴
۲۷ =	۷	۲	=	۷	۱
	۸	۲		۸	۲

اس سے یہ بات بچوں کے ذہن نشین کرائی جائے کہ مفروق منہ (یعنے بڑا عدد) اور مفروق (یعنے چھوٹا عدد) ہر دو میں دس جمع کئے گئے ہیں لیکن مفروق منہ کی اکائیوں میں ۱۰ اکائیاں اور مفروق کی دہائیوں میں ایک دہائی جمع کیگئی۔ یہ عمل محض سہولت کے لحاظ کیا گیا ہے تاکہ سوال کے حل میں آسانی ہو۔

بذریعہ شکل طریقہ مساوی جمع کا عمل زیادہ واضح ہو سکتا ہے مثال ۴۴۳ - ۱۵۸

سوال مذکور کی شکل دوسرے صفحہ پر ہے۔

سوال مذکور کا حل حسب ذیل ہوگا۔

(۱) ۴ میں سے ۸ تفریق نہیں ہو سکتے لہذا بڑے عدد کی اکائیوں میں ۱۰ اکائیاں

زیادہ کی جائیں تو کل ۱۴ اکائیاں ہوگئیں ۱۴ میں سے ۸ تفریق کئے تو ۶ اکائیاں رہتی ہیں جو اکائیوں کے خانہ میں لکھ دی جائیں۔ بڑے عدد کی اکائیوں میں جب ۱۰ اکائیاں زیادہ کیں تو چھوٹے عدد کی دہائیوں میں ایک دہائی زیادہ کیجائے تاکہ اصل فرق قائم رہے

		اکائی	(۱۰) دہائی	(۱۰۰) سیکڑہ
مفروق منہ (بڑا عدد)	۳۴۴		۱	
مفروق (چھوٹا عدد)	۱۵۸	۸	۵	۱
باقی	۱۸۶	۶	۸	۱

چھوٹے عدد میں اب ۶ دہائیاں ہوئیں جو ۴ دہائیوں میں سے تفریق نہیں ہوسکتیں لہٰذا بڑے عدد کی دہائیوں میں ۱۰ دہائیاں جمع کی جائیں تو کل ۱۴ دہائیاں ہوں گی ۱۴ دہائیوں میں سے ۶ دہائیاں منہا کرنے پر ۸ دہائیاں باقی رہیں گی جو دہائیوں کے خانہ میں درج کی جائیں۔

بڑے عدد کی دہائیوں میں جب ۱۰ دہائیاں جمع کیں تو چھوٹے عدد کے سیکڑے میں ایک سیکڑہ جمع کیا جائے تاکہ اصل فرق قائم رہے۔ چھوٹے عدد میں ایک دو سیکڑے ہوئے۔ ۳ سیکڑے میں سے ۲ سیکڑے منہا کرنے پر ایک سیکڑہ باقی رہے گا۔ جو سیکڑے کے خانہ میں درج کیا جائے۔ جواب ۶ اکائیاں ۸ دہائیاں ۱ سیکڑہ۔ یعنی ۱۸۶ ہوگا۔

سوال مذکور کا زبانی عمل حسب ذیل ہوگا۔
۱۴ میں سے ۸ گئے ۶ رہے ۱۴ میں سے ۶ گئے ۸ رہے ۳ میں سے ۲ گئے رہا ایا ۸ اور ۶ چودہ حاصل آیا ا اور ۵ چھ ۶ اور ۸ چودہ حاصل آیا ۱ اور ۱ دو ۲ اور ۱ تین جواب ۱۸۶۔

سیکڑہ	دہائی	اکائی		سیکڑہ	دہائی	اکائی	
۳	۱۴	۱۴	=	۳	۴+۱۰	۴+۱۰	۳۴۴ بعد جمع
۲	۶	۸	=	۱+۱	۱+۵	۸	۱۵۸ بعد جمع
۱	۸	۶		۱	۸	۶	۱۸۶

مثال ۲۱۷ — ۳۴۴ کا عمل بذریعہ طریقہ مساوی جمع حسب ذیل ہوسکتا ہے۔

سیکڑہ	دہائی	اکائی		سیکڑہ	دہائی	اکائی	
۷	۱۲	۱۱	=	۷	۱۲	۱۱	۲۱۷ } بعد جمع مساوی
۴	۵	۴	=	۱+۳	۱+۴	۴	۳۴۴
۳	۷	۷		۳	۷	۷	

طریقہ مساوی جمع سے تفریق کے سوالات حل کرنے پر یہ ایک اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں ایک نیا ہی سوال مرتب کرنا پڑتا ہے اور اس وجہ سے یہ طرز زیادہ سنجیدہ معلوم ہوتا ہے اس میں تو شک نہیں ہے کہ یہ طریقہ عملی طور پر بے خطر ہے اور عملی میدان میں بہ ذریعہ صحت وسلامت زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے۔

طریقہ تکمیلی جمع

تفریق کا عمل دو طرح سے کیا جا سکتا ہے دو اعداد کا فرق یا تو (۱) ایک عدد میں سے دوسرا گھٹانے سے یا (۲) چھوٹے عدد میں وہ عدد جمع کرنے سے جس کی وجہ سے بڑا عدد بن سکے۔

مثال۔ ۸ - ۵

(۱) ////////// = ۸
////// = ۵ } فرق ۳ چھوٹا عدد نکال دینے سے

(۲) |||||||| = ۸
||||| ⋮⋮⋮ ۵ } فرق ۳ تکمیل جمع سے

though they may not be reconciled, can at any rate be understood, and therefore respected, which is a great advance toward the desired goal. The symbolism introduced at such fellowship camps as the Swiss Y. M. C. A. Camp at Geneva, where the "Torch of Goodwill" is kindled at the "Fire of Friendship" and taken home by the boys, meant a good deal to the members of the camp. The boys on their return become interpreters of one race to another, and who can measure the influence of this silent campaign going on all the time for international goodwill? Far more than we realise, the relation of races is determined, not by Government or Congress enactments, but by personal contacts of multitudes of individuals. The friendships engendered at international conferences or camps or by students at colleges in other lands may only be a thread stretched between the nations, but it means that friendship and sympathy are being promulgated all around. Further, public opinion plays an important part in international relationships The formation of a right public outlook, therefore, is most important, and in this connection these mutual friendships count for a great deal, for public opinion, after all, is simply one's own opinion plus the opinion of others. It is shaped through individuals, and it is just here that teachers can do a great deal by cultivating the international sense and outlook among their pupils. We never know how soon we may be called upon to face a big racial or international issue. Men do not think clearly in the presence of a great fear, but react to the race sentiment that has been developed in them. Now is the time, therefore, to begin a crusade for the development of the international mind, and it may well begin in our schools. To this end the spirit of our education may need changing; it may be that new text-books will have to be written, in order that the wrong attitude may not be developed; but in view of the high end to be achieved, no sacrifice should be considered too great for its accomplishment.

Editorial

Fostering an International Outlook

The recent lecture by Mr. Tracy Strong under the auspices of the Hyderabad Teachers' Association was most instructive to teachers, not only in revealing the psychology of the youth of the various countries where he had lived, but also by reason of the latent motive that underlay all his varied experience, viz., the idea of fostering an international outlook. It is a subject well worth the attention of teachers, in whose hands lies the responsibility of shaping the outlook of the rising generation. The League of Nations endeavours to develop the international outlook of the world at large, but is realising the difficulty of reshaping minds matured and developed amid an uncompromising national bias, and has started its "Youth Department" to enlist the forces of education on behalf of its objective.

With many, international co-operation means little more than an attitude of goodwill towards people of other nations and races. This is good as far as it goes but it must be more than a mere sentiment; it must be a definite conviction if anything worth while is to be accomplished, and such a conviction is only created by means of a definite educational process—a process which will envisage all the facts and take account of the essential differences, otherwise international co-operation tends to be spasmodic and ineffective.

In this matter of right understanding, international associations such as Boy Scouts, Y. M. C. A's. and Student Movements, are doing invaluable work in building up amongst the youth of our day the international mind and outlook, *e. g.* the Scouts' World Jamboree to be held in Hungary this year. As Mr. Tracy Strong showed, it is in the fellowship of camp life that boys learn to respect each other's view points, and learn that opposing attitudes,

5. "Courses of Study" by J. M. Robertson.
6. "Some Aspects of Art Education" published under the auspices of the National Society of Art Masters.
7. "Education and the Social Order" by Bertrand Russell.
8. "New Schools for Old" by Evelyn Dewey.
9. "The Idea of a University" by John Henry Newman.
10. "Arnold of Rugby" J. J. Findlay.
11. "The Class Room Republic" by E. A. Craddock.
12. "Comparative Education" by A. H. Hope.
13. "Reconstruction and Education in Rural India" by Premchand Lal.
14. "Theory and Practice of Teaching" by Rev. Edward Thring.
15. "The Teaching of Geography" by Wallis.
16. "The Teaching of Arithmetic" by H. R. Hamley.

Child Education.

17. "Education through the Imagination" by Margaret Mcmillan.
18. "The Nursery School" by Margaret Mcmillan.
19. "The Psychology of Childhood" by Norsworthy and Whitley.
20. "Parents and the Pre-school Child" by William E. Blatz and Helen Mcm. Bott.

Psychology.

21. "Know your own Mind" by William Glover.
22. "Human Behaviour" by Golvin and Bagley.

1. Mr. Syed Hasanuddin, B. A., was elected General Secretary in the absence of Mr. Mohamad Sharif Mashadi on leave.

2. A sum of B. G. Rs. 51-15-0 was sanctioned to enable Mr. S. M. S. Mushadi to attend the All-India Teachers' Conference at Lahore.

3. A Sub-Committee consisting of the following was appointed to prepare a report on the Kindergarten :—

1. Syed Ali Akbar, *Chairman.*
2. Miss D. Webster.
3. ,, M. E. Read
4. ,, A. Tyler.
5. Mrs. Garden.
6. Mr. Abdul Noor Siddiki, *Secretary.*

It was decided that there should be two parallel sub-committees for preparing a report on the Problem of Backward Children, one for Secunderabad and the other for Hyderabad. Dr. Krishnayya was appointed Chairman of the Secunderabad Sub-Committee and was requested to arrange for the election of members, while the following were elected as members of the Hyderabad Sub-Committee ;—

1. Mr. Salim Bin Sayeed, *Chairman.*
2. ,, Faiz Mohamed.
3. ,, Noorul Hasan.
4. ,, Fakrul Hasan.
5. ,, Gulam Dastagir, *Secretary.*

5. The following subjects were selected for discussion at the monthly meetings at the various centres during the Second Quarter of the year :—

(a) The value of play in the education of children, with special reference to Kindergarten.

(b) Home work, with special reference to Backward children.

(c) The Equipment of a Kindergarten.

ADDITIONS TO THE TEACHERS' LIBRARY.

History & Geography.

1. "The Relations of Geography and History" by George.

Science.

2. "Science in Education" by Cawthorne.

Educational Methods.

3. "Projects in Education" Edited by Alice B. Van Dooen.

Education (General).

4. "The Reconstruction of the Curriculum of the Elementary Schools of India" by T. N. Jacob.

The Hyderabad Teachers' Association.

General Secretary's Report for the Quarter October—December, 1933 (Azur—Bahman, 1342 F.)

A meeting of the Central Executive Committee of the Hyderabad Teachers' Association was held on the 22nd October, 1933 at the office of the Divisional Inspector of Schools, Head-Quarters, at which 16 members were present. Rev. F. C. Philip, Vice-President of the Association, took the chair.

1. It was decided that the following subjects should be discussed at the monthly meetings at different centres :

(a) What arrangements should be made for the education of children below six years?

(b) Backward Children: Detection of Backwardness and Remedies.

2. It was resolved that at least one delegate should be sent to the next Annual Conference of the All-India Federation of Teachers' Associations to be held at Lahore.

3 The undermentioned gentlemen were nominated as delegates to the Council of All-India Federation of Teachers' Association for the year 1933:—

1. Mr. Syed Ali Akbar.
2. Mr. Shaik Abul Hasan.
3. Dr. Krishnayya.
4. Mr. G. A. Chandawarkar.

4. Rev. F. C. Philip and Mr. Shaikh Abul Hasan were elected as Vice-Presidents of the Hyderabad Teachers' Association for the Year 1342 Fasli, while Mr. Mushadi was re-elected as General Secretary. It was also decided that others who were members of the Committee last year should continue.

5. The rules of the Library of the Hyderabad Teachers' Association prepared by the members of the Library Sub-Committee were read and approved.

Another meeting of the Central Executive Committee of the Teachers' Association was held on the 20th December, 1933 under the chairmanship of Mr. Syed Ali Akbar, President, at the Office of the Divisional Inspector of Schools, Head-Quarters. The meeting was attended by 11 members.

"patriotism". This teaching has had the painful result of making the boys of one country often bear enmity towards the boys of other lands. A cure for this feeling is frank discussion with mutual respect. Debates presuppose a defeat of one side; but in friendly discussions there is no defeat of one or other party. Disagreements may be expressed freely without trying to force other people to adopt our own views. International discussions which attempt to deal with personal problems are doomed to failure owing to the social back-ground varying so much from country to country. Personal problems need more intimate discussions and here the teacher finds his opportunity and responsibility. He can give information on such personal problems as sex at suitable times, or he can ask parents to do so when the opportunity arises. It gives to the young man a new sense of respect and love for the father when the latter tackles the problem sensibly and properly. Though the boy must face facts, idealism can be brought to bear on the problems of life, and can give inspiration to live and work in the best interests of the community. Turning to racial problems, the race feelings are so strong that discussion without the utmost friendliness is likely to bring hatred and be harmful. Where one race is willing to die in order to maintain its new-found independence, another will lay down its life to regain lost glories. Enumeration of old wrongs does no good to the speaker or hearer and may induce racial hatred. The attitude must be one of disagreement with respect, which will foster tolerance if not friendliness.

After making a few remarks on the need in India of teachers with sympathy and broad outlook, the Chairman proposed a hearty vote of thanks to the distinguished speaker for his instructive and inspiring address. He also thanked Mr. G. Sundaram for lending the Hall and Rev. F. C. Philip for arranging the lecture. Rev. F. C. Philip proposed a vote of thanks to the Chairman.

country till they reach the age of 41 years. Youth therefore, has banded together in massed organisations to find freedom, or self-expression in some form, either Nationalism (worshipping of the country and submission of one's self to the country's cause) or Socialism (worship of class and class unity). To suppress these ideals may cause them to spread surreptitiously and become a danger to the peace of the community, while sympathetic guidance may prevent catastrophe. Japan suppresses "Dangerous Ideas," as it calls Communism, and does not allow it to be discussed in schools, but the students get their own ideas and become Marxists or Fascists. America realises the value of school camps where difference of opinions can be openly discussed and respected, for one can respect other's opinions if one's own are also treated with respect. This is the way to overcome the surreptitious organisations which are becoming a real danger to civic peace in Japan and elsewhere.

At the Swiss International Y. M. C. A. Camp, 80 representatives of many nations, both of Europe and other lands, met together to discuss problems common to most of them. These boys did not come with any feeling of friendship. The German boy felt that he would not be respected by his victors. The Hungarian thought that he must get back his thousand year old empire. The Roumanian felt he must preserve the freedom for which his countrymen were aspiring for a thousand years. When every representative was heard, it was clear that there were two sides to each issue, and that while the problems were extremely difficult, the view-point of the other fellow must be respected. Before the camp closed, small pieces of wood, called "Torches of Goodwill", were carved with the initials of every nation represented and were lighted at the fire of "Friendship", the representatives returning to their homes with a profound respect for the other fellow.

How unfortunate it is that children have been taught to harbour prejudices against other nations and to call this

The following is a brief summary of Dr. Strong's speech:—

Certain problems are common to the youth of many lands; they are economic, national or racial, and personal problems. The Y. M. C. A. and the Boy Scout Movement are meeting and answering some of these problems and working to promote international peace. The Youth Movement in Germany did much valuable work in the beginning, but unfortunately to-day many of the Youth Associations in that country have a party basis without any international outlook.

The development of extra-curricular activities, games, excursions and Boy Scouting in modern times is a healthy sign, for such activities offer to the boys opportunities of character building, social service and self expression, which the school curriculum cannot offer. Their chief value however, lies in the fact that they provide a "safety valve" for the impetuosity and idealism of boyhood, which tend to be smothered and stultified by the presence of commercialism.

Teachers have a very important task entrusted to them, that of moulding the character of the youth of to-day, in which work they can have more influence than even the best out-of-school organisations, if they use their opportunities well. It is true on the whole that the youth of to-day has an outlook on the future which is far from optimistic. He knows that the economic system does not absorb him, so he grows careless about his own achievements. The youth of to-day knows that unemployment is the lot of the majority. Uncertain tenure of posts and the feeling that education in school is no preparation for work out of school induce an attitude of despair towards the future and of carelessness towards present scholastic achievements. To give an example, it has been estimated that graduates of German Universities who are preparing for teaching will have no chance of employment as teachers in their own

The Problems and Needs of Boys

LECTURE BY Dr. TRACY STRONG,

Secretary, Y. M. C. A. International Committee for Boys' Work, Geneva.

Under the auspices of the Chaderghat Branch of the Hyderabad Teachers' Association, an interesting lecture was delivered in the Assembly Hall of the Methodist Boys' High School by Dr. Tracy Strong of the Y. M. C. A. International Committee for Boys' Work on the 8th February, 1933. Though the lecture had been arranged at short notice, the gathering was quite satisfactory, nearly 200 teachers from different schools being present. The proceedings began with music arranged by the Principal of the Methodist Boys' High School. This over, the Chairman, Mr. S. Ali Akbar, introduced the lecturer Dr. Strong. He remarked that having travelled widely and come into contact with the youth movement in different parts of the world, Mr. Strong was specially qualified to speak on the 'Problems and Needs of Boys'. There were many problems that were common to the youths of different countries in spite of the diversity in political, economic and social conditions. Referring to the tendency for self-expression in modern education which Mr. Strong had emphasised in a previous lecture, Mr. Ali Akbar pointed out that the cry everywhere was: 'Release the faculty of the child and let him develop through activity and self-expression'. Though the response to this cry in India had not been very satisfactory, yet signs of improvement were not wanting. He mentioned the reform of the curriculum, the place given to physical education, the development of extra-curricular activities and the spread of the Boy Scout Movement as examples and concluded by saying that there was nothing more useful for the youth of India than the Boy Scout Movement with its emphasis on character-building, physical fitness, the spirit of service and the spirit of brotherhood.

and Games. The girls put on a special light costume and take off their shoes when they do physical exercises in the school gymnasium. Attached to the gymnasium is a washing room, where at the end of the period they wash their feet before putting on their shoes again. In addition to games and physical exercises, the girls are taught swimming and rowing, for both of which the River Spree, on the bank of which the school is situated, offers ample opportunities. Before joining the Boat Club, the girls are taught the rowing movements by indoor practice for which, as already mentioned, special arrangements have been made.

In the course of an interesting conversation which I had with the Director of the school, he stressed the fact that the discipline which he enforced in his school was Free Discipline. One was impressed not only by the orderliness but by cheerful atmosphere of the school. Apart from games, the various school societies, such as the Debating Society, Dramatic Society and the Music Society, help to foster *esprit de corps* among the students as well as to develop in them a sense of responsibility. As in all other German schools, a school excursion is organised regularly once a month. Finally, there is a Parents' Advisory Committee which meets periodically to discuss the problems of the school with the teaching staff. A healthy rule of the school, which has been passed with the approval of the parents, is that no girl should receive private tuition without the permission of the Director. The vital bearing which this rule and some other features of the school mentioned in this article have on Indian schools scarcely needs any elaboration.

Manual Training is confined to Classes II B and II A. It consists of light wood work and cardboard work. In connection with the former, the girls are taught to do fret-saw work in planed wood; for example, toys, sewing boxes, picture frames, doll furniture and key plates. As regards cardboard work, the girls are trained to make useful articles out of cardboard such as albums, stationery boxes and picture frames. They are also taught to repair books and maps, do simple book binding and to prepare decorative paper with which to cover the articles made by them. A girl is allowed to take home things made by her provided that she pays the cost of the material supplied by the school. It may be pointed out that instruction in Manual Training is not universal in the Girls' secondary schools, as it is in the case of the Boys' secondary schools, and that even in those Girls' schools where the subject has been introduced, it receives less emphasis than in Boys' schools, where it is taught in almost all the classes and where the course includes metal work, besides wood-work and card-board work.

One of the most interesting lessons that I watched in the Dorotheen Schule was a Geography lesson in III A. The teacher was showing the girls lantern slides illustrative of the physical geography of South America. At the end of the lesson, the Head-Master requested me to give the girls a talk on India. Before doing so, with his permission I put a few questions to the girls on the Geography of India. I must say that the knowledge of India which they displayed in their answers was far more satisfactory than the knowledge of Germany generally possessed by even boys and girls of the top class in a High School in India.

The Dorotheen Schule justly prides itself on the provision which it has made for physical education, for which, in addition to a play afternoon, four periods a week are allotted in the time-table. The programme of physical education is divided into three parts Callisthenics, Athletics

The emphasis laid on Mathematics is evident from the fact that 4 periods a week are allotted for it in all the classes. Special attention is also paid to Science which is taught remarkably efficiently. Particular care is taken to give the girls an opportunity of doing practical work individually. In both the Chemistry and Physics Sections, there are separate rooms for preparation of experiments, demonstration and practical work. Each desk in the Practical Work Room is fitted with water and gas pipes and electric current (alternating as well as direct). Equal stress is laid on the practical side of Biology; the school garden is frequently used in connection with the lessons on Botany, while the teaching of Physiology and Hygiene is rendered realistic by organising school excursions to hospitals and child-welfare centres. The equipment of the Science Laboratory includes a magic lantern with a copious supply of slides dealing with all the branches of Science that are taught in the school. These slides are used in the class-room whenever the occasion demands.

The Needle-work room was very interesting. It was decorated with charts illustrating the various kinds of designs used in embroidery, etc., specimens of the work done by the pupils and dolls dressed in clothes made by the girls. There were also about a dozen sewing machines. These machines are worked by electricity and are used by girls in Class III A, beyond which there is no Needle-work. Every care is taken to reduce to a minimum the strain caused by Needle-work on the eyesight of the girls. The Needle-work room is provided with wide windows which admit plenty of light, and there is also a small electric lamp fitted to each sewing machine. Two interesting features of the teaching of Needle-work are: (1) that it is closely correlated with the lessons in Drawing and Arithmetic (e. g., taking of correct measurements, calculation of the cost the material used); and (2) that in addition to using the blackboard, the teacher presses the magic lantern into her service for illustrating the details of intricate designs.

Two foreign languages are compulsory in all secondary schools in Germany. These may be Latin and Greek, as in the *Gymnasium* for Boys or *Gymnasiale Studienanstalt* for Girls; Latin and either English or French, as in the *Realgymnasium* for Boys or *Realgymnasiale Studienanstalt* for Girls; or English and French, as in *Deutsche Oberschule* for Boys and Girls or *Oberrealschule* for Boys and *Oberlyzeum* for Girls. The Dorotheen Schule, being a *Oberlyzeum*, teaches two modern foreign languages, English as the first modern foreign language and French as the second modern foreign language. Yet in spite of the greater weight attached to English, the standard of its teaching did not appear to me to be as high as that of French. This was due to the fact that none of the English teachers had had an opportunity of visiting England. The girls in most of the classes could express themselves fairly well in English, but their reading was not satisfactory and their pronunciation was generally defective. Nevertheless, one could not help being struck by the knowledge of English life, English history and geography and English institutions which the girls of the higher classes possessed. This knowledge they owed partly to the kind of English text-books which they had studied and partly to the fact that in all German secondary schools the teaching of English is closely correlated with that of History and Geography. The text-books that were in use in the three highest classes were as follows:—

I A. Seely: *The Expansion of England.*
Bernard Shaw: *St. Joan.*
Galsworthy: Selected Tales.
Poetry: Selections from Burns, Keats, Shelley, Tennyson and Browning.

I B. Dickens: *David Copperfield.*
Macaulay: *Warren Hastings.*
Shakespeare: *A Midsummer Night's Dream.*

II A. W. Scott: *Kenilworth.*
Jerome: *Three Men in a Boat.*
Shakespeare: *The Merchant of Venice.*

being open to pupils who have passed the 6th year examination of a secondary school. Most Girls' secondary schools have *Frauenschulen* attached to them, and the Dorotheen Schule is no exception to this rule.[1]

The Dorotheen Schule has more than 500 girls on the roll. It is of the *Oberlyzeum* type, that is, it emphasises Mathematics and Science, and in addition to these subjects, offers instruction in Religion, History, Geography, French, German, English, Drawing, Music, Natural Sciences, Physical Education, Manual Training and Needle-work. The course extends over a period of 9 years, so that the girls take the School Leaving Examination at the age of 19. The standard of attainment required in the different subjects for this examination is even higher than that demanded for the Intermediate Examination of Indian Universities.

The classes in a full-fledged secondary school are VI, V, IV, III B, III A, II B, II A, IB and IA, VI being the lowest and I A the highest class. The following table gives the number of periods (each of 50 minutes) devoted to the different subjects in a week:—

Subject.	Classes.								
	IA	IB	IIA	IIB	IIIA	IIIB	IV	V	VI
1. Religion.	3	3	2	2	2	2	2	2	2
2. German.	4	4	4	4	4	4	5	5	5
3. French.	4	4	4	4	4	4			
4. English.	4	4	4	4	3	4	5	5	6
5. History.	3	3	3	3	2	2	3	1	
6. Geography.	2	2	2	2	2	2	2	2	2
7. Mathematics.	4	4	4	4	4	4	4	4	4
8. Natural Science.	3	3	3	3	3	2	2	2	2
9. Drawing.	2	2	2	2	2	2	2	2	2
10. Needlework.					2	2	2	2	2
11. Music.	1	1	1	1	1	1	1	2	2
12. Physical Training.	4	4	4	4	4	4	4	4	4
13. Manual Training.			2	2					

1. See the writer's book *The German School System* pp. 91—92, Longmans

The total number of teachers is 32. The majority of them, including the Head-Master or the Director, as the head of a school is called in Germany, are men. The school fees are 240 Marks a year, but concessions are granted in cases where the annual income of the guardian is less than 2500 Marks. Where two or more girls of the same parents attend the school, only the first child pays the full fees.

In Germany, girls as well as boys enter a secondary school at the age of 10 years *plus* after attending a public elementary school for 4 years. Co-education is not so common in the secondary stage as it is in the primary stage, and except in places where the number of girls available for secondary education is small, the practice is to establish separate secondary schools for girls.

In view of the social and economic conditions in India, most Indian educationists agree that there is need for a special curriculum for Girls' schools in this country. But the German view is that, at any rate, as far as girls studying in High Schools are concerned, they require the same kind of liberal education as boys. The subjects taught in Girls' secondary schools in Germany are consequently the same as those prescribed for the corresponding schools for boys, except that girls are required to do Needlework. It must be remembered, however, that the special needs and interests of girls are taken into consideration in drawing up the detailed syllabuses in certain subjects. For example, in Chemistry and Arithmetic application to house-keeping is always emphasised. For girls who are not aiming at entrance into a university but whose aptitude and inclination lie in the direction of occupations which are of special interest to women, there is a special type of secondary school know as the *Frauenschule* which offers a two years' course, theoretical as well as practical, in Domestic Economy, Hygiene, Care of Infants and Social Work, the admission

1. This works out roughly at B. G. Rs. 16 a month. Previous to October, 1932. the fees were 200 Marks a year.

Ground Floor.—Class-rooms for the Lower Section, Head-Master's Office, Teachers' Conference Room, Teachers' Private Rooms, Library, Reading Room, Two Gymnastics Halls with Cloak Rooms and Washing Rooms attached.

1st Floor.—Rooms for History and Languages, two rooms for Medical Inspection, Cloak Room, Big Hall, Music Room, three rooms for Biology (Lecture room, a room for practical work and a room for specimens collected by the teachers and the pupils), two rooms for Manual Training.

2nd Floor.—Mathematics, Geography, Physics, Chemistry, Drawing and Needlework Rooms, Radio Room.

3rd Floor.—Physics, Chemistry, Drawing and Needlework Rooms for the High Section.

There are only three class-rooms, these being intended for the Lower Section, viz., Classes VI, V and IV; all other classes work in subject-rooms and not in class-rooms. Each subject-room is equipped with the most up-to-date furniture and teaching apparatus. The Big Hall is provided with 600 seats. Adjoining it and separated from it by a moveable partition is the Music Room. In spite of the small staff of menial servants employed in the school, the building and the furniture are kept spotlessly neat and clean. This is due to the fact that the girls, in whom habits of cleanliness are inculcated from early childhood, are as anxious as the teaching staff that the school should always present a tidy appearance. The school has a big library which is divided into three sections, for teachers, senior students and junior students, respectively.

Behind the school building are spacious grounds which extend as far as the left bank of the river Spree. Part of this open space is taken up with the school garden, where vegetables, flower plants and fruit trees are grown, and part of it is used as a play-ground. On the bank of the river, there is a Boat House belonging to a club, of which most of the senior girls of the school are members.

The Dorotheen Schule, Copenick, Berlin.

BY

S. ALI AKBAR, M. A. (Cantab.)

The Dorotheen Schule is a Girls' Secondary School situated in Copenick, a suburb of Berlin. I had the privilege of visiting this school in September, 1931, and as it is an interesting institution in many ways, I propose in this article to give a brief account of what I saw.

The first thing that strikes a visitor to the Dorotheen Schule is its magnificent building. In Germany, while the State generally pays the salaries of teachers, the municipalities and local bodies undertake to provide the school buildings and school equipment. The building of the Dorotheen Schule, which was completed in 1929, cost the Copenick Municipality 1,715,616 Marks, while an additional sum of 734,384 Marks was spent on its equipment. Only those who know how much Germany has suffered economically after the War can realise what a sacrifice this means in the cause of education.

The new building of the Dorotheen Schule was one of the best specimens of the modern cubist design which I saw in the course of my travels in Europe in 1931. The facade somewhat resembles that of the Dorchester Hotel in London. The straight lines, which are the main features of the building, are relieved by a semi-circular projection in front. This projection is of lower height than the central portion of the building and contains the main entrance and the staircase. The artistically desigued wide windows add greatly to the beauty of the whole structure.

The accommodation is, roughly, as follows:—

Basement.—Rooms for attendants, dining rooms and shower baths for girls, kitchen, laundry room, room for ironing, pools for rowing practice.

burrowing a hole in it. Siva presses down his foot and pins down Ravana in his self-made dungeon. The subject is better represented in the Kailasa cave. According to Havell, it shows Indian sculpture at its best. (Slide No. 29 Bhairava.) Here is Siva represented as the great destroyer. He has several arms and is killing the demons. Parvati is sitting and is looking on. (Slide No. 30, Marriage of Siva). This represents the marriage between Siva and Parvati. The Nandi or Bull which is the vehicle of Siva is seen below. (Slide No. 31, Cave No. 31 Indra). This last slide is that of a Jain cave, known as Indra Sabha. Here is a colossal image, usually known as that of Indra seated on an elephant. There is a tree behind the head and small figures of attendants by the side. The inside of the hall has several fine pillars.

N. B. Mr. Syed Ali Akbar, our popular Divisional Inspector of Schools, was kind enough to ask me to contribute some explanatory notes to enable teachers to use the 31 Slides on Ajanta and Ellora that are available at his office. I have given brief notes. The teachers are requested to refer to the following books for more details :—

1. "Ajanta" by K. H. Vakil.
2. Aurangabad District Gazetteer.
3. Guide to Ajanta and Ellora.
4. "Ajanta" by G. Yazdani.
5. "Historical Sketch" by Wilmott and Bilgrami.
6. Havell's "The Himalayas in Indian Art."
7. do "Ancient and Medieval Architechure."
8. Gopinatha Rao's "Indian Iconograpby."
9. "My Pilgrimage to Ajanta" by Dey.
10. Solomon's "The Women of Ajanta."
11. do "Jottings at Ajanta."
12. Havell's "Indian Sculpture and Painting."

view of one of the caves of the Buddhist group. (Slide No. 21 Cave 10 Exterior). This is the only Chaityaícave at Ellora, known as the Viswakarma cave. The great horse-shoe window of the earlier Chaityas is here cut up into three divisions, with an attic window over the central opening. The inner cathedral contains a huge dagoba, with a seated sculpture of Buddha, 11 ft. high. (Slide No. 22 Tin Thal, outer gallery). This is a three-storied Vihara. Here is one of the large halls, with 8 square columns in front.

Of the Brahminical caves, the most marvellous is that of Kailasa. (Cave 16). It is a great monolithic temple made by quarrying a pit 100 ft. deep, 250 ft. long and 160 ft. broad. Ellora is famous for its titanic sculptures. (Cave 16 Siva, dancing, No. 23). The dance of Siva is a common theme for sculpture. Here is represented one of the several forms of his dance. Cave 21, known as the Rameswara, is another interesting Siva temple. (No. 24 Cave 21 Facade). The pillars are of the Elephanta type, with elaborate carvings.

(Slide No. 25 Cave 21 : Siva dancing). Here is represented another form of dance. Siva is seen dancing. The gods appear in the clouds over his shoulders, riding on the peacock, elephant, ox, etc. His consort, Parvati, with attendants and four musicians looks on below. A small Bhringi is dancing behind Siva's leg. (Slide No. 26, Mahishasuri, Cave 21). Mahishasuri, the goddess, is slaying the buffalo demon. She has her attendants and above are gandharwas. (Slide No. 27, Cave 29 Interior). This cave is known as Sita's chavadi or Dumar Lena. It has a great hall 149 ft. deep and 148 ft. wide. The roof is supported by 26 massive pillars. The cave contains very large sculptures. (Slide No. 28 Ravana shaking the Kailasa). Kailasa is the abode of Siva. He is there with his consort Parvati. The great Demon-king Ravana was passing by. He was forbidden by the servants of Siva to pass by that route. Ravana defies the servants and attempts to shake the mountain by

them shows two women in meditative mood. (Slide No. 12). This represents the renunciation of a Prince and his consort. They are leaving the palace and going to the wilderness to listen to the sermon. (Slide No. 13). The group in this slide shows the flight of gandharvas and apsaras, celestial musicians and dancers. This is "one of the most pleasing of the smaller paintings at Ajanta."

Cave No. 19 is a very elaborately carved Chaitya cave, one of the most perfect specimens of Buddhist art in India, admired for its beauty and for the completeness of its details. (Slide No. 14 Cave 19 Facade). Cave 19 is distinguished by its elaborately carved facade and entrance porch. (Slide No. 15 Cave 19 Front). Here is another view of the front of cave 19 which "is the sculptor's treasure chest." (Slide No. 16, Cave 19 Interior). This illustrates the development of image worship in later Buddhism. The Stupa is not plain, as in the earliest Chaityas. Buddha is standing underneath the arch of the dome. There is another Buddha over the dome. Finally, there is the triple umbrella over the dome tapering towards the roof.

(Slide No. 17 Exterior of Cave 26). Cave 26 is the last of the Chaityas at Ajanta. The entrance porch has been destroyed. This cave is very much more elaborately ornamented than any other. (Slide No. 18, Detail of pillars). These pillars resemble those in Cave 2 and the frieze above is very elaborately carved. (Slide No. 19, Cave 26 Interior). The Dagoba has a broad face in front. In the centre is a Buddha sitting on the lion throne.

We now take leave of Ajanta. Its secrets are "a world asset and an inspiration for all reconstructive endeavour in art, East or West ".

ELLORA.

The caves of Ellora extend over a mile and a quarter and are divided into 3 groups, Buddhist, Hindu and Jain. (Slide No. 20 General view, Cave 9). Here is a general

Cave 1 Interior). Cave 1 contains some of the paintings which have acquired world-wide fame. (Slide No. 5 Cave 1 ceiling). This is a drinking scene of a Persian attended by his wife and servants. Some are of opinion that it represents Prince Khusrau II and his beautiful wife Shirin. (Slide No. 6: The Great Bodhisatva). Of all the frescoes at Ajanta, that of Bodhisatva Padmapani is considered to be the finest expression of Indian Art. Here are represented "all the qualities of youth, high birth, noble character and religious temperament." This lotus-handed Buddha is 5 ft. 9½ in. from crown to a little below the knee. To the left of the Bodhisatva is his consort, a black princess. Says Mr. Yazdani, "The restraint and austerity expressed in the figure of the Bodhisatva and that of his royal consort are delightfully balanced by the mirth and glee of the animal world and the heavenly beings: and the rhythm of this spiritual theme obtains additional grace by a tasteful contrast of colours, the pale green of the foliage merging into the scarlet of the belts of hills and the fresh blues of the bird's feathers and the drapery and jewellery enlivening the dull flesh tints." This picture produces a marvellous effect on the whole.

(Slide No. 7: Cave 2. Verandah). Cave 2 is also a Vihara. It is richly ornamented and we observe in this slide the doorway, window and coulmns. The pillars are richly carved and there is a sculptured frieze. (Slide No. 8 Cave 4 Facade). Cave 4 is the largest of the Viharas. Its colonnade in the verandah is plain and simple. (Slide No. 9 Cave 4 verandah). The interior of this cave is full of remarkable sculptures. "The statue of the Padmapani in the big niche on the right is an example of advanced craftsmanship of the carver."

(Slide No. 10 Cave 17 Verandah). The walls and ceilings of the verandah are full of paintings. (Slide No. 11). Here is a princely couple reclining on a cushion in a palace pavilion, near by, a queen with her attendants. The window over

Ajanta and Ellora

BY

S. HANAMANTH RAO, M. A., L. T.,

Professor of History, Nizam College.

AJANTA.

Ajanta was a "university of creative culture." Its temples and monasteries go back to a period extending from the 2nd century B.C. to the 7th century A.D. Ajanta presents a beautiful landscape to the eye. The spot selected for the excavation of the 29 caves is a quiet and secluded one. In the words of Mr. K. H. Vakil, "the semicircular scarp of rock, nearly 250 ft. high, in which they have been cut, carved and decorated with paintings, the verdant slopes of the rocks opposite and the "sat kund" cascade vivacious at one end of the ravine, terminating at the other as the gentle sinuous Waghora stream, and mimicking the leisurely movement of clouds and the luminious blue of the skies, disclose for them a setting of dramatic intensity irresistable." (Slide 1 View of the Ajanta hill and caves). The view opposite Cave 16 "unfolds the panoramic grandeur of the series of temples and monasteries." (Slide 2: another view of Ajanta Mountain and Caves.) All the caves at Ajanta have been excavated solely for the religious needs of Buddhism. The main caves are of two kinds, Viharas and Chaityas. The Viharas are spacious halls, mainly intended for the residence of monks. The Chaityas or cathedrals contained the relics of Buddha and were used for common worship.

Cave No. 1 is considered architecturally to be the finest among the Viharas of India. (Slide 3 Cave 1: Facade). Its facade is elaborately decorated with sculpture. We enter into a great hall 64 ft. square. All the walls and ceiling were once adorned with paintings. (Slide No. 4

1. Notes of a lantern lecture delivered at the Sixth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association.

having been "ploughed" in the last S. S. L. C. Examination.

4. The S. S. L. C. Committee of the Syndicate of the Madras University has approved the inclusion of Hindi as a second language in the S. S. L. C. Scheme.

5. A Conference of the Elementary teachers of the province was held early in January. Mr. M. K. Sundaravardachariar was the Chairman of the Reception Committee and M. R. Ry. Dewan Bahadur P. T. Kumaraswami Chettiyar presided. The Conference was opened by the Hon'ble P. T. Rajan. A number of resolutions were passed, one of which related to the conduct of their official journal "Arambasiriyan" in Tamil. Mr. M. K. Sundaravardachariar, Headmaster, C. C. High School, Perambur, has agreed to edit the journal. The Conference revealed that in many Elementary schools conducted by local bodies, teachers' salaries were in arrears for long periods ranging from three months to even 12 months.

6. Refresher courses for teachers in Elementary schools were held in Cuddalore and Cannanore. The District Educational Officer, S. Arcot, was largely responsible for the success of the course at the former place, while in the latter it was arranged by the Superintendent of the Government Secondary and Training School for women at Cannanore.

Coorg

A Conference of the All-Coorg Teachers' Association was held at Coorg. There was also an interesting Educational Exhibition. The Conference was presided over by M. R. Ry. A. Rama Rau, I. E. S. (Retired), who also opened the Exhibition. Mr. F. F. C. Edmonds, Inspector of Schools, Bangalore and Coorg, took a keen interest in the Conference and was one of the principal speakers. He spoke on "The Modern Tendencies in Teaching."

The Educational News Bulletin is not the place for reporting incidents in the Coroner's Court. But there is some justification in giving wider circulation to the annoyance exhibited by the Bombay Coroner Mr. B. N. Athavale. It has been his misfortune during the last three years to hold inquiries in the cases of deaths by burns, of young girls—all belonging to the Gujarati community. The primus stove is widely used by women in Bombay and most of them know how to use it. But the Gujarati girls are not pointed out the risk of moving by the side of a lighted stove with loose saries on, and that has caused a number of these sad accidents. The Coroner vented his wrath first on the poor stove and now he is abusing the unfortunate husbands of the poor victims. The right solution will probably be found in schools. Most of the Gujrati girls in Bombay attend school up to the age of 14 and a few lessons each term on the use of the primus stove and precautions against accidents may do a deal of good to the community.

Madras

1. The University Commission appointed by the Andhra University to inspect its affiliated colleges, is visiting the several colleges and is expected to submit its report early in March.

2. The Maharaja of Jeypore has awarded an annual grant of Rupees one lakh to the Andhra University. The question of accepting the grant and introducing suitable legislation was discussed at a Conference consisting of His Excellency the Governor of Madras, the Hon'ble Minister for Education, the Director of Public Instruction and the Vice-Chancellor of the Andhra University.

3. An interesting suit is reported to have been filed in Court of Hon'ble the District Munsiff of Conjeevaram against the Secretary of State for India and the Commissioner for Government Examinations claiming damages for

Almost similar, though not identical, is the problem presented by the administration of Parsee charities. Mr. S. F. Markham was requested by the Ratan Tata Charity Fund to advise them on matters relating to the Parsee community and in his report he says that the huge Parsee charities are only creating professional beggars. Help is extended to a person not because he needs it or deserves it but because he happens to be a Parsee. Communal institutions and charities are helpful up to a stage; beyond that stage they become a curse.

Three schools in the month of December celebrated their jubilees. The St. Columba High School for Girls, conducted by the U. F. C. of Scotland had its centenary celebrations and the American Mission Boys' High School at Ahmednagar and the Nutan Marathi Vidyalaya, a primary school in Poona, celebrated their Gold Jubilees. The rise of this last named institution has been phenomenal and is indicative of the growth of many well-known institutions in the Deccan. Started by half a dozen primary teachers, without any funds, in thirteen years it developed into a full-fledged high school and in twenty more years a first grade college was added to it. Many citizens in Poona to-day have learnt their alphabets in the Nutan Marathi Vidyalaya Primary School and passed their B. A., from the Sir Parashuram Babu College which marks the apex of the gigantic educational structure built up and controlled by the Shikshan Prasarak Mandali, Poona.

The Conference of the Indian Mathematical Association held in Bombay under the auspices of the Bombay University was a great success. His Excellency Sir F. Sykes, the Governor of Bombay, made the opening speech and emphasised the importance of developing a bias for statistics. The President Rao Bahadur P. V. Seshu Iyer deplored the neglect of mental arthmetic. A day was reserved by the organisers for discussions on School Mathematics and that was a welcome innovation.

and inviting the co-operation of parents in the matter. The medical officer concerned helped to clear the issues involved. Much good is expected out of these Conferences.

Bengal

A deputation consisting of Rai Sahib Haridas Govindaswami, Sj. Manoranjan Sen Gupta, Sj. Sachindranath Sil, Sj. Birendranath Roy and Sj. Surendramohan Datta, waited upon the Director of Public Instruction and laid stress on the necessity of retaining the two training colleges, the vocational institutions and of restoration of the 10 per cent. cut.

The Corporation of Calcutta has fixed the following scale of pay to the teachers employed in the Corporation Model Schools.

Headmaster Rs. 80—5—130.
Assistant Headmaster Rs. 60—4—80.
Assistant Teacher Rs. 45—3—90.

The next Conference of the All-Bengal Teachers' Association is likely to be held under the auspices of the Hooghly District Teachers' Association.

Bombay

Speaking to a gathering of the Muslims at Ahmedabad, His Excellency Sir F. Sykes remarked: "I notice that a feature common to most of your requests is the desire to secure communal segregation in education. I fully sympathise of course with your desire to preserve intact the individuality and culture of your community, but I would venture to suggest that in the interests of the future unity of the country it is perhaps possible to press the desire for segregation in education too far." Muslim educationists will do well to consider these remarks, for much of the backwardness of the community in higher education is possibly due to absence of contact with superior intellect in the segregated schools.

were all very well attended. In pursuance of the suggestion of the D. P. I. in his message to the Conference a committee has been appointed (1) to collect and collate information on instruction through the cinematograph and sound films; (2) to establish a subscribers' library of silent and sound films, specially for educational purposes to be shown to students at picture-houses hired for the purpose by the combined efforts of the educational institutions of the larger towns. Another important and significant resolution requests the Board of High School and Intermediate Education to allow for its Intermediate examination the option of answering question papers in subjects except English through the media of Urdu and Hindi. The next Conference will be held at Fyzabad.

Vernacular medium of instruction in the Intermediate—Pt. Malaviya announced at the last Convocation of the Benares University that from the next year (July) instruction in the Intermediate will be imparted through the mother tongue.

Experiments in Benares Circle—We had noticed in previous bulletins that sprouting gram was being supplied to students for tiffin as an experiment and that a special handicraft course was being followed in vernacular schools. Both these experiments have now received the approbation of the Government. The D. P. I. has issued a special circular to all schools in the province recommending sprouting gram tiffin to boys. And the Government of India have published the details of the handicraft experiment in one of their pamphlets. Mr. H. N. Wanchu, M.A., I.E.S., the Inspector of Schools of the Benares Division, deserves congratulation.

Parents and Teachers' Conferences:—Of late there have been organised in almost all important centres conferences between parents and teachers with a view to facilitating exchange of ideas on medical inspection of students

delivered by the Founder of the Association, Mr. D. N. Mukerji, B. Sc., L. T., M. R. S. T., Lecturer, Training College, Agra, was a monumental one. In his address he laid special stress on certain essential reforms, viz., (1) classification of scholars, that is, primary education should end at about the age of 11 plus, and secondary at about 15 plus; (2) that certain subjects ought to be recognised as non-examination subjects and that one examination at the end of primary stage should be considered enough; (3) that Government schools should be turned into educational laboratories rather than carry on the same work which the school managed by private committees are doing.

At the same Conference a veteran educationist, Pt. Manoharlal Zutshi, M. A., delivered what may well be called a message to teachers. His address was very refreshing indeed. His main theme was that schools should be made nurseries of a self-respecting nation. He drew pointed attention to the need for teachers continuing to be learners. Scholars should not be treated as automatons but as human beings with feelings and passions, and reason and will of their own. He showed what opportunities there were for teachers to inculate ideas of national self-respect and to uproot the evil of communalism.

Allahabad University:—The election of Pt. Iqbal Narain Gurtu, M. A., LL. B., as the new Vice-Chancellor was the most notable event in the University last month. He is the second Vice-Chancellor under the new Act, Dr. Ganganath Jha relinquishing his office after nine long years. Mr. Gurtu has long been connected with the affairs of the University. He has long been known as a Liberal Publicist of high integrity, as a first-class debator-councilor, as an educationist of repute and, above all, a man who has dedicated his life to the service of the country.

Agra Conference:—The eleventh session of the U. P. S. E. A. Conference was a grand achievement. The group meetings in History, Geography, Mathematics and Drawing

Extracts from Educational News Bulletin.

No. 13 JANUARY, 1933.

(*Issued under the auspices of the All-India Federation of Teachers' Associations, by the Association of Editors of Educational Journals.*)

The Punjab

All-India Educational Conference :—The prevalence of small-pox in a virulent epidemic form made it impossible for us to hold the Conference on the dates fixed for it, namely, December 27-30, 1932. The All-India Educational Exhibition also had to be postponed. Now it has been decided to hold the Conference, the Exhibition, Display of physical exercises and Scout Craft and the Poetic Symposium with redoubled enthusiasm and eclat during the Easter holidays (April 14-16, 1933). The Exhibition will open on the 13th April, which is a holiday, too.

The session of the All-India Muslim Educational Conference of the Aligarh University and the annual meeting of the Punjab Subordinate Educational Service Association, which were to be held in Lahore during the Christmas week, also had to be postponed to Easter holidays for the same reason.

Convocation of the University of the Punjab :—The Convocation of the University of the Punjab was celebrated on the 23rd December, 1932. Sir H. Suhrawardy, Vice-Chancellor of the Calcutta University, was invited to address the Convocation. Diplomas, prizes and medals were presented by A. C. Woolner Esq., Vice-Chancellor of the University of the Punjab.

United Provinces

XIII Conference of the Non-Gazetted Educational Officers' Association :—The Conference was held at Gorakhpore during Xmas vacation. The presidential address

and duties as such. Unless he is prepared for these in the best way possible, the very existence of the State is in peril. For then, it will be the rule of an irresponsible mob, not the government of an enlightened people.

Hence a training which would enable him to make the right use of his liberties and to be alive to the various onerous duties and responsibilities is quite essential. A knowledge of civics, of modern economic conditions, of international relationships and of the condition of labourers abroad is also necessary. He should be made to realise how by his honest work he contributes not only to the advancement of his own country and community, but also to the general good of humanity at large; and how he depends upon others and how others depend upon him. Thus, with a comprehensive knowledge of things both in his country and abroad, and with a breadth of view and clarity of vision, he will be able to decide whether his object should be merely competition with others or a real desire for excellence—to leave them behind and to surpass them by any and every means or to co-operate with them and to do his best in whatever he undertakes to do.

Besides his duties and responsibilities as a free citizen he has his private life. After the hard work and sweating toils of the day, he has his hours of rest and leisure and hence needs to know how to make the best use of them. Thus the need of useful hobbies which will give the maximum amount of pleasure with the minimum of harm.

His aesthetic side cannot be ignored, otherwise he will lose so much of the human side of life. His tastes, therefore, ought to be cultivated and he should be made to desire and enjoy the right sort of thing and not to be satisfied with what is commonplace.

These, in brief, are the crying needs of the new era, and no system of education can be a success unless it pays proper attention to every one of them.

highest form of culture, the chief qualification of a gentleman. But now the conditions have changed. There is no master and servant in the strict sense of the word. All are workers in a common cause, and every one has to contribute his share to the progress of the community or society to which he belongs. There is so much to learn and so much to do, to achieve even ordinary success in modern life, that one scarcely finds time for idle speculation. No amount of theorising about anything whatsoever, can be of any use to any person nowadays, unless he is prepared to put it into practice in every way he possibly can. Speculation and philosophy have their places but they cannot overstep their boundaries; and in most cases have to be learnt and evolved through the hard work of every-day life. Thus the old order of things has given place to the new and with it should change the ideals and methods of education.

Research in psychology shows that children do not come to school to learn but to do, and that learning ought to grow out of doing. Merely memorising and implicitly believing in whatever is given in books is not of much use. Whatever they learn in books should be confirmed by their practice of it—should be connected with their experience. And as they are going to be future-workers in various positions of life, they ought to be introduced to work in some form or other. They ought to get used to it and be made to like it. Hence the old book schools are no longer useful. Training for mastership is no longer necessary. Every one has to work and to rise through work, and this is what the modern educational system has to take into account. It ought to provide chances for every one to develop freely and that means trying to draw out all the innate and latent capacities.

As we have mentioned above, freedom is in the air and democracy a reality, and every person whether he be a worker in the mines or a labourer on the farm is a free citizen and a responsible member of a commonwealth and has his rights

The New Era And Its Needs

BY

K. M. YUSUFUDDIN, M. A., L. L. B. (Alig.), M. A. (Leeds)
Head Master, Osmania High School, Jalna.

That we have entered upon a new phase of life by the dawn of a new era, is a fact which will scarcely be denied. The modern age has brought a series of intricate problems in its train. Everything is changing. Old ideals seem to be thrown into the melting pot. Religion and time-honoured manners and customs are being ruthlessly attacked. The very foundations of society are being shaken. Things are acquiring new values and are being seen from quite a different view point. The age of mastery and class domination has gone. The age of service and co-operation has taken its place. Labour is acquiring its proper dignity and no sane-minded person looks down upon manual work. As a matter of fact, this conception of labour is regarded as a panacea for the many ills of modern civilization. The days when the workers had to sweat in the narrow dens of factories and live on a mere pittance have almost disappeared. The employer cannot get fat at the expense of his former drudges. He will have to share his profits with them.

Modern life has become a very complex affair, and has brought a series of intricate problems in its train, and no right solution of these is possible unless the system of education which is meant to prepare the future generation to meet them successfully, is so organised as to suit its diverse needs and purposes. This, in other words, means a thorough change in the methods and ideals of education.

The old system was meant to train a dominant class, to train people to become masters and leaders. It was meant for a leisured class with plenty of time at its disposal and which regarded only speculation and philosophy as the

the work should be on broad lines, individualistic, not hide-bound and formal. Variations are immaterial so long as the "all-sided development" of the child continues in a clean, happy atmosphere.

A hygienic Time-table is, of course, a necessity; the concentrative lessons such as number and reading coming early in the day, not following one another but with a relaxation lesson between, while handwork and games of various kinds will fill the later hours profitably without fatigue.

The Kindergarten Teacher.

The teacher in an ideal Kindergarten should be less of a teacher than a guide, or Directrice, as Madame Montessori calls her; she should try to efface herself, to be "a very present help in time of trouble" but not an ubiquitous mentor. Her manner should be bright but gentle, with low voice and quiet movements; orders, when necessary, should be spoken in a clear, distinct but quiet tone, and not repeated; once telling is enough, no shouting, no repetition, being called for in an ideal Kindergarten. Children by instinct copy and imitate those with whom they come into contact: let us see that we give them a worthy model to start them on the road to courtesy, good habits, consideration and pleasant manners, while they are still of tender years.

A great part of the teacher's task is formation of character, a good habit mental, physical, and moral. "As the twig is bent, so is the tree inclined" says the gardener; in the Garden of Children the same is true. Habits are hard to acquire in later life, but easily learnt in childhood; let the little things learn to love purity and kindness, both by precept and example, by the praise of cleanliness in each other, and by the unconscious absorption of freshness, purity and cleanliness from their surroundings.

Thus may be obtained the "sound mind in a healthy body," the "all-sided development," which are the key-notes of an Ideal Kindergarten.

short lengths peeled, and dyed, bamboo rods, nuts, seeds of non-poisonous plants, and brightly-coloured stones, are a few ideas for use in Number work. String, balls of all sorts and sizes, match-boxes, buttons and other domestic articles can be used, and if brought by the children, so much the better.

For teaching Reading, large letters of sandpaper are very useful and easily made, and many reading-games can be made with them and with small words which the children can pin and which are hung onto the objects named on the cards; this sort of lesson gives plenty of physical exercise as well as mental work, and will be found very popular in the lower standards. A large picture or a model of a street, house, garden, or other familiar scene, can be made the basis of more reading lessons by means of the little name-cards, and can be added to as the class progresses; these are only "pointers" to indicate the general lines on which early lessons can be based in order to utilise the child's energy and interest to the best advantage, and to make sensible use of simple apparatus in classes where economy has to be very sternly enforced. An enthusiastic teacher will be able to invent many more games and exercises using the minimum of costly materials and maximum of activity both of brain and body in the pupil.

Sand in small trays or tin lids is an excellent material on which to begin writing; children love the scratchy feel of it under their finger-tips, and it is so cheap, so clean and so easily impressed that it should be used a great deal in the Kindergarten and the lowest class.

Curriculum and Time-table

The Curriculum will vary a little according to the special preferences of individual teachers; while a minimum of time must be devoted to all the necessary subjects, the keen naturalist should spend extra time on the work at which he (or she) is best, the music-lover is likely to devote time to singing and eurythmics rather than to Art, and so forth;

are useful here as in the other room, for storing apparatus.

Pictures are a problem, so few good ones are cheap, so few cheap ones are good; however, given an enthusiastic staff and an artistic talent in one of them, quite satisfactory pictures can be evolved on the scrapbook method—cut out a number of bright suitable figures, flowers and any thing else which will serve to illustrate the story or lesson, or even a number of coloured objects of diverse sorts and stick them in an artistic grouping on large sheets of paper or cardboard, then the artist of the staff (there is sure to be at least one who can sketch in a pleasing background to combine the isolated scraps into a harmonious and attractive picture. This method has been used with great success in making "gardens" from selections of illustrations from seedsmen's catalogues, for instance.

The second room can house a piano, a gramophone, or other musical instrumnets, a doll's house, a little shop, trays of sand, clay, and clayboards, plasticine, boxes of bricks, and any other occupations.

Outside should be washing equipment, basins and jugs, soap and *individual* towels; this precaution against the spread of skin disease is particularly desirable in a poor district.

The apparatus may be of the simplest kind and still achieve its objects in the hands of a skilful teacher; good apparatus never made a bad teacher into a good one, but a good teacher can make even the smallest bit of apparatus useful; the best teachers use whatever is at hand and adapt it to their need of the moment.

Bearing in mind the need for economy, I will suggest only such apparatus as can be made cheaply; there is so much ability to handle materials, among the teachers, many will be able to elaborate such as they need from the simplest materials.

Much apparatus requires no making, only calls for skill and imagination in its use; such things as sticks cut into

skilful use of the time-table, much can be done in two rooms. These rooms should be bright, but free from glare—a south aspect is to be avoided at all costs, it is much too hot and glary. If the rooms open direct into a garden, so much the better, but a garden you must have, and one where the babies can play in safety; part can be short-cut grass, and part gravelled, and flower-beds shaded by trees should be along one end or side, where the children can be personally responsible for a tiny plot sown with quick-growing plants. The garden can be utilised for Games, Dramatics, Nature-study and free play, and in awed observation of natural wonders the child absorbs unconsciously a spirit of love and kindness, of reverence for the marvels of the so-called Lower creation, which matures into a respect and admiration for all living creatures; on no account forego your garden, however small it may have to be. The classroom should contain several low cupboards with doors opening very easily, and in these cupboards the smallest child can put away its own toys, apparatus and materials, thus early learning the habits of neatness and self-reliance. "A place for every thing and every thing in its place" should be the motto in the Kindergarten as elsewhere.

The room where the more formal work is carried on should have in it a number of small, light desks and tiny chairs. So light that the children can carry them about; desks with seats attached are less useful, as they are beyond the capacity of the little ones to move and inflict a rigidity of position which is to be deprecated as contrary to the spirit of freedom which should instil happiness and orderly disorder from activity of body as well as of mind.

Other furniture must include a large blackboard, chair and table or desk for the teacher, and if possible, a freize of blackboard-cloth round a good portion of the walls; this is for free-arm drawing and occupational work. A clock with bold Arabic figures, and plenty of pictures in gay but artistic colours, complete the essential furniture, but low cupboards

they have made untidy. There is joy, not dislike, in doing these simple, useful bits of work. Children love to help, to imitate, and to know what they are doing really helpful work.

In one rather large Primary class in an English school, every child had a special task assigned to him or her, the teacher was able to begin setting up the work on the blackboard as soon as she had handed the keys of the cupboard to the monitor (aged nine). Books were given out, pens and pencils handed round to their proper owners, clocks wound, ink-wells filled, windows opened, temperature noted and written up, desks and table dusted, flowers watered—in short, everything necessary for a smoothly-working class was carried out by the children, none of whom was over the age of eleven, and none of whom had previously done such work. The whole business was completed and the class in their places, within four minutes of the teacher's giving out the keys. A rather touching sidelight on the children's delight is this excerpt from a "letter to a friend" written as a composition: "She gives us all a job to do expect (sic) me what was away when she gives them all."

Such diverting of a child's superabundant energies into useful channels does not stultify the pretty fancies which are the birthright of every child; it "makes the child fit to live with," which is Bertrand Russell's definition of the aim of education.

From theorising, let us descend to practical suggestions.

Kindergarten Building and Equipment

I am bearing in mind the fact that teachers in many schools have little in the way of elaborate apparatus and less in the way of funds, so if these suggestions appear inadequate, it is because scope is often inadequate too. A kindergarten section should consist of at least two rooms, one for free expression and one for collective work. More than two are useful, but to describe the unattainable ideal is of little help, and by

with the practical training: is there not room for both in our schools and in our minds? Frobel's Gifts can be used, and their mystical underlying message ignored; his occupations purged of their formalism, can be sources of great pleasure by their appeal to the child's imagination. Montessori's sense-training can gain, not lose, by a touch of "make-believe."

It is useless to deny that imagination plays an enormous part in the daily life of a child: is it so pernicious, then, that we should strive to eradicate it from his nature? I think not. Many an irksome little task will take on a glamour if invested with a touch of romance; even the best-brought-up child in a Montessori school will, if left to himself, among the severely practical Apparatus, give free rein to an abundant imagination and invest them with a joyous appeal which their originator never intended. The Colour-spools make very good trains, houses can be built from the cubes of the Tower, and excellent weapons for mimic battles are at hand in the component parts of the Long Stair. (*I know.*)

Certainly there is a strong argument in favour of making children early familiar with every-day useful habits; this is more true of Europe and America than of India, owing to the shortage of household servants in the former countries, where a middle-class mother has rarely more than one servant, and a child incapable of helping itself in little ways is indeed a trial; but it is so very good for the child's character to be a little independent of servants or parents, that it seems a pity not to inculcate an independent spirit, even though here there is not the same economic necessity as in some other lands. Even in the lowest class of a school, the tiny ones can learn to employ themselves usefully and happily in handling common domestic and personal equipment. They should be able to wash hands, button coats, put on and take off shoes and hats, carry small jugs and dishes, dust and neaten desks, and tidy a room which

neither useful nor beautiful when made: paper-cutting models of unsuitable objects, paper-weaving, bead-work (not bead-*threading*, that has its uses) fret-work, "fancy-work," all shewing the worst influences of Late-Victorian interpretations of ideals given to the world by a genius. On these occupations do Indian children waste their ability, an ability second to none, I believe, if directed wisely towards handwork worth doing. Froebel never meant his occupations to be mere time-wasting pursuits; there was an underlying principle, of which too many have never thought at all, beneath even the formal, almost silly work which was the best the educators of that day could offer, the principle that all impression needs expression.

Comparison of Froebel and Montessori

Froebel and Montessori, to name the two chief exponents of the kindergarten as we know it, are poles asunder in method, aim and ideals; the binding link is the love of little children, which has been a characteristic of great teachers of all the ages.

Where Froebel is mystical, Montessori is practical and utilitarian: Froebel presents may of his activity plays under a guise, he plays upon the child's imagination; Montessori, on the other hand, briskly refuses "to fill the child's head with nonsense." Mysticism having no commercial value, the pendulum has swung, in this materialistic age, to the other extreme, and practical qualities, mental, physical and moral, hold place over fantasy: it is the engineer rather than the poet, the factory hand before the dreamer of dreams.

Well, if practical training by itself be the best method of fitting the child of to-day for the battle of life tomorrow, let us continue to be severely practical, *but*

"What is this world but full of care,
"If we have no time to stand and stare?"

Asks W. Davies.

Surely, an ideal Kindergarten will combine fantasy

fragments of coloured paper, most of them so small as to require manipulation with tweezers rather than even the most careful fingers. The finished piece of work was "pretty"(?), the educative value, nil; the work itself, a useless strain on eyes, hands, and temper.)

Montessori

Fortunately, by the beginning of the twentieth century, many educationists had begun to realise how far this sort of thing was from the original conception of kindergarten ideals, and began to seek a remedy. As so often happens, the hour produced the man but in this instance the man was a woman! Dotoressa Maria Montessori, an Italian of good education, having taken a medical degree, began to specialise in work with mental defectives, particularly defective children. Being of an inventive turn of mind, she evolved little games and tasks within the feeble comprehension of her young patients, and finding these very successful in arresting mental atrophy, perfected her inventions of apparatus and games, and tested them with normal children. From the first simple tasks and occuptations which Madame Montessori set before her lunatic patients has evolved the ingenious and complicated Sense-Training Apparatus, known all over the world, which sets out to fit the young child for life in the community.

Very unfortnnately, it is only too apparent that the revivifying effects of the educational changes in and after 1902, have made little impression on Indian Primary education. Kindergarten methods must have been introduced into India at their worst, their lowest ebb, and slavishly followed. One has only to visit the average Primary School (and too often the High School has followed suit) to see such productions as *might* have caused great-grandmother to weep tears of joy, but which move a modern educator nearly to tears of wrath! Masses of material wasted, time wasted, ability, even talent, wasted on making objects which are not educative in their construction,

Though, as previously remarked, Froebel was somewhat unpractical, he was remarkably methodical, and the connecting thread of an idea runs through each of his schemes, whether language-training, handwork, or other subjects, with regular continuity. His gifts, I to XV, had each the quality of "being complete in itself, yet foreshadowing the succeeding, and embodying the preceding, gifts." This assertion may be true, it is Froebel's own, but it needs unusual discernment to follow entirely the continuity. Similarly, the occupations were each intended "to teach something new, to revive that already taught, and to prepare for the subsequent." So far has modern thought advanced, with our knowledge of child psychology, that many of Froebel's schemes now fall into the category of "formal" or even "useless," but when they were presented to the educational world of the day, they created a sensation by their liberalism. He was the pioneer of educative handwork, of school physical training, of expression work, of dramatising as a means of self-expression, and impression, of elementary art training, of joy in doing and making and he deserves the title of The Father of Modern Education.

But as a family progresses, sons improving and altering the work begun by their father, so the Kindergarten has progressed beyond the ways of its originator. For some years, in Europe and in America, Froebel's principles were rigidly followed, then divergences and changes took place when one branch of students stressed certain points and another others, till the true spirit was over-shadowed, and a rot, a mortification, set in where had been garden freshness. Late Victorianism set the seal of its approval on kindergarten occupations, and a sorry mass of "pretty," useless, non-educative handiwork was produced under the title of "Kindergarten." (About 1894, a young student of Kindergarten methods in one of the large training colleges had to make "mosaics" which Art occupation consisted in fitting into a complicated and unlovely pattern, upwards of 200

point: How many of us have suffered in spirit with little Paul, the "son" of "Dombey and Son" in reading of Dr. Blimber's "Academy for young gentlemen" where this poor child, scarcely out of babyhood, learned Latin Grammar, the use of the globes, and other dry-as-dust subjects? We may be sure that Dickens had in mind some actual establishment when he thus described Dr. Blimber's school. Again, a report by one of H. M. I. on an Infant School in London (circa 1872-3) contains this remark, "The mental arithmetic of the Lower Infants is definitely weak." The Lower Infants (Heaven help them) were under five years of age, and there were sixty or even more in the class. Now for an excerpt from another H. M. I.'s report on an Elementary school in 1920: "The informal and happy atmosphere has enabled the children to develop their own individuality to an unusual degree." (This was part of the report on the Infant Department, of which I was in charge).

Childhood owes more to Froebel than the world at large realises, but there were other worthy pioneers whom we must not forget; Locke, even in the eighteenth century, drew up a treatise on the education of a child, which contains much of value in its suggestions, but being intended for a tutor of one, or at the most two children, it is of little use to a class-teacher in school. Rousseau also had revolutionary ideas as to what type of education best suited a child for life, but he again dealt with an individual, not with a class or group. (Who can forget Emile, and the little after-thought, Agnes?) Pestalozzi, pathetic failure of a school-master, glorious martyr to his humanitarian ideals, had, prior to Froebel's activities, opened a school for the very dregs of childhood, pauper orphans, illegitimate peasants, and other waifs, whom he taught, fed, and housed by his own, almost unaided efforts. But to one of Pestalozzi's home came young Froebel, and taught accepting no salary, for some two years, before he evolved his ideal school, his Kindergarten.

Kindergartens[1]

BY

MISS A. TYLER

Head-Mistress, Model Primary School, Hyderabad Deccan.

Froebel

When Freidrich Froebel called his school for young children their garden, it needs little imagination to realise that he intended the name to indicate everythying which is fresh and sweet and wholesome. What is lovelier than a garden, in that beautiful part of Germany where Froebel lived? And what more fitting dwellers in a garden than children, whose freshness and innocence are so great a charm all over the world? Francis Bacon wrote "GOD Almighty first planted a garden, and indeed it is the purest of all pleasures." The purity of that "pleasure" is surely a fitting environment to the unsullied nature of a young child.

Froebel was a visionary, an idealist, as were so many of the Old Germans, and moreover he was unusually sensitive and sympathetic where children were concerned, his own early years having been embittered by the veritable cruel stepmother of the fairy tales. When he grew to manhood, he set himself the task of making other children happier than he had been, for he retained vivid recollections of the grief of his own infancy, and strove to prevent a repetition of his childish sorrows in others.

Like many an idealist, he was rather unpractical, so that many of his suggestions proved neither useful nor possible to carry out, nevertheless his humanitarian principles had a very far-reaching effect on children's education. One need only compare the general pre-Froebelian atmosphere with that accepted to-day almost universally as suitable and indeed necessary, in order to evaluate properly Froebel's influence. One or two examples will suffice to illustrate the

1. *Kindergarten.*—Children's garden, a garden of Children.

they must be artistically coloured. They must be like the object, otherwise the child gets a wrong impression, which is very difficult to correct later.

Rhythm also is a most important factor in the Kindergarten. Every child has an inborn tendency to rhythm, and to Indian children especially, rhythm should come naturally. Of course, it would be ideal to have a piano and a gramophone in the schools, but those schools which could not afford to have either, could do much in the way of rhyhmtic poetry. The school with a piano could teach the Dalcroze methods of beating time. They could have a Band with triangles, drums, bells, etc. The children could be taught to appreciate good music, both Oriental and European. Their ears could be trained to sound and expression i. e. loud and soft, merry and sad and so on.

Children, above all, love to play at real life. If it is possible to have a model shop or a Doll's house, a model train or a motor car, many games could be arranged involving a number of practical problems, in the solving of which much work could be done by the child. This is an education in itself. Finally, the children must be encouraged to talk. The Kindergarten should be a happy home with the master as a kind, but on occasions, firm friend. Indian children in school are so quiet and reserved. Perhaps they are awed by the presence of their teachers, this is probably because their teacher talks and does not give the child the opportunity of doing so. The child can only understand by doing, not by learning. The successful Kindergarten teacher is one who can forget he is a teacher, one who can come down to the child's level and see life from the child's point of view.

before they are children. The Kindergarten must teach these children to be children, they must learn to play. Parents who overhear this remark will say, "Play! my son can play at home, I send him to school to learn." "Be patient, parent, and I shall try and explain how your son through play will learn many lessons such as you wish him to have.

Through play, the child develops his senses and thus learns his capabilities. Montessori has done much in the way of sense-training apparatus to develop the senses of touch, sight, and sound. For instance, there is colour matching apparatus, an apparatus that teaches shape and proportion—many that will be known to those of us who have read Dr. Montessori's book. The object of having this apparatus is to develop the larger muscles of the body before developing the smaller muscles. Just as a baby learns to stand and then walk before he runs, so a child must learn to manipulate and control his muscles before he can write or draw. Although Montessori's apparatus is excellent, neither Froebel's gifts nor Montessori's Sense-Training Apparatus is enough. The Kindergarten teacher must invent his own apparatus. The child wants variety; he soon grows tired of the same thing day after day, just as we do ourselves.

Every child has a vivid imagination, and the teacher can make use of his gift of story telling and so convert the school room into a jungle or a Fairy Palace, just whatever setting the story demands. Every day there should be a definite story-telling time, and in connection with it there should be expression work. Either the children act the story, or they draw a picture; sometimes, they could do clay modelling or paper cutting. These stories must be carefully chosen and be told in the vernacular of the school.

Pictures play a great part in the life of the young child. He learns far more from pictures studied in his leisure time than whole weeks of dull lesson books. Pictures to be of use in teaching must be simple, illustrating the point, and

The Child Below Six

BY

MISS M. E. READ,

Head Mistress, Primary Department, Madrasae-Aliya

In Hyderabad Dominions to-day there are no fewer than 4052 Primary Schools. This means that roughly 240,508 boys and girls are attending school regularly, a certain small percentage of whom will reach School Leaving Certificate Standard, and a still smaller percentage will eventually go to Universities. In spite of the number of schools throughout the Dominions, there is a lack of a particular type of school, namely, the Kindergarten.

The question arises, on which Mr. Philip asked me to speak to-day, " What is to be done with the child below the age of six years ?" These small people are too young for the routine work of an ordinary school. It is bad for their health to be made to sit still for any length of time, above all, they should not be doing book work at this age ; the eye strain is too great for them, as the smaller muscles of the eye have not yet been developed. How many Indians do we see wearing spectacles ? A great many you will admit ; and if it would only be realised how important are the first years of a young child's life in a school, the health and physique of the community would benefit.

This is where the Kindergarten steps in. As I have just said, these early years of a child's life are the most important of all. They make or mar him for life, so he must be watched carefully in his work and in his play. At this stage character training plays an important part in his education. The work of the Kindergarten is, firstly, teaching the child how to live. True education, as Froebel said, is " Life." Many small Indian children grow up so rapidly that they skip a stage of their lives, and become grown up

1. A speech made at a recent meeting of the St. Georges Grammar School Branch of the Hyderabad Teachers' Association.

THE HYDERABAD TEACHER

CONTENTS

PAGES.

THE CHILD BELOW SIX
BY MISS. M. E. READ, ... 116

KINDERGARTENS
BY MISS. A TYLER. 119

THE NEW ERA AND ITS NEEDS
BY K. M. YUSUFUDDIN, M.A., LL.B. (Alig.) M.A., (Leeds.) 130

EXTRACTS FROM EDUCATIONAL NEWS
BULLETIN 133

AJANTA AND ELLORA
BY S. HANUMANTH RAO, M. A , L. T. 140

THE DOROTHEEN SCHULE COPENIC, BERLIN
BY S. ALI AKBAR, M. A. (Cantab) 145

THE PROBLEMS AND NEEDS OF BOYS
LECTURE BY DR. TRACY STRONG 153

THE HYDERABAD TEACHERS' ASSOCIATION
General Secretary's Report for the Quarter 157

ADDITIONS TO THE TEACHERS' LIBRARY 158

EDITORIAL 160

Vol. VII. REGISTERED ASAFIA No. 47. No. 3.

THE HYDERABAD TEACHER

Quarterly Magazine of the Teachers' Association,
Hyderabad-Deccan

Under the Patronage of
Khan Fazl Mohamed Khan Esq., M. A.,
Director of Public Instruction.

JANUARY-MARCH 1933

SECUNDERABAD-DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.

1933.

Annual Subscription Rs. 3.

Vol. VII. No. 3.

THE HYDERABAD TEACHER

JANUARY-MARCH 1933

SECUNDERABAD-DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.

1933.

جلد (۷) شمارہ (۴)

زیر سرپرستی جناب خان فضل محمد خان صاحب ایم۔ اے ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مجلس ادارت:۔ سید علی اکبر ایم۔ اے (کنٹب) مدیر مسئول
سید فخر الحسن ملا بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) مدیر
محمد عبد الغفور صدیقی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) شریک مدیر

مقاصد

(۱) طبقۂ اساتذہ کے احساس علمی کو بیدار کرنا۔

(۲) طبقۂ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات علمی کو شائع کرنا۔

(۳) فن علمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔

(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت

(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

قواعد

(ا) رسالہ کا نام حیدرآباد ٹیچر ہوگا اور سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا۔

(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔

اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی تین روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ)

صرف اردو حصہ (عہ) سالانہ قیمت فی پرچہ اردو انگریزی ۱۲/ صرف اردو ۸/-

(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہوسکے گا۔

(د) صرف وہی مضامین درج ہوسکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔

(ہ) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہیئے۔

(و) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت نذا رہے گا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	۵	صہ	سے/
نصف صفحہ	صہ/	عہ ۱۲/	عہ ۸/
ربع صفحہ	عہ ۸/	عہ ۶	۱۵/
فی سطر	۱۰/	۸/	۶/

اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن میں طبع ہوکر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر مہتممی تعلیمات بلدہ سے شائع ہوا

حیدرآباد ٹیچر

بابتہ خورداد ۱۳۴۲ ف م اپریل ۱۹۳۳ء

جلد (۷) شمارہ (۴)

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	جگنو	جناب ناظم صدیقی صاحب	۲
۲	فروبل اور کنڈرگارٹن (۱)	جناب سید نورالحسن صاحب بی، اے، بی، ٹی (علیگ) ڈپ۔ اینڈ۔ سی۔ بی (گلاسگو)۔	۹
۳	تعلیم دینیات	جناب مولوی عبدالقدیر صاحب ناظر تعلیمات علاقہ کھم و معتمد کمیٹی تعلیم دینیات صوبہ ورنگل۔	۱۴
۴	زمانہ حال کے تعلیمی رجحانات	جناب اے، آر، واڈیا صاحب بی، اے، بیرسٹر ایٹ لا پروفیسر فلسفہ۔ میسور یونیورسٹی۔ مترجمہ حفیظ اللہ میر صاحب بی۔ اے	۲۱
۵	تنقید و تبصرہ (۱) جدید اردو شاعری۔ (۲) آدنامہ سی نفطی۔		۲۶
۶	شذرات		۲۷
۷	فہرست کتب موجودہ بہ کتب خانہ انجمن اساتذہ بلدہ		۳۱
۸	تعلیم ریاضی	جناب ڈی۔ سی۔ بھوگلے صاحب بی اے بی ٹی	۷۔۵۔۲ / ۳۷۔۵۲

جگنو

از
جناب ناظم صدیقی صاحب بی، ایس، سی

برسات کی تاریک مگر خوشگوار راتوں میں پانی کے کنارے ہری ہری گھاس پر یا سرسبز جھاڑیوں میں کرمکِ شب تاب کے جگمگاتے ہوئے چراغ آسمان کے جھلملاتے ہوئے تاروں سے کہیں زیادہ پُرکیف اور دلفریب ہوتے ہیں۔ یہی دل چاہتا ہے کہ بس خاموش بیٹھے قدرت کے اِس عجیب وغریب نورانی حُسن کے جلوؤں کی سیر کیا کیجئے۔

جب کوئی بھولا بھٹکا جگنو اتفاق سے کسی گھر میں آنکلتا ہے تو آنکھیں بے اختیار اِسکا تعاقب کرنے لگتی ہیں۔ بچے اُسے دیکھکر کسقدر محظوظ ہوتے ہیں جوشِ مسرت میں تالیاں بجاتے ہیں اُسکے پیچھے بھاگتے ہیں اور اکثر اُسے پکڑ ہی لیتے ہیں۔ کوئی اسے اپنے کرتے کے دامن میں لپیٹ کر قدرتی نور کی چمک دمک سے خوش ہوتا ہے اور کوئی اپنی کتاب کے ورق پر چھوڑ کر اُس کی روشنی میں حروف پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن جب ایک محقق کی متجسس نگاہ اس پر پڑتی ہے تو وہ قدرت کے اِس اسرار کی تحقیق میں منہمک ہوجاتا ہے سیکڑوں تجربات کرتا ہے۔ عجیب وغریب مشاہدات ہوتے ہیں۔ اور بالآخر رموز قدرت کو منظر عام پر لاکر حقیقی مسرت حاصل کرتا ہے۔

چنانچہ ۱۶۶۷ء میں رابرٹ بائل (Robert Boyle) نے اُس حیوانی نور کی ماہیت اور اصلیت دریافت کرنے کے لئے نورانی مچھلیوں اور بوسیدہ لکڑیوں وغیرہ پر مختلف تجربات کرکے یہ ثابت کیا کہ ہوا کی غیر موجودگی میں روشنی کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ گویا روشنی تکسید (Oxidation) یا احتراق کے فعل سے پیدا ہوتی ہے۔ اِس کے بعد ۱۷۹۴ء میں

ایک اطالوی مشہور محقق اسپلنزانی نے چند نورانی لعابی مچھلیوں (Jelly Fish) کو خشک کرنے کے بعد اُن کو پانی میں ڈالا تو اُن مردہ مچھلیوں سے ویسی ہی روشنی نکلنے لگی جیسی کہ زندہ مچھلیوں سے نکلتی تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ روشنی ایک کیمیائی عمل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جانور کی زندگی سے اسکا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان واقعات اور معلومات کو مدنظر رکھتے ہوئے ۱۸۸۵ء میں ایک فرانسیسی ماہر حیاتیات مسٹر ریفل ڈوبے نے ایک بڑا دلچسپ تجربہ کیا۔ اُس نے گھونگے کی قسم میں سے ایک نورانی جانور کی چمکدار بافت (Tissues) لیکر ٹھنڈے اور گرم پانی میں اس کے دو محلول تیار کئے جب ان دونوں میں روشنی گل ہوگئی تو اس نے اُن کو ایک جگہ ملایا۔ جس سے روشنی پھر نمودار ہوئی۔ چنانچہ اس تجربہ کی بنا پر اُس نے یہ ثابت کیا کہ ایک مُکسِد مادہ (Oxidising Substance) جو گرم کرنے سے ضائع ہو جاتا ہے دوسرے مادے پر عمل تکسید کرتا ہے اور اس سے یہ روشنی پیدا ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ روشنی گل کیوں ہوگئی تھی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹھنڈے پانی کے محلول میں وہ مادہ جس کی تکسید ہوتی ہے صرف ہو چکا تھا لیکن مُکسِد موجود تھا اِسکے برخلاف گرم پانی کے محلول میں حرارت کی وجہ سے مکسد ضائع ہو چکا تھا اور دوسرا مادہ موجود تھا چنانچہ جب محلولات کو ملایا گیا تو عمل تکسید پھر شروع ہو کر روشنی کا باعث ہوا۔

ڈوبے کے اِن تجربات پر پروفیسر نیوٹن ہاروے نے مزید تحقیق و تدقیق کے بعد یہ نظریہ قائم کیا کہ روشنی پانی اور آکسیجن گیس کی موجودگی میں دو مادّوں کے باہم عمل پیرا ہونے سے پیدا ہوتی ہے اُن میں سے ایک لوسی فریس (Luciferase) ہے جو بطور مکسد عمل کرتا ہے اور دوسرا لوسی فیرن (Luciferin) ہے جسکی تکسید ہوتی ہے۔

اِس قدر معلومات بہم پہنچنے کے بعد ۱۹۲۷ء میں فیراڈے نے جگنو پر متعدد دلچسپ تجربات کر کے یہ معلوم کیا کہ حیوانی نور میں حدت نہیں ہوتی۔ یہ نور قدرت کا ٹھنڈا نور ہوتا ہے۔ اگر ایک جگنو کو ہاتھ یا نیچے کے ہونٹ پر جو بدن کا حساس ترین حصہ ہے بٹھایا جائے تو گرمی کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا۔ نیز یہ کہ اس روشنی میں تحتِ سرخ (Infra-red) اور بالا بنفشی (U. Violet) شعاعیں نہیں پائی جاتیں۔ تاہم اس میں اور معمولی روشنی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اگر بہت سے جگنو پکڑ کر شیشے کے ایک ہوادار برتن میں رکھے جائیں تو اُن کی روشنی میں بخوبی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ نور بالکل معمولی نور کی طرح عمل کرتا ہے۔ عکاسی کی تختی پر اثر آفریں ہوتا ہے مختلف اشیاء میں تز ہتزّ (Fluorescence) اور عارضی تز ہتزّ (Phosporescence) بھی پیدا کرتا ہے

چھوٹے چھوٹے پودوں کی نئی اور نازک کونپلیں اُس کی طرف ایسے ہی جھک آتی ہیں جیسے کہ سورج کی روشنی کی طرف۔ یہ نورِ خضرہ (Chlorophyll) کی افزائش کا بھی ممد ہوتا ہے۔

قدرت کا یہ ٹھنڈا نور تمام مصنوعی روشنیوں سے ارزاں ترین ہے کیونکہ یہ حرارت کے ذریعے سے پیدا نہیں ہوتا اور نہ خود اسکا کوئی حصہ حرارت کی صورت میں صرف ہوتا ہے۔ اکثر تجربات سے دریافت کیا گیا کہ موم بتی کے شعلے کے لیئے جس قدر توانائی درکار ہوتی ہے جگنو کی چمک میں دستِ قدرت اسکا صرف ۱/۰۰ حصہ صرف کرتا ہے اور اُس میں بمشکل ۱/۱۰۰۰ درجے مئی حرارت پیدا ہوتی ہے۔

اِس عجیب و غریب روشنی کے متعلق بعض محققین کا یہ بھی خیال ہے کہ جگنو کے خون میں ایک قسم کا مخمر مادہ ہوتا ہے جو چمکدار حصے کے خلیوں میں روشنی پیدا کرنے والے مادہ پر عامل ہوتا ہے لیکن بعض اس نظریہ کی تائید نہیں کرتے اُن کی رائے میں نورانی حصے کے اندر منور جرثومے (Luminous Bacteria) کا اجتماع ہوتا ہے اور اُن کی وجہ سے روشنی نکلتی ہے۔

جگنو حشرات کی قسم میں "غلاف بازو" یا غلاف دار پروں والے کیڑوں کے خاندان سے ہے اُس کے جسم پر ایک سخت پوست ہوتا ہے جو مختلف حلقوں سے ملکر بنتا ہے یہ حلقے دونوں پہلوؤں پر جڑے ہوئے ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے کیڑے کو اپنا جسم موڑنے اور حرکت کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا اِن حلقوں کی جوف کے اندر کیڑے کے نرم اعضا، رگیں اور اعصاب وغیرہ ہوتے ہیں۔ اور باہر کی طرف بازو اور ٹانگیں وغیرہ۔ جگنو کا تمام جسم تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے

حساس بال
آنکھیں سر
میان سینہ
پیش سینہ
آخر سینہ
ٹانگیں
منور نقطے
شکم

جگنو کا نقشی خاکہ
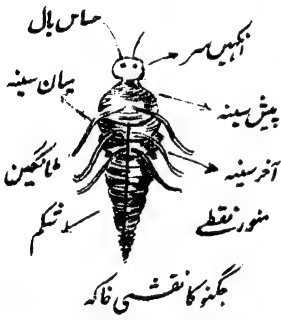
(۱) سر (۲) سینہ (۳) شکم۔ پہلا حصہ یا سر سخت پوست کے صرف ایک حلقے سے ڈھکا ہوا ہوتا ہے اس حصے میں نیچے کی جانب منہ اور سر کے دونوں طرف آنکھیں ہوتی ہیں اُن کے علاوہ سر پر دو چھوٹے چھوٹے حساس بال بھی ہوتے ہیں۔ سر کے پیچھے سخت پوست کے تین حلقے سینہ کہلاتے ہیں جو بالترتیب پیش سینہ، میان سینہ، اور آخر سینہ کے نام سے موسوم ہیں۔ اِن تینوں میں سے ہر ایک میں نیچے کی طرف دو دو ٹانگیں ہوتی ہیں۔ اُوپر کی طرف اُن میں سے پہلا حلقہ یعنی پیش سینہ خالی رہتا ہے دوسرے حلقے میں دو بہت موٹے اور سخت پر ہوتے جو جسم کے ساتھ چسپاں رہتے ہیں یہ پر تیسرے حلقے میں لگے ہوئے دو نرم و نازک پروں کے لئے غلاف کا کام دیتے ہیں۔ نیچے کے دونوں پر جو بڑے بڑے

سخت بازو

پرواز کے بازو سخت بازوؤں کے نیچے چھپے ہوئے

سخت بازو
پرواز کے بازو

اور باریک ہوتے ہیں اُوپر کے سخت پروں کے اندر لپٹے ہوئے رہتے ہیں۔ یہ پر پرواز کے کام آتے ہیں۔ اُوپر کے سخت پر آرام کی حالت میں کیڑے کی کمر کے وسط میں ایک خط مستقیم پہ ملتے ہیں۔

سینے کے بعد کے آٹھ حلقے شکم کہلاتے ہیں۔ اُن میں سے ہر حلقے میں دونوں جانب اور اُوپر وسطی خط پر ایک ایک باریک سوراخچہ ہوتا ہے جو 'منافس' کہلاتا ہے۔ ان کے علاوہ شکم میں دو تین حلقے اور بھی ہوتے ہیں جنہیں دم کہنا چاہیئے۔ روشنی کا سامان اُن ہی آخری تین حلقوں میں نیچے کی سطح پر ہوتا ہے۔

جگنو اکثر گھونگے وغیرہ کھاتا ہے۔ لیکن اسکا کھانے کا طریقہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں جب گھاس کی پتی پر کوئی گھونگا لٹکا ہوا نظر آتا ہے تو پہلے جگنو اس کے جسم میں ایک قسم کا زہریلا مادہ داخل کر دیتا ہے جس سے گھونگا مرتا تو نہیں لیکن بیہوش ہو جاتا ہے۔ اسی حالت بیہوشی میں گھونگے کا جسم زہر کے اثر سے رفتہ رفتہ تحلیل ہو کر پیچ کی طرح رقیق ہو جاتا ہے۔ تب جگنو اُسے بطور غذا استعمال کرتا ہے اور گھونگے کا سخت پوست گھاس کی پتی پر لٹکا رہجاتا ہے۔

دیگر حشرات کی طرح جگنو کی سرگزشت طبعی میں بھی چار مختلف حالتیں پائی جاتی ہیں۔ اول انڈے کی حالت دوسرے پہلروپ (Larva) تیسرے منجھروپ (Pupa) اور چوتھے جگنو بحالت بلوغ Imago

مادہ جگنو بالعموم زمین پر انڈے دیتی ہے اور اپنی اگلی ٹانگوں سے اُنہیں تھوڑی سی مٹی سے ڈھک دیتی ہے بعض اوقات یہ بھی مشاہدہ ہوا ہے کہ انڈے دینے کے لیئے خود مادہ زمین کے اندر گھس جاتی ہے اور انڈے دینے کے بعد پھر باہر نکل آتی ہے انڈے کے مادے میں ضروری تغیر و تبدل واقع ہو کر پہلروپ بنتا ہے اسکے انڈے سے باہر نکلنے سے قبل انڈا منور ہو جاتا ہے۔

موسم برسات میں اکثر دن کے وقت جگنو کے پہلروپ گھاس کے پتوں وغیرہ پر رینگتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اُن کا منہ ایک دوشاخے چمٹے (Forked Sucker) کی طرح ہوتا ہے۔ اور دُم کے نیچے دو چھوٹے چھوٹے چمکدار نشانات ہوتے ہیں۔

مسٹر فلورینس۔ ایم۔ برومٹ (Florence M. Brummitt) نے جگنو کے چند پہلروپ کی حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ایک مضمون میں تحریر کیا ہے کہ جگنو کا

پہلروپ گھونگے کھاتا ہے۔ پہلے یہ اپنا چُسنا ایکدم گھونگے کے گوشت میں گھسا دیتا ہے۔ لیکن تکلیف کی وجہ سے گھونگا فوراً اپنے خول کے اندر گھس جاتا ہے۔ تب یہ کرم رینگ کر اُس کے خول کے اُوپر چڑھ جاتا ہے اور تاک لگائے بیٹھا رہتا ہے تھوڑی دیر کے بعد جیسے ہی گھونگا پھر باہر نکلتا ہے یہ اُس کے سر کی پشت پر دوبارہ چُسنا چبھوتا ہے اور گھونگا پھر اندر گھس جاتا ہے اِسی طرح چند دفع کے بعد گھونگا بیہوش ہو جاتا ہے۔ کیونکہ گھونگے پر حملہ کرتے وقت پہلروپ اپنا چسنا چبھانے کے علاوہ اُسکے جسم کے اندر ایک قسم کا زہریلا مایع بھی داخل کرتا ہے اسی کی وجہ سے گھونگا بیہوش ہو جاتا ہے اور حالت بیہوشی میں اسکا گوشت زہر کے اثر سے تحلیل ہو کر رقیق پڑ جاتا ہے۔ اُس کو پہلروپ اپنے چسنے کی مدد سے چوس لیتا ہے۔ چنانچہ کرم مذکور کے شکم سیر ہو کر چلے جانے کے بعد صاحب موصوف نے گھونگے کے خول کا مطالعہ کیا تو باقی ماندہ گوشت کو پیچ کی طرح نرم اور رقیق پایا خول کو اُٹھا کرنے سے گوشت ایک لزج مایع کی طرح ٹپکنے لگتا ہے۔

پہلروپ کی دم کے نیچے سپید رنگ کی تقریباً بارہ پتلی پتلی انگلیاں سی پوشیدہ ہوتی ہیں۔ جو برش کا کام دیتی ہیں۔ غذا کھانے کے بعد کرم اُن انگلیوں سے اپنے جسم کے تمام حلقوں کو خوب صاف کرتا ہے۔ اور اُس کے بعد یہ انگلیاں پھر لپیٹ لی جاتی ہیں۔ منوّر نقطوں کو جلا دینے کے لئے بھی یہ انگلیاں اِستعمال کی جاتی ہیں۔ گھونگے کے خول کے اُوپر چڑھنے میں بھی اُن انگلیوں سے کافی مدد ملتی ہے اگر گھونگا حرکت کرے تب بھی جگنو خول پر سے نہیں گرتا۔ زمین پر چلنے کے لئے پہلروپ اپنی دم سے ایک چھڑی کی طرح مدد لیتا ہے۔ اُس کو زمین پر جما کر ایک جھٹکے کے ساتھ آگے کو بڑھتا ہے۔

جب پہلروپ بڑے ہو جاتے ہیں تو انکی جلد بہت زیادہ تن جاتی ہے۔ اب ایک دو روز کے لئے یہ کھانا پینا قطعاً ترک کر دیتے ہیں۔ اُن کا جسم بالکل پچپچا ہو جاتا ہے۔ اِس کے بعد سر کے اطراف سے جلد پھٹتی ہے اور پوست کے اندر سے زردی مائل سبز رنگ کا ایک کیڑا نکل آتا ہے لیکن اسکا رنگ بہت جلد گہرا ہو کر پہلے کی طرح تیز بھورا ہو جاتا ہے۔ اب اُس کیڑے کی جسامت بھی کافی بڑھ جاتی ہے۔ اور یہ پھر غذا کھانے لگتا ہے اِسیطرح متعدد مرتبہ پوست بدلنے کے بعد آخری مرتبہ کیڑا ایک سخت پوست کے اندر بند ہو جاتا ہے اسی حالت میں کیڑے پر ایک تغیر عظیم لاحق ہوتا ہے۔ اس کے اعضاء کی ساخت تبدیل ہو جاتی ہے۔ یعنی پہلروپ کے اعضاء جگنو کے اعضاء کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ حالت سنجھوپی حالت کہلاتی ہے اِس روپ میں کیڑا بالکل بے حس و حرکت پڑا رہتا ہے۔ کھانا پینا بھی بند ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر اُس کو چھیڑا جائے تو اسکے نورانی

نقطے چمکنے لگتے ہیں۔ ایک عجیب بات یہ مشاہدے میں آئی کہ اُس حالت سکون میں گھونگے جگنو کو کھا جاتے ہیں۔ اِسی لئے جب کرم پر منجھروپی حالت طاری ہوتی ہے تو گھونگے اُن کے پاس سے علیحدہ کر لئے جاتے ہیں۔

تقریباً آٹھ دن کے بعد سر کے دونوں طرف سے جلد پہلے کی طرح پھر پھٹتی ہے اور ایک گلابی رنگ کا بالغ جگنو معہ اپنے ساز و سامان روشنی کے برآمد ہوتا ہے۔ آخری تین حلقوں کی زیریں سطح جنین روشنی ہوتی ہے بادامی رنگ کی ہوتی ہے۔ اگر یہ جگنو نر ہو تو اُس کے پر بھی نظر آتے ہیں۔

جگنو مختلف الانواع ہوتے ہیں۔ انگریزی نوع کا جگنو لیمپائرس ناکٹیلوک Lampyrus Noctiluca کہلاتا ہے اسکا جسم سیاہ رنگ کا نرم، لوچدار اور اوپر سے کچھ چپٹا ہوتا ہے نر جگنو کی آنکھیں بہت بڑی بڑی ہوتی ہیں تاکہ وہ مادہ کو آسانی سے تلاش کر سکے۔ اس نوع کی مادہ کے پر نہیں ہوتے اُس کی آنکھیں بھی نر کے مقابلے میں چھوٹی ہوتی ہیں۔ البتہ روشنی نر سے زیادہ تیز ہوتی ہے جسکی وجہ صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ نر اُس کو دور سے دیکھ سکے۔ پر نہ ہونے کی وجہ سے یہ عموماً گھاس پر بیٹھی رہتی ہے اور بچے اس کو آسانی سے پکڑ لیتے ہیں۔

اِس مادہ میں روشنی کے تین حلقوں میں سے پہلے دو حلقوں پر سپید قلعی کے گول دائرے بنے ہوتے ہیں۔ لیکن تیسرے اور آخری حلقے پر صرف دو گول نشانات نظر آتے ہیں۔ نر جگنو کے پہلے دو حلقوں پر قلعی نہیں ہوتی بلکہ صرف آخری ایک حلقے میں دو نشانات پائے جاتے ہیں اِسی سبب سے نر کی روشنی مقابلتہً پھیکی ہوتی ہے۔ کیونکہ یہی قلعی دراصل روشنی کا باعث ہے۔ اِس میں بھی کثیف مادہ لوسی فرین دوسرے مادے لوسی فیرن کی تکسید کرتا ہے جس سے روشنی پیدا ہوتی ہے۔ یہ لوسی فیرن تکسید کے عمل سے آکسی لوسی فیرن میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لیکن فوراً ہی اس پر تحلیل کا عمل لاحق ہو کر اسے پھر لوسی فیرن میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جب سابق اسکی پھر تکسید ہوتی ہے غرض اِسی طرح یہ تعملات بالترتیب وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں اِسی وجہ سے روشنی جلتی اور بجھتی رہتی ہے جس کو ڈاکٹر اقبال نے کس خوبی سے ظاہر کیا ہے

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

اِس عمل کے لئے جیسا کہ اُس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اعضائے تنفس سے چھوٹی چھوٹی باریک نالیوں کے ذریعہ سے کافی مقدار میں آتی رہتی ہے۔ اگر جگنو کا چمکدار حصہ

علیحدہ نکالکر ایسے پانی میں ڈالا جائے جس میں ہوا موجود نہ ہو یا پانی کو جوش دیکر خارج کردی گئی ہو تو روشنی گل ہو جاتی ہے لیکن اگر ہوا پانی میں حل شدہ ہو تو روشنی برابر قایم رہیگی۔ گرم پانی میں ڈالنے سے جگنو کی روشنی تیز ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے برخلاف اِسکے ٹھنڈے پانی میں روشنی ہلکی پڑ جاتی ہے۔

ایک دوسری نوع کا جگنو جو لیوسیولا اٹیلیکا Luciola Italica کہلاتا ہے اٹلی میں پایا جاتا ہے۔ اِس نوع میں مادین کی ٹانگیں بہت کمزور ہوتی ہیں لیکن یہ پردار ہوتی ہے۔ شام کے وقت جب یہ مادہ کہیں گھاس پر بیٹھتی ہے تو عجب دلکش اور نظر فریب منظر ہوتا ہے لاتعداد نر اُس کے اُوپر منڈلانے لگتے ہیں۔ یہ نظارہ نہایت پُرلطف ہوتا ہے۔ بقول حضرت اسمٰعیل۔

چمکنے سے جگنو کے تہا ایک سماں
ہوا پر اُڑیں جیسے چنگاریاں

ان نروں کو دیکھکر مادین کے دل میں ایک خاص جذبہ بیدار ہوتا ہے (لیکن وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا) البتہ اتنا ضرور ہے کہ مادہ کی روشنی میں اس وقت ایک غیر معمولی چمک پیدا ہو جاتی ہے جسکا نر جگنوؤں پر ایک عجیب اثر پڑتا ہے۔ روشنی تیز ہو جانے کے بعد وہ سب زمین پر مادہ کے گرد جمع ہو کر ایک منور حلقہ قایم کر لیتے ہیں اُن کی جگمگاہٹ سے جنگل کی تاریک اور خاموش فضا میں بزم چراغاں کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے عجیب دلچسپ اور حیرت افزا منظر ہوتا ہے۔ شاید روشنی کی یہ شعاعیں جانبین کے دلوں میں التفات و موافقت کی محرک ہوتی ہیں۔ کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ نر آہستہ آہستہ اپنا حلقہ چھوٹا کرکے مادین کے قریب تر ہوتے جاتے ہیں اور آخر اسکے چاروں طرف رقص کرنے لگتے ہیں اسوقت ان کی روشنی بھی بہت تیزی سے جلتی اور بجھتی رہتی ہے۔ یہ ہجوم عاشقاں مادین کے لئے بہت دل خوش کن ہوتا ہے۔

لیمپروفورس ٹینی براسس Lamprophorus Tenebrosus ایک دوسری نوع کا جگنو ہے جس کی مادہ کے پر نہیں ہوتے۔ اس کی روشنی ہلکے سبز رنگ کی ہوتی ہے۔ نر جگنو جب مادہ کے قریب جاتا ہے تو ایک تعجب انگیز مشاہدہ ہوتا ہے۔ نر اپنی روشنی کو بالکل خاموش کر لیتا ہے اور اندھیرا ہو جاتا ہے۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مختلف نورانی جانوروں کی روشنی مختلف رنگ کی ہوتی ہے۔ جگنو کی روشنی ہلکے سبز رنگ کی ہوتی ہے۔ اور الالوی دیا کھی کی نیلے رنگ کی۔ بعض مونگوں کی روشنی سپید و سرخ رنگ کی ہوتی ہے۔ یہ بھی مشاہدہ ہوا ہے کہ ایک ہی جانور سے مختلف رنگوں کی روشنیاں

نکلتی ہیں۔ لیکن ہنوز روشنی کے رنگ کی تبدیلی کی کوئی معقول وجہ دریافت نہیں ہوسکی۔

فروبل اور کنڈرگارٹن

از
جناب سید نورالحسن صاحب بی۔اے۔ بی۔ٹی (علیگ) ڈپ ایڈ۔ بی۔ٹی (گلاسگو)

(۱)

فریڈرک فروبل، اس طرز تعلیم کا بانی ایک جرمن ملّا کا لڑکا تھا۔ ۲۱ راپریل ۱۷۸۲ء میں اس کی پیدائش اور پرورش باش میں تھر نگیہ کے مقام پر ہوئی۔ ابھی ایک سال کا بھی نہوا تھا کہ شفیق ماں کا سایۂ سر سے اُٹھ گیا۔ باپ کو مصروفیتوں کی وجہ سے سر اُٹھانے کی فرصت نہ ملتی تھی لہذا بچے چوبیں گھنٹے نوکروں کے صحبت میں رہتے تھے۔

۱۷۸۶ء میں باپ نے دوسری شادی کی۔ فریڈرک کے واسطے یہ شادی بلائے ناگہانی ہوگئی۔ سوتیلی ماں کو اس سے نہ کوئی محبت تھی نہ کسی قسم کی دلچسپی شوہر کے کان بھرتے بھرتے باپ کو بیٹے سے بدظن کر دیا۔ نوبت باین جا رسید کہ ظلم و تشدد کے باب کھل گئے۔ قہر درویش بجان درویش فریڈرک ایک قیدی کیطرح گھر کی چہار دیواری میں مقید۔ اپنے ہم عمر بچوں سے الگ زندگی بسر کرنے لگا۔ غنیمت یہ تہا کہ گھر کے باغ میں اس کی فطرت پسند طبیعت نے مناظر قدرت کے مطالعہ سے دل بہلانا شروع کر دیا۔ قوت مشاہدہ روز بروز بڑہنے لگی۔ غالباً لڑکپن کے اس ہی تجربہ کا نتیجہ تہا کہ کنڈرگارٹن کی تعلیم میں مناظر قدرت کے مشاہدہ کا بڑا جزو شامل کیا گیا۔

گیارہ برس کی عمر میں اسکی زندگی نے گویا ایک نیا جنم لیا اس کا چچا جس کا نام ہافمن تھا۔ بغرض ملاقات اپنے بہائی کے پاس آیا۔ بھتیجے کی طرز زندگی کو دیکھکر اس کریم النفس چچا پر

بڑا اثر ہوا۔ بھائی کو سمجھا بجھا کر بھتیجے کو اپنی نگرانی میں تعلیم و تربیت کے واسطے لیگیا۔
چچا کا گھر ہر لحاظ سے باپ کے گھر سے مختلف تھا۔ اِس گھر میں آزادی محبت۔ ہمدردی اور نسائیت کا دور دورہ تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے مدرسہ میں قدم رکھا اور اپنے ہم عمر چالیس لڑکوں کی صحبت میں اُٹھنا بیٹھنا شروع کیا۔ اس کو شہر میں چکر لگانے کی اجازت دیدی گئی بشرطیکہ مقررہ وقت پر مکان پہونچ جائے۔ اس کو جلد احساس ہو گیا کہ اوائل عمر میں اس کی تعلیم و تربیت کا ناعاقبت اندیش والدین نے کچھ خیال و پاس نہیں کیا۔ نہایت مستعدی کے ساتھ وہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے تیار ہو گیا شفیق اُستاد کی زیر نگرانی اُس نے اپنے دماغ اور جسم کو سدھارنا شروع کیا۔ جلد ہی اُس کے خیالات پاکیزہ ہو گئے۔

مدرسہ کی تعلیم سے فارغ ہو کر یونیورسٹی میں داخل ہونے کی تمنا لئے باپ کے پاس آیا۔ باپ نے اس کو ایک ماہر جنگلات کے سپرد کر دیا جس نے عدیم الفرصت ہونے کے سبب فریڈرک کو زندگی میں اپنا راستہ خود ڈھونڈ نکالنے کے لئے چھوڑ دیا۔ اس زمانہ میں فروبل نے چند قابل آدمیوں سے ملاقات پیدا کی۔ خصوصاً ایک ڈاکٹر نے اِس کو زندگی کا ایک دوسرا رُخ دکھایا۔ گو اس کا مالک اس کو علیحدہ کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن فروبل نے ایک مرتبہ پھر اپنے باپ سے التماس کی اور بمشکل وہ اِس شرط پر یونیورسٹی کی تعلیم دلانے پر راضی ہوا کہ فروبل اپنا خرچہ اپنی ننھیال کی جائداد سے اُٹھائے۔
فروبل اِن شرائط پر اٹھارہ سال کی عمر میں جینا کی یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ حالانکہ وہ دن رات پڑھنے لکھنے میں لگا رہتا تھا۔ زندگی کی تعیشات سے اس کو کبھی سروکار نہ رہا۔ پھر بھی چھ مہینے کے اختتام پر وہ قرضدار ہو گیا۔ باپ کو خط پر خط بھیجے۔ ملتجی ہوا لیکن روپیہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ عدم ادائی قرضہ کی بنا پر اُس کو سزائے قید بھگتنا پڑی۔ قید سے رہائی اس وقت ہوئی جب اپنی جائداد کا حصہ فروخت کیا۔ قید کی زنجیروں سے نجات پا کر اپنے ایک عزیز کے پاس فروکش ہوا اور عملی زراعت میں تجربات کرنے شروع کئے۔ باپ کی علالت کی خبر سنتے ہی خدمت کے واسطے حاضر ہوا۔ بستر مرگ پر باپ اپنے بیٹے کو سمجھ سکا اور دعائیں دیتا اس دنیائے ناپائیدار سے چل بسا۔
اب اس کی عمر ۲۰ برس کی تھی۔ پہلے کچھ دن گرداور جنگل کی حیثیت سے بمبرگ میں پھر ایک رئیس کے سکرٹری کی حیثیت سے مکلنبرگ میں کام کرتا رہا۔
۱۸۰۵ء میں چچا نے اِنتقال کیا اور فروبل کو اپنا جائز وارث بنایا اِس جائداد نے روٹیوں کا سہارا کیا۔ ایک مرتبہ وہ فرینکفورٹ اِس غرض سے گیا کہ فن تعمیر میں دسترس حاصل کرلے۔ وہاں اِسکی ملاقات

ایک مدرس گرونر نامی سے ہوئی جس نے اس کی ملاقات دیگر مدرسین سے کرائی۔ وہاں اس نے مسئلہ تعلیم پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ گرونر نے اس کے خیالات کو بہت پسند کیا اور اپنے مدرسہ میں کام کرنے کی درخواست کی۔ یہ مدرسہ پسٹالوزی کے اُصول تعلیم پر چل رہا تہا۔ فروبل کو مدرسہ سے اِس قدر دلچسپی پیدا ہوئی اور پسٹالوزی کا اِس قدر قائل ہوا کہ اس سے ملنے کے لئے روانہ ہوا۔ ماہر فن تعلیم کے تجربات کا عینی مشاہدہ کرکے فروبل فرنیکفورٹ واپس آیا اور تین بچوں کی تعلیم و تربیت کرنا شروع کی۔

۲۵ برس کی عمر میں اِن بچوں کے ساتھ ایک مزرعہ پر رہنا شروع کیا اور اپنے تعلیمی نظریوں کے مطابق اُن کے خیالات کو ڈھالنا چاہا۔ اُس کو اپنی بے بسی اور کسمپرسی کا بچپن خوب یاد تہا اِسی واسطے اُس نے تعلیمی اُصولوں کی بنیاد آزادی کہیل اور محبت پر رکھی۔ فطرت کا مشاہدہ ذہن اور جسمانی ترقی کے لئے ضروری خیال کیا اور ہر قسم کی ابتدائی تعلیم کی بنیاد عملی کام پر قائم کی۔

اب اس نے اپنے مشہور و معروف کھیلوں کو ایجاد کیا۔ نئی طرح کی اینٹیں۔ کاغذ کا موڑنا تیوی کاٹنا۔ کاغذ کا دوسری چیزوں پر چڑہانا۔ اِس اثنا میں وہ اِس طرز تعلیم کی کمزوریوں پر نظر رکہتا تہا۔ اس نے لڑکوں کے والدین کو راضی کیا کہ طلبار کو لیکر پسٹالوزی کے پاس سوئیٹرزلینڈ میں ایورڈون جائے ۱۸۰۸ء میں وہ پسٹالوزی کی تعلیم سے دوبارہ مستفیض ہوا۔ بعدازاں گوٹنجن یونیورسٹی میں اُس نے جرمن زبان اور نیچرل ہسٹری پڑہنا شروع کی۔ ۱۸۱۲ء میں وہ جرمن یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ اِس دوران میں دو مشہور معلموں سے اس کی ملاقات ہوئی جن کے نام لینگیتھال اور میلن ڈورف ہیں۔ یہ دونوں فروبل کے مدرسہ کے معلم بنے اور تمام عمر فروبل کے اُصول تعلیم کی اِشاعت میں صرف کی ۱۸۱۳ء میں شاہ پروشیا کے اعلان پر یہ جنگ میں شامل ہوا۔ ۱۸۱۴ء میں اختتام جنگ پر جرمن عجائب خانہ میں نوکر ہوگیا۔ سائنس کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تعلیمی نظریوں کو بڑہاتا رہا۔

چھوٹے بہائی کے اِنتقال پر اس نے دو صغیرسن بھتیجوں کی تعلیم کا ذمہ لیا۔ نوکری سے مستعفی ہوکر ۱۸۱۶ء میں گریشہائم کے مقام پر ایک مدرسہ کھولا۔ میلن ڈورف فوراً اس کی مدد کو پہونچا۔ گو مالی اعتبار سے مدرسہ کامیاب نہ رہا تاہم تعداد طلبار اِس قدر بڑہی کہ کیل ہاؤ کے مقام پر مدرسہ منتقل کرنا پڑا اب لینگیتھال بہی اِس کار ثواب میں شریک ہوگیا۔ یہ تینوں ماہر تعلیمات نہایت تن دہی سے مدرسہ کی بہبودی اور بہتری کے لئے کام کرتے رہے مالی دقتوں نے ان کی ہمت کو کبھی پست نہ کیا۔ برلن کے دورانِ قیام میں فروبل کی ملاقات ایک تعلیم یافتہ، حسین، دولتمند، خاتون سے ہوئی جو اس کے اُصول تعلیم کو

بہت پسند کرتی تھی۔ باوجود انتہائی محبت کے فروبل اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکا۔ وہ اچھی طرح سے سمجھتا تھا کہ ایک مفلس اور دولتمند کی سماجی زندگی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ فروبل نے اس خاتون سے استدعا کی کہ اس کی مدد کیجائے اس نیک نفس عورت نے بطیب خاطر برلن میں اپنا عالیشان گھر اس کے مدرسہ کے واسطے دیدیا اور خود شوہر کے ساتھ گاؤں میں رہنے لگی۔ باوجود مخالفتوں کے کیلہاؤ کے سلسلہ میں بہت سے مدرسے جاری ہوئے لوسرن میں گورنمنٹ نے اسکی امداد کی اور نوجوان معلمین کو برائے ٹرننگ اس کے پاس بھیجا جانے لگا۔

اُس کے اُصول تعلیم سے مستفیض ہونے کے لئے یہ ضروری خیال کیا گیا کہ کمسنی سے بچہ اس کے سپرد کیا جائے۔ اب اُس نے ایک تدریجی طریقہ تعلیم کی ایجاد کی جو تقریباً دو سال کی عمر سے ہی شروع ہو جاتا ہے اُس نے والدین کو راضی کیا کہ وہ بچوں کے کھیل اور مصروفیتوں کو غور سے دیکھیں اور مفید اور عام کھیل منتخب کریں۔ اس طرح اُن کی مدد سے اس نے کھیلوں کی ایک فہرست بنائی جس میں باقاعدہ طور پر تدریجاً کھیل مندرج کئے گئے۔ ۱۸۳۷ء میں کیلہاؤ کے قریب بلانکن برگ میں پہلا کنڈرگارٹن قائم ہوا لیبین شٹائن میں کنڈرگارٹن کی تعلیم دینے کے واسطے ایک ٹرننگ کالج قائم کیا۔ حالانکہ اُس کے مدارس میں مالی خسارے ہوتے رہے باایں ہمہ اُس کا اُصول تعلیم نہایت مقبول ہوا اور بہت سے مدرسے یکے بعد دیگرے کنڈرگارٹن کی طرز پر قائم ہوئے لیبن شٹائن کے مقام پر اُس نے ایک بڑا جلسہ کر کے اساتذہ کو مدعو کیا اور اپنے تعلیمی نظریوں کو اُن کے سامنے پیش کیا۔ مدرسین پر بہت اثر ہوا اور بیشتر نے مدد کرنے کا وعدہ کیا۔

۱۸۵۱ء میں پروشیا کی گورنمنٹ نے کنڈرگارٹن کی تعلیم ناجائز قرار دیدی۔ یہ اس کے ایک قریبی رشتہ دار کے ایک مضمون کا اثر تھا جو کارل فروبل نے کنڈرگارٹن اور مدارس نسوان کے نام سے شایع کیا تھا۔ اس مضمون میں سماجی ہیجان پیدا کرنے کی کوشش کیگئی تھی۔ گو فروبل کا اُصول تعلیم اس مضمون کا بالکل ضد تھا لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔

۱۸۵۹ء میں یہ حکم منسوخ کیا گیا۔

۱۸۵۲ء میں گوتھا میں کنڈرگارٹن کے جلسہ میں شریک تھا کہ شدید زکام میں گرفتار ہوا سردی کا اثر سینہ پر ہوا اور فروبل نے اِس دنیا کو خیرباد کہا شیونیا کی خاک کو اس کا مدفن ہونے کی عزت ملی اُس کے قبر پر ایک گیند اور ایک مکعب بنایا گیا اور لوح مزار پر لکھ دیا گیا "ہم کو اپنے بچوں کے لئے زندہ رہنا چاہیئے۔" (باقی آئندہ)

صوبہ ورنگل کی سالانہ تعلیمی کانفرنس ۸ ربہمن سنہ رواں کو زیر ہدایت جناب
مولوی احمد حسین خاں صاحب بی، اے، صدر مہتمم تعلیمات سمت منعقد ہوئی تھی۔
اس کانفرنس میں تعلیم دینیات کے متعلق کمیٹی نے جو رپورٹ پیش کی وہ ہم ذیل
میں درج کر رہے ہیں۔ یہ رپورٹ نہایت مختصر اور محض ایک خاکہ کی صورت میں ہے
اور یہ مشکل ہے کہ ہم اسے بلامزید صراحت کے کماحقہ سمجھ سکیں اسلئے ہم نے اسکے پہلے اس
توضیح کو جگہ دی ہے جو تعلیم دینیات کی تحریک کے سلسلہ میں پیش ہوئی تھی اور جس کی روشنی
میں کمیٹی نے اپنی تجاویز مرتب کیں اور اسی روشنی میں ہمیں رپورٹ کا مطالعہ کرنا چاہیئے
چنانچہ ہم نے اس عنوان کے دو حصہ کر دیئے ہیں پہلے حصہ میں تحریک کی توضیح ہے اور دوسرے
حصہ میں رپورٹ ہے ہم اس مضمون کیلئے جناب خاں صاحب کے بیحد ممنون ہیں جنہوں نے نہ صرف
اس نہایت ضروری شعبہ تعلیم کی طرف پہلے پہل توجہ کی بلکہ اسلئے بھی کہ محترم نے ہمیں یہ رپورٹ ورنگل سے لاکر
شائع کرنے کے لئے عطا فرمائی۔ (مدیر)

(۱)

دینیات کی تعلیم ذہنیات حاضرہ کے مطابق دیجانی چاہیئے۔

اس تحریک کی نسبت گزشتہ میٹنگ میں خواہش فرمائی گئی تھی کہ میں اس کی توضیح عرض کروں تعمیلاً
گزارش ہے کہ دینیات پڑھانیوالے اساتذہ عموماً اور وہ حضرات جن سے متعلق نصاب تعلیم کی تکمیل ہ

نگرانی ہے خصوصاً عجیب کشمکش میں مبتلا ہیں سررشتہ کا نصاب دینیات کو شل دیگر مضامین کے لازم قرار دیتا ہے اور عام رجحان و میلانات دینیات اور اس کے نام سے بیزار و متوحش ہوتے جا رہے ہیں اس لزوم و انکار کے اندر توافق پیدا کرنا ہماری کانفرنس کا نہایت ہی دلچسپ کام ہوگا۔ رہا یہ سوال کہ توافق کیونکر پیدا کیا جائے؟ آیا یہ ممکن بھی ہے؟ بصورت امکان کیا ہماری کانفرنس متعدد و مجاز ہے کہ بلا اعانت و استمزاج صدر اس باب میں کوئی مضبوط طریقۂ عمل تجویز کرے اور پھر اتنا اہم کام بلا ضیاع وقت و صرف زر سہل الحصول بھی ہے یا نہیں؟ اس سوال اور اس کے جملہ متعلقات کا جواب میرے نزدیک اثبات میں ہے۔ یعنی یہ کہ تحریک زیر بحث ہماری کانفرنس کی اختیاری چیز ہے۔ اس کو کامیاب بنانے میں صدر کے استمزاج و اعانت کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور نہ اس میں وقت اور نقد ضائع ہوگا۔ اگر ہم صرف اصولی طریقہ تعلیم کی تدوین کریں۔ اور اس کو اپنی سمت میں گشت کرائیں۔ مرکزی مدارس اور جہاں جہاں باقاعدہ نصاب تعلیم پر عمل ہو رہا ہے وہاں ہمارے مدونہ طریقہ کی ایک ایک کاپی تعمیلاً بھیجدی جائے تو کافی ہے۔

(۲) دینیات کو پڑھانے کا اصولی طریقہ کیا ہوگا؟

رفقائے کانفرنس میں جن حضرات کو اس سے دلچسپی ہے وہ اپنے اپنے آرا و تجاویز مرتب فرمائیں۔ اور کسی مقررہ تاریخ میں ان انفرادی آرا پر اجتماعی غور و بحث ہو اس کے بعد جو تجاویز متفقاً پسند و منظور ہوں اُن کی توثیق صدر کانفرنس سے کرائی جائے۔

(۳) شخصی طور پر میری اپنی رائے حسب ذیل ہے:۔

دینیات کا مسلمۂ سرکار نصاب اِن تین شعبوں پر مشتمل ہے۔

(الف) خط نسخ (عربی رسم الخط)۔

(ب) سیرۃ طیبہ (آنحضرتؐ کی زندگی)۔

(ج) مسائل فقہیہ (حقوق اللہ و حقوق العباد)۔

پہلے شعبہ میں قاعدۂ بغدادی کے نام سے کلام پاک تک ناظرہ خوانی کی تعلیم ملزوم ہے۔ دوسرے شعبے میں ہمارے رسول، ہمارے نبی، وغیرہ ناموں سے چھوٹے چھوٹے رسائل شریک نصاب ہیں۔ تیسرے شعبے میں مقررہ رسائل پہلی سے ساتویں جماعت تک پڑھائے جاتے ہیں۔ میری تجویز یہ ہے کہ پہلے اور دوسرے شعبے کی تعلیم دینیات کے نام سے مذہب کے ذیل میں جو ہو رہی ہے وہ اصولاً درست نہیں کیونکہ پہلا شعبہ یعنی خط نسخ نستعلیق کا ہی ایک جزو ہے اور اب ٹائپ نے اس حقیقت کو

بہت زیادہ واضح کر دیا ہے کہ خط نسخ و نستعلیق دونوں رسم الخط کا مجموعہ اُردو خط ہے تو اِس کی تعلیم اُردو ادب کے تحت ہونی چاہیئے یعنی ابتدائی جماعتوں میں جس طرح نستعلیق حروف ہجا اور اُس کی ترکیب بتائی جاتی ہے ساتھ ہی ساتھ اُردو پڑھانے والے اساتذہ حروف نسخ اور اُن کی کشش نوک پلک دوائر وغیرہ کی تعلیم دیا کریں۔ تو اِس پہلے شعبہ کے ساتھ ابتدا ہی سے طلبار کی دلچسپی مربوط ہو جائیگی علیٰ ہٰذا سیرۃ طیبہ کو تاریخ کے اساتذہ فن تاریخ ہی کے متعدد سے پڑھانے پر مجبور کئے جائیں کیونکہ سیرۃ طیبہ کو جو تاریخی اہمیت حاصل ہے اپنے اندر وہ تمام خصوصیات رکھتی ہے جو تاریخی شعبوں میں اہتم بالشان سمجھے گئے ہیں۔ اتنی اہم چیز کو معمولی وغیر موزوں اساتذہ سے پڑھوانا لازماً غیر مفید ہوگا۔ اور یہ اساتذہ کبھی بھی وہ دلچسپیاں اپنے بھونڈے طرز تعلیم سے بچوں میں نہیں پیدا کر سکتے جو ایک تاریخ کا اُستاد اپنے فن کے مقررہ لوازم سے کرا سکتا ہے۔

اب رہگیا تیسرا شعبہ یعنی مسائل فقہیہ کی تعلیم یہ خاصتہً مذہب ہے اور اصولاً دینیات یہی ایک چیز ہے کہ اِس کو دوسرے فنون کے اساتذہ نہیں پڑھا سکتے اور جو پڑھا سکتے ہیں وہ مستقلاً اِس کو ایک فن تصوّر کر کے موزوں و دلچسپ تیاری کے ساتھ پڑھانے لگیں تو میرے خیال سے اِس تیسرے شعبہ سے بھی طلبار کو حقیقی شناسائی و دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے۔

(۴) فقہی مسائل کی تعلیم میں کیونکر دلچسپی پیدا کیجائے؟

یہ ایک مستقل سوال ہے اِس پر بھی رفقائے کانفرنس اپنی شخصی دلچسپیوں کی حد تک غور کریں۔

میں اپنی حد تک عرض کروں گا کہ فقہی مسائل میں دلچسپی پیدا کرنیکا واحد ذریعہ "فلسفہ" ہے۔ موجودہ تمدن اور اُس کے پیدا کردہ انقلاب نے عام مزاج کو علت طلب بنا دیا ہے۔ "تکلّم الناس علیٰ قدر عقولہم" کے مطابق فلسفہ کی آمیزش کے ساتھ فقہی مسائل کی تعلیم مفید و کارگر ہوگی۔ یہاں بڑا سوال استعداد کا پیدا ہوتا ہے کہ ابتدائی مدارس میں جو مدرسین ہیں ان کی استعدادیں اتنی کہاں ہیں کہ وہ فقہی مسائل کو فلسفہ کا جامہ پہنا کر دلچسپ بنائیں اور اگر معدودے چند ایسے اساتذہ موجود بھی ہوں تو اُن کے فلسفہ کو سمجھنے کی مناسبت دیہاتی بچوں میں کہاں ہے بیشک یہ سوال بہت اہم ہے۔ لیکن مشہور ہے "چو دو دل یک شوند بشکنند کوہ را" ہماری کانفرنس کے موقّر رفقائے کار میں دو سے زیادہ ایسی شخصیتیں لازماً ہونگی جو ہمت کر سکتی ہیں کہ صرف اُن مسائل کی حد تک جو ابتدائی وتحتانی اور وسطانی مدارس میں شریک نصاب ہیں۔ کوئی آسان قسم کی عام فہم گائیڈ یا طرز تفہیم کے اشارات

مرتب فرمائیں۔ اِن انفرادی اشارات پر اجتماعی غور و بحث سے متفقہ "طریقہ تعلیم" تیار کر کے صدر کانفرنس سے منظور و نافذ کرا لیا جائے تو کیا عجب ہے کہ یہ مہم آسان ہو جائے "کہ بر مردان کار کارہا دشوار نیست"

(۵) اُن حضرات کی تحریص اور بذل التفات کے لئے جو یہ کام کر سکتے ہیں اپنے خیال کا ایک ناقص نمونۂ اشارت ذیل میں پیش کیا جاتا ہے فقہی مسائل ادنیٰ ترین جماعات سے لیکر اعلیٰ ترین جماعتوں تک جتنے بھی ہیں اولاً اون کی اصولی تعلیم کر لینی چاہیئے۔ مثلاً "عبادات" کا عنوان حقوق اللہ کے لئے اور معاملات کا" عنوان حقوق العباد کے لئے اور پھر ان صدر عنوانات کے تحت ذیلی عنوان اِس طرح مرتب ہوں۔

(الف) عبادات۔

(۱) بنیادی اعتقاد یعنی کلمہ طیبہ یا رکن اول اسلام۔

(۲) وقت شناسی اور ہمہ وقت مستعدی کی بہترین مشق "نماز" یا رکن دوم۔

(۳) تربیت نفس و تہذیب اخلاق کا موثر پروگرام۔ روزہ یا رکن سوم۔

(۴) مدنیت اور اجتماعی زندگی سے استفادہ اور اس کا ایک ذریعہ۔ حج یا رکن چہارم۔

(۵) تحفظ اموال و صیانت ثروت کا بیمہ۔ زکوٰۃ یا رکن پنجم۔

اِس طرح پانچ رکن پانچ بنیادی اصول ہیں جن پر خدا اور بندے کے رابطہ کی عمارت کھڑی کیجا سکتی ہے۔ پھر ان کے متعلقات علیٰحدہ ہیں جو بعنوان شروط و لوازم متعین کئے جا سکتے ہیں مثلاً ابواب طہارت، آداب نماز، ضوابط روزہ مناسک حج، اور نصاب زکوٰۃ اِس کے بعد ان کے مصطلحات، اِس طرح کی باب بندی کے بعد اساتذہ متعلقہ پابند کئے جائیں کہ اِن مسائل سے متعلق جس قدر رسائل کہ شریک نصاب ہیں اون کو صرف اپنے استعمال و مطالعہ کے لئے مختص سمجھیں اور بموجب نصاب و ماہواری تقسیم و رجسٹر پراگرس مدرسہ متعلقہ ان ابواب سے یکے بعد دیگرے عنوانات کی تفہیم طلبا کو کراتے جائیں ٹھیک اسطرح جیسے جماعت سوم تک معلومات عامہ، جغرافیائی مشاہدات، یا قواعد زبان، بلا امداد کتب پڑھائے جاتے ہیں۔ اِن ارکان خمسہ کے طریقہ تفہیم اور نمونہ ہائے اسباق علیٰحدہ کے منسلک کئے جاتے ہیں۔

(ب) عبادات کی طرح معاملات کی بھی تقسیم ہو سکتی ہے۔ مثلاً

(۱) نظام تمدن (۲) نظام معاشرت (۳) نظام سیاست (۴) نظام اخلاق وغیرہ۔

لیکن چونکہ یہ حصہ (معاملات) ہمارے دینی مدارس کے اعلیٰ ترین جماعتوں میں بھی شریک نصاب نہیں ہے اسلئے اس کی طرز تعلیم پر غور کرنیکی ضرورت نہیں۔ ورنہ یہ حصہ عبادات سے کہیں زیادہ دلچسپ

ہوسکتا ہے اور اِس حصہ کو دلچسپ بنانے میں جتنی آسانیاں میسّر ہیں اتنی حصہ عبادات میں غالباً نہیں ہیں

نوٹ:- میری یہ تحریک نہ صرف دینیات اہل اسلام ہی سے متعلق ہے بلکہ مذہب و اخلاق کے تحت جتنا بھی نصاب منظورۂ سرکار وزیر تعلیم ہے وہ سب اِسی نکتہ نظر سے پڑھائے جانیکا مستحق ہے جو مثالاً دینیات اہل اسلام کی نسبت پیش کیا گیا ہے لہذا ساتن دھرم و اخلاقیات ہنود سے متعلق مماثل تجاویز پر بھی وہ رفقائے کانفرنس غور فرمائیں جو اس سے ذاتی مناسبت وطبعی دلچسپی رکھتے ہیں۔

زیادہ اُمید قبول۔

سیّد عبد القدیر
ناظر تعلیمات حلقہ کھم

---

(۲)

رپورٹ تعلیم دینیات۔

محرک صاحب نے اپنے تحریک کے ساتھ جو توضیحی نوٹ دیا ہے چونکہ ہم کو اس کے ساتھ بالکلیہ اتفاق ہے لہذا یہ نوٹ ہماری تجاویز کا بہترین تمہیدی حصہ ہے اور اسی تمہید کی روشنی میں ہماری سفارشات پیش ہیں۔

(۱) جماعت اول سے ہفتم تک جتنا کچھ شریک نصاب ہے اس کے اُصولاً تین حصے ہونے چاہئیں۔

حصہ اول خط نسخ ۔ (عربی رسم الخط)

حصۂ دوم۔ سیرۃ طیبہ۔ (آنحضرت صلعم کی مقدس زندگی)

حصہ سوم ۔مسائل فقہیہ۔(نماز ۔ روزہ ۔ حج ۔زکوۃ۔ اور اس کے شروط وآداب)

حصہ اول خط نسخ کی تجزی اسطرح کیجائے تو مناسب ہے۔

(الف) حروف مفردہ (۱) مفردات ہجا کا مکتوبی مشاہدہ بآئین رسم خط نسخ۔

(۲) حروف مفردہ کا صحیح تلفظ۔

(۳) مخارج کی مشق۔

(۴) ہم مخرج حروف کا صحیح امتیاز۔

(۵) مدات کی صرف مکتوبی صورتوں کا مشاہدہ۔

(ب) حروف مرکب کا تصور اور ان کا مکتوبی مشاہدہ۔
حروف مرکبہ

(۱) دو حرفی ترکیب و اتصال
(۲) سہ حرفی " "
(۳) چہار حرفی " "
(۴) پانچ حرفی " "

ان اتصالات کے ساتھ مدات کی مقروئی و مکتوبی مشقیں بھی ساتھ ساتھ ہونی چاہئیں۔

(ج) جملے اور ان کا تصور۔

(۱) دو لفظی جملے (۲) سہ لفظی جملے (۳) چہار لفظی جملے (۴) پانچ لفظی جملے (۵) ایک سے زیادہ جملوں کی مکتوبی و مقروئی مشق۔

(د) سورتوں کی تعلیم۔ مکتوبی و مقروئی۔

(۱) سورۂ کوثر (۲) سورۂ اخلاص (۳) سورہ آخر۔

(ھ) پارۂ عم کے ربع اول کی مکتوبی و مقروئی تفہیم تا حد سورۂ ذیل۔

(۱) سورۂ ناس	(۲) سورۂ فلق
(۳) " ابی لہب	(۴) " کافرون
(۵) " ماعون	(۶) " قریش
(۷) " فیل	

(و) باقی حصہ ربع اول پارۂ عم کو بقیہ تین ارباع کے ساتھ ناظرہ خوانی میں صاف کرا دیا جائے۔

(ح) پارہ اول سے تا آخر پارہ (۲۹) استخراجی یعنی سقراطی اصول پر طلبا سے بعنوان مشق سماعت کیا جائے۔

(ت) ہم وثوق کے ساتھ متوقع ہیں کہ اگر اس اصول سے حصہ اول خط نسخ کی تعلیم خاصتاً ادبی نقطہ سے ختم کرا دیجائے تو اس حصہ کی موجودہ افسوسناک خامیاں اور عام بے اعتنائیاں انشاء اللہ رفع ہو جائینگی۔

حصہ دوم سیرۃ طیبہ۔ اس سلسلے میں جتنے رسائل شریک نصاب ہیں اولاً اُن کی تفصیلی پیمائش کرلینا لائق اساتذہ کا کام ہے۔ اور پھر طلباء کے فہم و عمر کے مطابق سبق آموز کہانیوں کی ترتیب پر اسطرح کی حصہ بندی موزون ہوگی جسکو نصاب کے حسب صراحت ذیل چار ابواب پر منقسم کیا جائے اور ہر باب میں پانچ فصل رکھی جائیں اور ہر فصل پر تین تین سبق تیار کرلئے جائیں۔

ہم صد رسرخیاں اون کی تحت (۲۰) ذیلی عنوانات اور ہر عنوان پر کم سے کم تین تین تاریخی کہانیاں تیار کرلیجائیں اور کہانی کو تاریخ کے فنی اہتمام سے دلچسپ بناکر پڑھایا جائے۔

الف (باب اول) حضور کا مولد و منشار (ولادت طیبہ سے ختم رضاعت تک کے دلچسپ حالات)۔

(۲) حضور کا عہد طفولیت (ڈھائی سال سے آٹھویں سال تک کے سبق آموز واقعات)۔

(۳) حضور کا زمانہ ہوش و احتیاط (آٹھویں سال سے سولھویں سال تک کے مفید و موزوں قصے)۔

(۴) حضور کا مقصد وحید۔ (خدمت الناس)۔

(۵) حضور کی مصروف ترین شبانہ روز زندگی۔

ب (باب دوم) حضور کی مکی زندگی اور اوس کے اہم شعبے (سولھویں سال سے باونویں سال تک)

(۱) حضور راعی کی حیثیت میں۔

(۲) حضور مصلح کی شان سے۔

(۳) حضور تاجر کی پوزیشن میں۔

(۴) حضور کی پیغمبرانہ دعوتیں۔

(۵) حضور کی ہجرت اور اس کے اسباب۔

ج (باب سوم) حضور کی مدنی زندگی (باونویں سال سے ترسٹھویں سال تک)۔

(۱) یثرب کی کایا پلٹ۔

(۲) مدینہ کی اصلاح و سعادت بخش۔

(۳) مدینہ کا بھائی چارہ۔

(۴) دعوت حق کی عالمگیر اشاعت۔

(۵) مدینہ کا جوش صداقت اور اسکا سیاسی پوزیشن۔

د۔ (باب چہارم) حضور کی غایت بعثت۔

(۱) دنیائے انسانیت کی حقیقی اصلاح وسنواری

(۲) مکارم اخلاق کی عملی تعلیم۔

(۳) ضبط نفس کی اعلیٰ ترین تربیت۔

(۴) ایثار وقربانی کے بے نظیر نمونے۔

(۵) کردار وسیرت کی بے مثال تکمیل۔

حصۂ سوم فقہی مسائل۔

اس حصے کی اُصولی تعلیم کی نسبت محرک صاحب کے شخصی تجاویز پر ہم اس سے زیادہ اضافہ نہیں چاہتے کہ فلسفہ کی آمیزش سے لوچ وچک پیدا کرلینا یقیناً نازک کام ہے اور یہ کام ذی استعداد وبا احتیاط اساتذہ ہی سے ممکن ہے ورنہ عام مدرسین کی آزادی سے خوف ہے کہ مسائل کی فقہی روح کو فنا نہ کردیں لہذا جہاں ایسے با احتیاط اوستاد موجود ہیں اون سے خواہش کیجا سکتی ہے کہ مسائل فقہیہ کو فلسفہ کا جامہ پہنائیں۔ اور جہاں ایسے ذی استعداد اساتذہ موجود نہ ہوں وہاں کے اساتذہ صرف عملی تعلیم پر مجبور کئے جائیں۔

(۲) موجودہ حالات اور دینیات کی طرف سے افسوسناک بے اعتنائی کے مدنظر موقر کانفرنس سے ہماری پرزور استدعا یہ ہے کہ کانفرنس راست صدر مدرس صاحبان مدارس تحتانی۔ وسطانی۔ فوقانی کو اس مضمون کے لزوم کی اہمیت محسوس کرائے۔ صدر صاحبان کے توسط سے اساتذہ متعلقہ کو تنبیہ کیا جائے اور اساتذہ کے واسطے سے طلبا میں حقیقی احساس وبیداری پیدا کیجائے اس طرح تنبیہ کی نگرانی عہدہ دار صاحبان معائنہ کا مرغوب ترین فرض متصور ہونا چاہیئے۔

(۳) دینیات کا لزوم اور اس کی وسعت مقتضی ہے کہ مثل دیگر مضامین کے اسکے لئے بھی نظام الاوقات میں کافی وقت رکھا جائے۔ ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ ہفتہ میں صرف دو پریڈ اور کسی ہفتہ میں اتنی عنایت بھی ندارد اس طرز عمل سے ایک طرف نصاب ناتمام رہ جائیگا دوسرے طرف اساتذہ کی خدمت تعلیم ادہوری کی ادہوری رہیگی امید ہے کہ معزز کانفرنس اس جز کو انتظامی تحریک تصور نہ فرمائیگی بلکہ ہماری معروضہ سفارشات کو موثر بنانے کے لوازم میں شمار کرلیگی۔

(۴) تحتانیہ طبقات میں دینیات کے مضمون کو کم سے کم مڈل ٹرینڈ اساتذہ کے حوالہ کیا جانا چاہیئے وسطانی وفوقانی طبقات میں بھی بلند استعداد اساتذہ ہی موزون ہونگے۔ لہذا ہماری سفارش ہے کہ

انتخاب وتفویض کی احتیاط کو جتانے کی ضرورت بھی کانفرنس نوٹ فرمائے۔

(۵) عملی تعلیم کے واسطے علیحدہ کمرے یا اور ضروری مطالبات اساتذہ کو صدر صاحبان مدارس نظر انداز نہ فرمایا کریں تو مناسب ہے۔

بلا مطالبات بھی ممکنہ سہولتیں اساتذہ دینیات کو بہم پہونچانا اخلاقی و آئینی فرض متصور رہنا چاہیئے

(نوٹ) ہم نے اپنی سفارشات میں طریقہ تعلیم کے تحت صرف اصول کو متعین کیا ہے کتاب سہ ماہواری تقسیم کا پروگرام بنا لینا اساتذہ متعلقہ ہی کا کام ہے۔

زمانہ حال کے تعلیمی رجحانات

از

جناب ای۔ آر۔ واڈیا صاحب بی۔ اے۔ کینٹب، بیرسٹرایٹ لا پروفیسر فلسفہ میسور یونیورسٹی

انجمن اساتذہ بلدہ شاخ چادرگھاٹ کی زیر سرپرستی سینٹ جارجز گرامر اسکول کے ہال میں پروفیسر واڈیا نے عنوان مندرجہ بالا پر ایک نہایت دلچسپ اور بصیرت افروز تقریر فرمائی۔ صاحب موصوف جامعہ میسور کے پروفیسر فلسفہ ہیں اور کچھ عرصہ تک سررشتہ تعلیمات میسور کی عنان بھی آپ کے ہاتھوں میں رہ چکی ہے۔ آپ حیدرآباد انٹر یونیورسٹی بورڈ کے معتمد کی حیثیت سے تشریف لائے تھے اور باوجود سرکاری حیثیت ہونے کے آپ نے نہایت آزادی کے ساتھ تعلیمی مسائل پر بحث فرمائی اور تعلیم وتدریس کے فن وعمل کے بعض تاریک پہلوؤں پر بصیرت افروز روشنی ڈالی۔ ہمیں توقع ہے کہ قارئین مجلہ اس فاضلانہ تقریر سے بے حد محظوظ اور مستفید ہونگے۔ ذیل میں ہم اس معرکتہ الآرا تقریر کا محض ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

(مدیر)

تعلیم کا موضوع فنی بھی ہے اور عام فہم بھی ہے۔ میں اس موضوع پر مستند ماہر فن کی حیثیت سے کچھ کہنے کی تو جرأت نہیں کرسکتا۔ مگر ایک فلسفی اور مبصر حیات ہونے کی وجہ سے تعلیم کے بارہ میں میرے بھی

چند نظریئے ہیں۔ علاوہ ازیں سررشتہ تعلیمات میسور کی قسمت کی باگ ڈور بھی کچھ عرصہ تک میرے ہاتھوں میں رہ چکی ہے اسلئے مجھے ابتدائی اور ثانوی مدارس کے حالات کے مطالعہ کرنے کا تھوڑا بہت موقعہ ملا ہے میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جو بات میسور پر صادق آتی ہے وہ حیدرآباد یا دوسرے صوبوں پر بھی صادق آئیگی لیکن تمام صوبوں کو، اپنے اختلافات کے باوجود، ایک ہی قسم کے تعلیمی مسائل پیش آرہے ہیں اور اپنی تقریر میں اُن ہی مسائل سے بحث کرونگا۔

تعلیم دو دور سے گذر چکی ہے۔ پہلے دور میں جو کئی سو برس تک پھیلا رہا، تعلیم کے اجارہ دار چند برگزیدہ ہستیاں تھیں۔ مثلاً ہندوستان میں برہمن اور یورپ میں پادری لوگ۔ یہ شعبہ اتنا خصوصی اور بالذات اتنا دشوار خیال کیا جاتا تھا کہ انے گنے چند آدمی اُس کے اہل سمجھے جاتے تھے اور باقی ماندہ لوگوں کو دوسرے معمولی کاموں پر قانع ہونا پڑتا تھا۔ یہ حالات پچھلی صدی کے بیچوں بیچ تک جاری رہے، یہاں تک کہ ایک ایسا دور شروع ہوا جس پر جمہوری اصول کا غلبہ تھا۔ جو یورپ میں انقلاب فرانس کی وجہ سے پھیلے تھے۔ اب یہ عقیدہ ہوگیا کہ تعلیم ہر آدمی کا پیدائشی حق ہے اور ہر شخص تعلیم حاصل کرنیکا اہل اور مستحق خیال کیا جانے لگا پہلے دور میں گویا کہ فطرت کا دور دورہ تھا اور دوسرا دور تعلیم و تربیت کا زمانہ تھا۔ اسی عقیدہ کا نتیجہ تھا کہ یورپ کے ممالک میں جبری تعلیم کے قوانین نافذ ہوئے۔ اب ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور حماقت سے یہ یقین دلنشین ہوگیا کہ جمہوری حکومت کے شعار کو آناً فاناً عملی جامعہ پنہایا جاسکتا ہے اور عام تعلیم کے ذریعہ سے اُس کو بروئے عمل لایا جاسکتا ہے۔

خیالات اور تخیلات کے اِس انقلاب نے تعلیم کا ایک معیاری نمونہ پیدا کیا، جو ہر بچے کے لئے مقرر کیا جاتا تھا، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ اب ہر درد کی دوا ہوجائیگی۔ تعلیمی مسائل کی گوناگون پیچیدگیوں کا کوئی لحاظ نہیں تھا۔ حالانکہ یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ تمام لوگ فطری قابلیتوں میں برابر نہیں ہوتے اور نہ اُن سب کا ماحول یکساں ہوتا ہے۔

بنتھم کا "نی کس، ایک رائے" والا مقولہ سیاسی نظریوں پر ٹھیک اُترے تو اُترے مگر تعلیمی مسائل پر اُس کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ جو تعلیم چند افراد یا گروہ کے لئے مفید ہو وہ لازمی طور پر ہر فرد اور ہر گروہ کے لئے مفید ہوگی۔ اگر ہر کس و ناکس کو جبراً ایک ہی قسم کی تعلیم دیجائے تو نئی دشواریاں اور نئے مسائل رونما ہونگے۔ چنانچہ تعلیم کا مسئلہ جس قدر پیچیدہ آج کل ہے اُتنا نہ تو افلاطون کے زمانہ میں تھا اور نہ ہربرٹ اسپنسر کے عہد میں۔

اب تیسرا دور آیا جس میں سے فی زمانا تعلیم گذر رہی ہے۔ اسکو ہم "نئی تعلیم" کہہ سکتے ہیں یا یوں بھی

کہہ سکتے ہیں کہ یہ فطرت انسانی کو عقلی زاویہ نگاہ سے دیکھنے کا زمانہ ہے۔ عہد حاضرہ کو بجا طور پر عہد اطفال کہہ سکتے ہیں اب بچوں کو نقط ایک مشین یا ظرف خالی نہیں خیال کرتے جس میں اُستاد واقعات کا انبار ٹھونس دیتا ہے بلکہ بچہ کو ایک منفرد ہستی سمجھتے ہیں، جس میں اپنی ذاتی صفات اور رجحانات ہوتے ہیں جو دوسرے بچوں کی صفات و رجحانات سے الگ اور ممتاز ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تمام بچوں میں ایک حد تک یکسانیت ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ہم اس حقیقت کے بھی پورے پورے قائل ہیں کہ ہر بچہ میں اپنی انفرادی جبلت اور مخصوص مذاق ہوتا ہے یہ بڑی نادانی ہے کہ ہم اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر دیں۔ اس لئے معیار بندی کی کوشش میں ہمیں یہ احتیاط کرنی چاہیئے کہ بچہ کی انفرادیت کا خون نہ ہونے پائے۔ اجتماعی تعلیم اس طور پر ہونی چاہیئے کہ ہر بچہ کا جوہر اپنے مخصوص انداز میں بڑھنے کے لئے آزاد رہے اور کمال کو پہونچے۔ ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ بچوں کو دنیاوی زندگی کے لئے تیار کیا جائے۔

اس زمانہ میں ہم یہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ یہ توقع بے سود ہے کہ ہر بچہ معیاری تعلیم کے کسی خاص نظام سے ہماری مرضی کے مطابق متاثر ہوگا۔ اس سلسلہ میں مجھے اُس مدرسہ کا خیال آگیا جو لندن کونٹی کونسل نے پھسڈی اور سست ذہن بچوں کی تعلیم کے لئے کھولا ہے۔ اس مدرسہ میں ایک بچہ تھا جسکی عمر ۱۳ سال کی تھی لیکن وہ اپنی درسی کتاب سے چند جملے بھی صحیح نہ پڑھ سکتا تھا اور اُسکی یہ حالت چھ سال کی باقاعدہ تعلیم کے بعد تھی اُس کی ماں چاہتی تھی کہ اُسے مدرسہ سے نکال کر کسی پیشہ میں لگا دے تاکہ گھر کی قلیل آمدنی میں تھوڑا بہت اضافہ ہو جائے۔ ڈاکٹر نے بھی رائے دی تھی کہ لڑکے کو مدرسہ میں رکھکر مزید تعلیم دینا بالکل بے سود ہے۔ مگر جبری ابتدائی تعلیم کے قانون کا تقاضا تھا کہ وہ ایک سال اور مدرسہ میں رہے۔ یہ وہ صورت ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جبر چاہے جس قسم کا ہو کبھی مُفید نہیں ہو سکتا۔ ہمیں جلدی سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیئے کہ اس قسم کے لڑکے بالکل بد ذائقہ ہیں۔ ایک لڑکا تھا جو مدرسہ میں بالکل نکھٹو تھا لیکن اُس نے درزی کا پیشہ اختیار کیا اور خوب چمکا۔ اگر کوئی لڑکا پڑھ یا لکھ نہ سکے تو یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ناکارہ ہے۔ فطرت مکافات میں بڑی فیاض ہے۔ جبری تعلیم کا تھوڑا بہت فائدہ ضرور ہے بشرطیکہ مجبور لڑکا تعلیم حاصل کرنیکی صلاحیت رکھتا ہو اور اُس سے فائدہ اُٹھا سکے مگر جب بچے کو زبردستی ایسے مضامین پڑھائے جاتے ہیں جس کو وہ سمجھ نہیں سکتا تو یہ بچوں کی عمر کے قیمتی زمانہ کا غارت کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔

اب ہم تعلیم کو عام کرنے کے مسئلہ سے دوچار ہو رہے ہیں۔ تاکہ ہر بچہ خاصی تعلیم حاصل کرے اور اپنے مخصوص طریقہ پر ترقی کرے اور اپنے خاص مذاق کی پرورش کرے۔ یہ ظاہر ہے کہ مختلف سطح کے دماغوں کے لئے مختلف طریقہ تعلیم درکار ہوگا۔ ایک زمانہ تھا جبکہ لوگ خیال کرتے تھے کہ تعلیم ابتدائی منزل سے شروع

ہوتی ہے مگر حقیقت تو یہ ہے کہ بچے کی زندگی اچھے یا بُرے قالب میں اُن لامحدود ارتسامات کے اثر سے
ڈہل جاتی ہے جو وہ بچپنے کے زمانہ میں ابتدائی مدارس میں داخل ہونے سے بہت پہلے حاصل کرتا ہے
تعلیم کے معنی محض پڑہنا یا لکھنا نہیں ہے بلکہ تعلیم انسان کی فطرت کاملہ کے ارتقا کا نام ہے. اخلاقی اور
مذہبی تعلیم کی داغ بیل ابتدائی سات سال کے اندر اندر ڈالی جاتی ہے اور جو ارتسامات کہ بچہ اپنے تعمیری
سن میں حاصل کرتا ہے وہ مدۃ العمر باقی رہتے ہیں۔

یہ بیحد طمانیت بخش ہے کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے یورپ میں ماقبل تحتانی یا نرسری مدارس کی
تحریک زور پکڑ رہی ہے. نرسری مدارس میں نوعمری کی تعلیم کے خطرات سے حفاظت کیجاتی ہے اور اس بنیادی
نفسیاتی اصول کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ بچپنا کھیل کود کا زمانہ ہے. کھیل سے فاضل قوت کی نکاسی ہوتی ہے اور
اُس کو بچے کی نفع خیز اور سلامتی بخش ترقی میں بے حد اہمیت حاصل ہے. کھیل میں بچے کے تخلیقی قوی کو
اظہار کا بڑا موقعہ ملتا ہے. یہی بنیادی اصول وہ سنگ بنیاد ہے جس پر ماننٹے سوری اور کنڈر گارٹن طریقہ
تعلیم کی نیو رکھی گئی. جو تصویریں بچے نرسری مدارس میں کھینچتے ہیں وہ ممکن ہے کہ حسن کارانہ نہوں لیکن وہ اس دنیا
کی دلچسپیوں کا مظہر ہوتی ہیں جسمیں بچہ رہتا سہتا اور چلتا پھرتا ہے۔

نرسری مدارس نے اوباشوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی حل کر دیا ہے. ان مدارس کی وجہ سے ان مضرت رساں
اثرات کو مٹا دیا ہے جو بچوں کی زندگی پر بُرے خاندان میں نشو و نما پانے سے پڑتا تھا. ہندوستان کے بیشمار
والدین جاہل اور بہت سے نکھٹو اور بعضے بدمعاش ہیں. اگر بچے اس فاسد ماحول سے کم از کم کچھ عرصہ کے
لئے دور رکھے جائیں اور اُن پر کسی ہمدرد و شفیق معلمہ کی نگرانی رہے تو غریب بچوں کے لئے باعث رحمت ہوگا
اور وہ صحت و سلامتی کے ساتھ ترقی کر سکیں گے. یہ نہایت دلچسپ تجربہ ہوگا مگر ذرا زیادہ خرچ ہوگا اور صرف ولایت
اور امریکہ جیسے دولتمند ممالک بڑے پیمانہ پر اس کام کا آغاز کر سکتے ہیں. ہندوستان کے بعض یتیم خانہ اور
مشن اسکول کوشش کریں تو شاید کچھ فائدہ پہونچ سکے۔

اب ابتدائی مدارس کو لیجئے. یہاں کے اُستادوں کی تنخواہیں بالکل کم ہیں اور نصاب میں مضامین
کا طومار ہے. ہمارے وطن میں تعلیم تحتانی مدرسہ سے شروع ہوتی ہے. چونکہ مدرس فاقہ مست ہوتا ہے
اسلئے وہ اپنے فرائض خاطرخواہ طور پر انجام نہیں دیتا. اور تحتانی مدرسہ کے چار سال محض قوت کی بربادی
ہوتی ہے اور بچوں کے لئے سکرات کا سا عالم ہوتا ہے. اس خامی پر طرہ نصاب کا طومار ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے
کہ بچہ لکھنا پڑہنا کچھ بھی خاطرخواہ طور پر نہیں سیکھتا. اسلئے سخت ضرورت ہے کہ نصاب کی پوری نظرثانی
کیجائے. مطالعہ فطرت کے اسباق نکالدئیے جائیں اور ہوم ورک اور کاپیوں کا پشتارہ کم کرایا جائے۔

کثرت کار سے بچوں کی صحت برباد ہو جاتی ہے۔ مغرب کے نظریوں کی اندھا دھند تقلید کی کوئی ضرورت نہیں
ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں جو بچپن کا لوجدار زمانہ ہوتا ہے آرام کو اتنی ہی اہمیت حاصل ہے جتنی کہ جامعی تعلیم
کے زمانہ میں۔ چار یا پانچ گھنٹہ کی تعلیم سے کچھ فائدہ نہیں۔ البتہ یہ زیادہ مفید ہوگا کہ زیادہ توجہ کے ساتھ
تعلیم دیجائے اور بقیہ وقت بچوں کے کھیل کود کے لئے وقف کر دیا جائے۔ ہم یہ محسوس نہیں کرتے کہ بچوں
کے نازک دماغوں پر زیادہ بار ڈالنے سے نشو و نما میں خلل پیدا ہوتا ہے اور حاصل یہ ہوتا ہے کہ بچے کی سوچنے
اور عمل کرنے کی قوت زائل ہو جاتی ہے۔

ہمین سب سے زیادہ نقائص ثانوی تعلیم کی منزل میں نظر آتے ہیں۔ یہاں تو بس جامعہ مرکز
توجہ ہوتی ہے۔ اور یہ خاموشی کے ساتھ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ثانوی تعلیم کی غرض وغایتہ یہ ہے کہ ہر لڑکے
اور ہر لڑکی کو یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے تیار کرے۔ مدرسہ اور مدرس کی کارگذاری نتائج امتحان پر منحصر ہوتی ہے
ممتحن بالعموم ایسے نرم دل اور فیاض ہوتے ہیں کہ نالائق لڑکے بھی کامیابی کے نمبر حاصل کر لیتے ہیں۔ اور
بالآخر ہم کو ایسے گریجوئیٹ ملتے ہیں جو صحیح انگریزی میں اپنی درخواست بھی نہیں لکھ سکتے۔ اس سے پتہ چلتا ہے
کہ ہمارے نظام تعلیم میں کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔

میری رائے میں نا اہلوں کی کاٹ چھانٹ ابتدائی منزل ہی میں ہونی چاہیئے۔ اسمیں نوجوانوں کا
فائدہ ہے اور یونیورسٹی کا بھی۔ حال حال میں رجحان یہ ہو چلا ہے کہ معیار تعلیم گھٹا دیا جائے۔ یہ درست ہے
کہ جامعات سے نا اہل گریجویٹ نکلتے ہیں مگر یہ ثانوی تعلیم کا قصور ہے۔ یہ بڑی سخت غلطی ہے جو ایک ہی
قسم کی ثانوی تعلیم رائج کی گئی ہے۔ یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ ہر لڑکا جامعی تعلیم کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ میرا
مطلب یہ ہرگز نہیں کہ جو لڑکے جامعہ کی تعلیم کے لئے نا قابل ہیں وہ بچہ یا شہری کسی حیثیت سے بھی کمتر
درجہ کے ہیں۔ اب اسناد کی کشش زائل ہو چلی ہے اور جو لوگ کہ گریجوئیٹ نہیں ہیں وہ بھی کاروبار میں کامیاب
اور اچھے شہری ہو سکتے ہیں۔ اگر کوئی طالبعلم اس ادبی قسم کی تعلیم کے قابل نہ ہو تو کرنا یہ چاہیئے کہ نصاب
بدل دیا جائے۔ یہی تو وہ مقام ہے جہاں پر ہمارے ماہرین تعلیم نے ٹھوکر کھائی ہے۔ انہوں نے کوئی
ایسے طریقہ تعلیم کا انتظام نہیں کیا جو غیر جامعی طلبہ کے لئے موزوں ہو۔ یہ صدر مدرسین اور اساتذہ کا فریضہ ہے
کہ وہ والدین کو سمجھا بجھا کر روکیں کہ بچوں کو اس تعلیم کے لئے جس کے وہ نا قابل ہیں۔ مجبور نہ کیا جائے اور
انکو کسی مناسب فنی یا پیشہ ورانہ تعلیم کی ترغیب دیں۔

اس مسئلہ کو اسطرح حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ثانوی پر پیشہ وری تعلیم کا رنگ چڑھا دیا گیا ہے
مگر اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ تجربہ بہت ہمت شکن ثابت ہوا کیونکہ اس کا آغاز ہی غلط اصول

پڑ ہوا۔ کوئی ایک پیشہ سیکھنے کیلئے دو گھنٹہ کا کام قطعی ناکافی ہے۔ اور جو لڑکے یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے کے آرزومند ہیں اُن کے لئے تو قوت اور وقت کی بربادی ہے جو کسی مفید مضمون کی تحصیل میں کام آسکتے تھے۔

اگر سختی کے ساتھ انتخابات کئے جائیں تو جامعی تعلیم کے لئے صرف معدودے چند لڑکے ملیں گے۔ اور تب ہی یہ حقیقت کھلیگی کہ تعلیم کے تین مقصد ہیں۔ اولاً تحصیل علم نہ صرف علم کی خاطر بلکہ اسلئے کہ علم دوسری ترقیوں کا ذریعہ بن سکے۔ ثانیاً سوچنے کی قوت، ثالثاً عمل کی قوت اور عقائد پر عمل پیرا ہونیکی ہمت۔ تعلیم در اصل ایسی حکمت عملی نہیں جس کے زور سے بچوں کو گھروں سے دُور رکھا جائے بلکہ وسیع ترین معنوں میں اسکا اطلاق پوری زندگی پر ہوتا ہے۔ یہ ایک تبلیغی کام ہے اور اُستاد ایک بڑا مبلغ ہے۔ سچا اُستاد سماج کا حاکم اور قوم کا بنانیوالا ہوتا ہے۔ (حفیظ اللہ بیرا)

تنقید و تبصرہ

اُردو جدید شاعری۔ مولفہ مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم، اے، ایل، ایل، بی یہ کتاب تین حصوں پر منقسم ہے۔ پہلے دو حصوں میں شعر و شاعری کی ماہیت اور اصناف اور اسباب و محرکات جدید شاعری پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے جس میں ایک حد تک ذوق و سلیقے سے کام لیا گیا ہے جو صاحبان ذوق کے لئے عجب نہیں کہ اک ارمغان نظر افروز ہو۔

تیسرے حصہ میں عصر حاضرہ کے شعرائے نامدار کا تذکرہ ہے اِس میں اُن کے مختصر حالات اور منتخب کلام جمع کیا ہے اور بڑی محنت و جانفشانی سے جمع کیا ہے مولف نے ہر ایک شاعر کے متعلق اپنی ذاتی رائے بھی پیش کی ہے نیز بعض شعرا کا آپسمیں تقابل بھی کیا ہے اُردو جدید شاعری پر اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ پہلی تالیف ہے جو قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے کے قابل ہے۔ اگرچہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد صاحبان بصیرت مولف موصوف کی اکثر رائیوں سے اِختلاف کرینگے لیکن لائق مولف نے بلا تکلف اپنی آزادانہ رائے ہر شاعر کے متعلق ظاہر کر دی ہے آئندہ مولفین کے لئے یہ کتاب ضرور کارآمد اور مُفید ثابت ہوگی۔

لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ قیمت مجلد عہ
ملنے کا پتہ :- مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

۲۔ مرمہ آمدن سی لفظی | از ابو المحاسن محسن عمان ہتیین۔ کراؤن سائز۔ تعداد صفحات ۴۰۔
قیمت ۲ر ملنے کا پتہ :۔ غلام دستگیر تاجر کتب چارکمان حیدرآباد دکن۔

مرمہ یہ کتاب جو قدیم زمانے سے ہمارے مدارس میں فارسی مصادر کی تدریس کے لئے مُفید تصور کیجاتی ہے نئے اسلوب اور جدید طریقہ پر ترتیب دی ہے۔ ابتدا میں ایک دیباچہ جو دراصل اس کتاب کی ایک حیثیت سے تاریخ کو پیش کرتا ہے تحقیقی طریقہ پر سپرد قلم کیا ہے۔ طریقہ تدریس اور قواعد مفیدہ کے تحت مُفید معلومات درج کئے ہیں۔ غالباً اس کتاب کی اشاعت سے طلبہ کا بہت زیادہ فائدہ ہوگا۔ اور مدرسین جو قدیم طریقہ پر اُس کو پڑہاتے تھے اُن کے خیالات میں بھی اسکے مطالعہ سے بہت بڑی تبدیلی ہوگی۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ مرمہ آئندہ بھی اِس قسم کے کام کو جاری رکھتے ہوئے فارسی کی تدریس کے لئے اور بھی کارآمد کتب کی تالیف فرماتے رہینگے۔

شذرات

۱۔ روئداد تعلیمی مدرسہ تحتانیہ عثمانیہ بلی تعلقہ اندولہ ضلع گلبرگہ شریف۔ | بتاریخ ۹ر فروری ۱۳۴۲ف مدرسہ ہذا کا جلسہ زیر صدارت جناب ڈاکٹر مول کر صاحب یف، آر، سی، یس سیول سرجن ضلع گلبرگہ شریف منعقد ہوا اول نمائش کمرہ کا معائنہ ہوا جس میں طلبا کا دستی کام مختلف دستکاری کے نمونہ جات نہایت نفاست سے بنائے گئے ہیں صدر نشین صاحب نے مدرسہ کی حالت پر اظہار مسرت فرماکر یہ اُمید ظاہر فرمائی کہ اس مدرسہ کو ہر ممکنہ ترقی جلد تر نصیب ہوگی۔

۲۔ جلسہ سالانہ مدرسہ وسطانیہ دیگلور۔ | بتاریخ ۱۷ و ۱۸ر فروری ۱۳۴۲ف مدرسہ وسطانیہ دیگلور کا جلسہ سالانہ زیر صدارت جناب مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب بی، اے، بی، ٹی صدر مہتمم تعلیمات صوبہ اورنگ آباد شاندار طریقہ پر منایا گیا۔

پہلے روز بتاریخ ۱۷ فروری ۱۳۴۲ف ۴ بجے دن سے جونیر و سینیر طلباء کے مختلف اسپورٹس اور فٹ بال و بیڈ منٹن میچ ہوئے جس کو حاضرین نے دلچسپی سے ملاحظہ فرمایا اور بہت محظوظ ہوئے۔

دوسرے دن مختلف طلبائے مدرسہ نے اردو، مرہٹی، اور انگریزی ڈرامے اور مکالمون کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔ اس کے بعد مولوی محمد اشرف علیخاں ناغشر مددگار مدرسہ نے مدرسہ کی رپورٹ پڑھی اور تعلیم کے مقاصد اور فوائد کو واضح کرتے ہوئے مدرسہ کے موجودہ انتظام و اصلاحات پر روشنی ڈالی جس میں خیاطی و نجاری کی تعلیم کے انتظام کے ساتھ بمقابلہ سابق ہر حیثیت سے مدرسہ کی نمایاں ترقی، صحن مدرسہ کی چمن بندی، گیمس کا معقول انتظام اسٹوڈنٹس لائیبریری کا قیام نمائش تعلیمی کا انعقاد وغیرہ قابل ذکر اور موجودہ صدر مدرس مولوی سید شرف الدین صاحب قادری ایم، اے، بی، ٹی کے زمانہ کی یادگار چیزیں ہیں۔

بعد ازاں جناب صدر نشین صاحب نے اپنے دستِ مبارک سے اسپورٹس و گیمس میں جیتنے والے کھلاڑیوں اور تعلیمی و اخلاقی امتیازی حیثیت رکھنے والے طلباء کو تمغہ جات (معطیہ صدر مدرس صاحب) و دیگر انعامات تقسیم فرمائے۔

۴۔ <u>جلسۂ قیام مدرسہ وسطانیہ لنگسکور</u>: مدرسہ وسطانیہ لنگسگور ایک قدیم مدرسہ ہونے کے علاوہ ایک زمانہ سے پوری کامیابی کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس کی کارگزاری کے نتائج سابقہ نہایت قابل قدر ہیں۔ یہ مدرسہ اپنے اچھے نتائج کے باعث ممالک محروسہ سرکار عالی کے مدارس میں درجہ اول کا مدرسہ رہا ہے۔ باوجود اس کے رعایا لنگسگور کی بدقسمتی سے چند دنوں تک یہ مدرسہ ترقی معکوس کرکے تحتانیہ بن گیا تھا۔ رعایائے لنگسگور نے اس عظیم نقصان کی تلافی کے لئے جد و جہد میں کوئی معمولی دقیقہ بھی فروگذاشت نہیں کیا۔ بالآخر عالیجناب مولوی فضل محمد خاں صاحب ناظم تعلیمات ملک سرکار عالی نے قیام مدرسہ وسطانیہ لنگسگور کی منظوری صادر فرمائی۔ اس مسرت میں بتاریخ ۲۴ فروری ۱۳۴۲ف روز شنبہ بوقت (۵) بجے شام بصدارت عالیجناب صدر مہتمم صاحب تعلیمات صوبہ گلبرگہ شریف بہ مقام مدرسہ وسطانیہ لنگسگور منجانب رعایا و وکلا لنگسگور ایک شاندار جلسہ منعقد کیا گیا تھا۔ پنڈت وینکٹ راؤ صاحب وکیل نے حالات مدرسہ بیان فرماتے ہوئے فرمایا کہ اس وقت یہاں جسقدر مقامی وکلا صاحبان اور ملازمان سرکار عالی موجود ہیں ان میں سے اکثر اسی مدرسہ کے تعلیم یافتہ ہیں جس پر اس مدرسہ کو بڑا فخر و ناز ہے۔ مدرسہ کی کارگزاری ہمیشہ اچھی اور قابل اطمینان رہی ہے مستقر لنگسگور ایک مرکزی مقام ہے اور وہ اس قابل ہے کہ اسکو تعلیم کا مرکز قرار دیا جائے اور اس مدرسہ کو بجائے وسطانیہ کے فوقانیہ کا درجہ دیا جائے۔ بوجہ شکست مدرسہ یہاں کا بے نظیر کتب خانہ مدرسہ وسطانیہ عالم پور پر منتقل ہو گیا ہے۔ اب اس مدرسہ کے لئے اس سے بہتر کتب خانہ کی ضرورت ہے

مولوی سید جمیل احمد صاحب وکیل نے مقامی حالات کے مدنظر صرف لنگسگور کی حد تک مدرسہ وسطانیہ میں معافی فیس کی ضرورت کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ ہماری ترقی کا دارومدار تعلیم پر ہے۔ اس ترقی یافتہ زمانہ میں جبکہ دیگر ممالک بہت کچھ علمی ترقی کرچکے ہیں اور ہرطرف ترقی ہی ترقی نظر آتی ہے ابھی ہمارے ملک دکن کو مزید ترقی کرنا باقی ہے۔ ہمارے ملک میں بیکاروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اسلئے نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیا کے ہر پیشے اور ہر ایک فن کی جداگانہ تعلیم کا عام طور پر مدارس میں انتظام ہونا زیادہ مناسب ہوگا۔ تاکہ ملک کا ہر شخص مفید اور کارآمد بن سکے۔ ہمارے علم پرور آقا سلطان العلوم خسرو دکن کی فیاضیوں نے قیام دارالترجمہ اور کلیہ جامعہ عثمانیہ کی بدولت ملک پر بڑا احسان فرمایا ہے۔ تاہم ملک کی تعلیم اور ترقی کا حضور پُرنور کو بے حد خیال ہے۔ سررشتہ تعلیمات بھی ہر طرح اپنے علم پرور آقائے ذیجاہ کا ہم خیال ترقی تعلیم میں ساعی اور کوشاں ہے۔ ہمارے ملک میں بھی علمی سیلاب بڑے شد و مد کے ساتھ ہر طرف پھیل رہا ہے۔ اور اہل ملک کو پورا یقین ہے کہ حضور پُرنور کے عہد ہمایوں اور مبارک سایۂ عاطفت میں ہمارا ملک دکن ایک دن ضرور ترقی کے مدارج اعلیٰ پر پہونچیگا"۔

پنڈت کپئے راؤ صاحب وکیل نے اپنی قابلانہ تقریر میں فرمایا کہ "بچو ہماری ہمدرد سرکار نے تمہاری تعلیم کے لئے روپیہ پانی کی طرح بہا دیا ہے اسکو ضایع نہ ہونے دو۔ اسکا خوب فائدہ اُٹھاؤ اور ملک اور مالک کی خدمت کے لئے بہترین فرد بننے کی کوشش کرو آیندہ دُنیا کے تم ہی قایم مقام بننے والے ہو اور یہ دُنیا کی مشین تم ہی سے چلنے والی ہے"۔ اسکے بعد صاحب صدر نے فرمایا کہ "میں اس امر کو محسوس کرتا ہوں کہ طلبار مدرسہ کے لئے مکان مدرسہ کافی نہیں ہے توسیع عمارت کی ضرورت ہے۔ کتب خانہ جو عالم پور پر منتقل ہوا ہے اب واپس نہیں ہوسکتا جدید بہتر سے بہتر کتب خانہ کی منظوری کی کارروائی کی جائیگی۔ اور یہ بھی فرمایا کہ اگر موجودہ مدرسہ وسطانیہ ترقی کرے گا تو اسکو ضرور مدرسہ فوقانیہ بنایا جاسکتا ہے۔ اور فرمایا کہ مدرسہ وسطانیہ کے تحت اس وقت ایک زراعتی مزرعہ قایم کیا جا رہا ہے جس سے زراعت پیشہ بچوں کے حق میں عمدہ اور مفید نتایج برآمد ہونگے"۔

دوسرے روز بتاریخ ۲۵ فروردی ۱۳۴۲ف روز یکشنبہ بوقت ۹ ساعت شب جناب محمد جیلانی صاحب صدر مدرس وسطانیہ لنگسگور نے مظاہرہ کیمپ فائر پیش کیا۔

۴۔ چنور ٹورنمنٹ۔ جناب رام کشن راؤ صاحب ناظر مدارس درجہ اول حلقہ چنور کے طلبار و مدرسین مرہون احسان ہیں کہ اُنہوں نے ٹورنمنٹ کی بنیاد قایم فرما کر طلبار کی حوصلہ افزائی اور مدرسین کے باہمی ارتباط و میل جول کا موقع دیا۔ دیسی کھیل مثلاً ون پاٹ، کبڈی، رسہ کشی وغیرہ کی تیاری مدارس سے

کیجاتی ہے۔

سالحال اس فائنل ٹورنمنٹ کا سنٹر اِندارم تعلقہ چنور قرار دیا گیا۔ اور مقابلہ کی تواریخ ۹ تا ۱۰ ماہ اردی بہشت ۱۳۴۲ف تعین چوتہی اردی بہشت سے ہی دوسرے مقامات کے طلباء آنے لگے۔ رہائش کے لئے مکان اور معمولی انتظام منجانب مدرسہ اندارم ہوا۔ سرپور و لکشٹی پیٹھ۔ لونوٹی (سرپور) بھیارم۔ یکور (چنور) نسپور (لکشٹی پیٹھ) سے طلباء اپنے ایک ایک مدرس کی زیر نگرانی آئے۔ مسلسل تین دن تک کھیلوں کے مقابلہ ہوتے رہے۔

چوتھے دن شام کے ۵ بجے سے جلسہ تقسیم انعامات منعقد کیا گیا۔ اور رونیکٹ مہتمم راؤ صاحب نے انعامات تقسیم فرمائے۔

۵۔ سالانہ اسپورٹس مدرسہ تحتانیہ قصبہ ایلگندل تعلقہ و ضلع کریم نگر۔ بتاریخ ۱۳ خورداد ۱۳۴۲ف روز دوشنبہ زیر صدارت جناب مولوی محمد عزیز الدین صاحب بی اے، بی ٹی ناظر درجہ اول مدارس ضلع کریم نگر جلسہ سالانہ اسپورٹس ترتیب دیا گیا۔ اسپورٹس ٹھیک ۵ بجے عمل میں آئے۔ اسکے اختتام پر سید رضا و محمد عبد الحکیم طالب علم جماعت دوم نے ورزش کے فوائد پر نہایت ہی شیریں زبانی و پر لطف لب و لہجہ کے ساتھ مکالمہ کیا۔ اسپورٹس کے کامیاب طلباء کو انعامات تقسیم کئے گئے۔

۶۔ جلسہ سالانہ مدرسہ تحتانیہ قصبہ وہلیر تعلقہ و ضلع ورنگل۔ بتاریخ ۲۰ خورداد کی علی الصباح تقریباً صبح ۶ ساعت سے تقریباً ۹ بجے تک اسپورٹس کرایا گیا۔ بتاریخ ۲۱ خورداد ۱۳۴۲ف صبح ۸ بجے سے طلباء مدرسہ نے نہایت ہی جوش عمل کے ساتھ بعد ادائی حمد باری تعالیٰ کے حضرت اقدس اعلیٰ حضور پرنور شہریار دکن و صاحبزادگان بلند اقبال و والا شان کی شان میں دعا خوانی بڑی خوش الحانی کے ساتھ ادا کی جنکی گونج نے نیز اس دلکش سین نے اہل دہ کے نفس پر ایسا اثر طاری کیا کہ ہر کہہ و مہ کا انبوہ مدرسہ ہذا کے کمپونڈ میں ایک بڑی حد تک اتحاد عمل کا نمایاں ثبوت تھا۔

بعدہٗ جلسہ ہذا کی صدارت کیلئے جناب مسٹر راموبی صاحب جو اس قصبہ کے ایک معزز ہستی ہیں سے ہی انتخاب ہوا اس اہتمام کی تکمیل کے بعد رپورٹ سالانہ بزبان تلنگو معتمد جلسہ نے پڑھی جسمیں بتلایا گیا کہ نسبتاً سال گذشتہ کے سالحال مدرسہ نے جو ترقی حاصل کی ہے رعایا میں علمی ترقیوں کا شوق اور طبقہ اساتذہ میں اپنی فرض شناسی کا مادہ راہ ترقی پر اپنا عمل کر رہا ہے جسمیں اہل دہ و دیگر کمبل پوش رعایا کو تعلیم کی اصلیت اور ہمارے نیک فرمانروائے دکن کی اپنے وفا شعار رعایا سے نیک سلوک کا احساس پیدا ہوتا گیا۔

چند پر مغز اور ہر دل افروز تقریروں کے بعد جیتنے والے طلبہ کو انعام اور تمغے تقسیم کئے گئے۔

فہرست کتب موجودہ بہ کتب خانہ انجمن اساتذہ بلدہ

اُردو ادب

۱	پہلواڑی	لالہ دیوان چند
۲	انتخاب سودا	جناب ابو محمد صاحب ثاقب کانپوری۔
۳	برگ سبز	میر محمد حسین فاضل نبیرہ میر محمد حسین خاں مرحوم۔
۴	انتخاب ہندی (ناگری خط) نظم	ڈاکٹر جعفر حسین۔
۵	انتخاب زرین۔	سید راس مسعود بی۔ اے۔
۶	درِ ثمین	تصدق حسین۔
۷	کلیات اقبال	جناب مولوی محمد عبدالرزاق صاحب ایچ' سی' ایس۔
۸	بلغ المبین	ابو محمد سید حسین سیفی عفی اللہ عنہ'
۹	انگریزی افسانے	عبدالقادر سروری و محمد محی الدین
۱۰	مضامین فرحت حصہ دوم	میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب اسسٹنٹ ہوم سکریٹری۔
۱۱	" " حصہ سوم	" " " " "
۱۲	مذاکرات	
۱۳	روح جاپان	نواب مسعود جنگ بہادر سابق ناظم تعلیمات ملک سرکار عالی۔
۱۴	عروس ادب	
۱۵	یادگار غالب	شمس العلماء مولوی الطاف حسین حالی۔
۱۶	شاہ ہنری چہارم	مترجمہ۔ مولوی سید وقار احمد مؤلف براوننگ و مدیر نظام گزٹ
۱۷	نیا چاند	ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور۔
۱۸	احمد خاں و عزیزہ	آقا محمد کرمانی۔ بی۔ اے۔
۱۹	طلسم تقدیر	ابوالحسنات سید غلام محی الدین قادری زور۔
۲۰	روح تنقید	" " " "
۲۱	گیتان جلی	مولینا ابوالمعانی نیاز فتح پوری۔
۲۲	گوئٹے کا فاوسٹ حصہ اول	ڈاکٹر سید عابد حسین ایم' اے' پی' ایچ' ڈی۔

نمبر	نام کتاب	مصنف / مترجم
۲۳	خطوط سر سید	ڈاکٹر سید راس مسعود (نواب مسعود جنگ بہادر)
۲۴	محاسن کلام غالب	ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم
۲۵	سب رس	(تصنیف ملا وجہی) مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب بی، اے
۲۶	منظر الکرام	مولوی سید منظر علی صاحب۔ اشہر
۲۷	تذکرہ ہزار داستان جلد چہارم	جناب لالہ سری رام صاحب ایم۔اے۔
	اصول تعلیم و تعلیمی نفسیات	
۲۸	فلسفہ تعلیم	ہربرٹ اسپنسر مترجمہ مولوی غلام حسین صاحب پانی پتی۔
۲۹	اساس التعلیم	محمد عبدالحق۔
۳۰	اصول تعلیم سلسلہ پنجاب	"
۳۱	رہنمائے تعلیم (ترجمہ سنچری اسٹوڈنٹس گائیڈ)	ٹی، ایس۔ ڈلسن صاحب
۳۲	تعلیمی علم النفس	مولوی نذیر احمد صاحب بی، اے
	طریقہ تعلیم	
۳۳	رہنمائے مدرسین لوئر پرائمری	پنڈت دینا ناتھ برما سکینڈ ماسٹر
۳۴	رہنمائے تعلیم	جے، اے۔ ایچ
۳۵	اشارات جغرافیہ	مولوی عبدالخالق صاحب
۳۶	ابتدائی مدارس ہند میں تعلیم	مہدی حسن زبیری
۳۷	اصطلاحات جغرافیہ بطرز جدید	پروفیسر قاضی جلال الدین مراد آبادی۔
۳۸	نوپیشہ مدرس	مترجمہ عبدالنور صدیقی و عبدالشکور۔
۳۹	مادرزاد گونگوں اور بہروں کی تعلیم	خانصاحب ڈاکٹر فضل احمد۔
۴۰	رفیق المعلمین	ایس۔ انوار نبی قریشی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔
۴۱	رفیق مدرسین	مخدوم علی۔ ٹی۔ ڈی۔ ناظر تعلیمات ضلع گلبرگہ
۴۲	اصول و طریقہ تعلیم حساب	لالہ بہاری لال صاحب۔ ریاضی ٹیچر
۴۳	رہنمائے مطالعہ قدرت عملی جغرافیہ	لالہ رتن لال، ایم۔ اے۔
۴۴	حساب کے سبقوں پر اشارے	لالہ بہاری لعل ریاضی ٹیچر
۴۵	معین مشاہدہ فطرت	گلاب چند کپور اینڈ سنز۔ لاہور

نمبر	کتاب	مصنف
۴۶	اشارات قواعد	مولوی عبد الخالق بچھرانوی
۴۷	تسہیل التعلیم حصہ اول	سید اصغر علی صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔
۴۸	فن تعلیم و طریقہ تعلیم کی کتاب	چوہدری فیض محمد خانصاحب منشی فاضل او ٹی۔
۴۹	رہنمائے علم التعلیم	سردار گوبند سنگھ صاحب گوہر۔

تعلیم الاطفال

نمبر	کتاب	مصنف
۵۰	طریقہ تعلیم ابجد خوانان	لالہ تلسی رام بی، اے، بی، ٹی۔
۵۱	فطرت اطفال	مترجمہ منشی فاضل مولوی حامد حسین صاحب
۵۲	گلزار نونہال	لالہ خوان چند چاولہ بی، اے۔
۵۳	فطرت اطفال	منشی فاضل مولوی حامد حسین صاحب قادری
۵۴	اطوار بازیچہ	ایچ، ٹی نوٹس

تعلیم متفرقات

نمبر	کتاب	مصنف
۵۵	سکوٹ ماسٹر ہنڈ بک	ایچ، ڈبلیو۔ ہگ پراونشل سکرٹری و مولوی کرامت اللہ
۵۶	طالب علم کی زندگی	فخر قوم جناب آغا محمد صفدر صاحب
۵۷	امور خانہ داری و تربیت اولاد	کوننس ای بارسٹر۔
۵۸	بوائے اسکاؤٹوں اور سکاوٹ ماسٹروں کے واسطے ضروری معلومات	
۵۹	پلے فار آل	رائے بہادر مسٹر آتما رام، ایم اے، ائی۔
۶۰	میوزک فار آل	
۶۱	ڈنمارک اور اسکا نظام تعلیم	سید محمد حسین جعفری بی، اے۔ نائب ناظم تعلیمات سرکار عالی
۶۲	ابتدائی تعلیم حصہ دوم	
۶۳	تعلیم باغبان	جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم، اے۔

۶۴	تعلیم روزگاری	جناب مولوی سجاد مرزا صاحب ایم، اے۔
۶۵	تاریخ التعلیم	" ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب
۶۶	پیام دیہات شدعار	سید خورشید حسن بی، اے، بی، ٹی۔
۶۷	جغرافیہ	مخدوم علی ناظر تعلیمات ضلع گلبرگہ شریف۔
۶۸	رسالہ کانفرنس التربیتہ والتعلیم	
۶۹	جاپان اور اسکا تعلیمی نظم و نسق	سید راس مسعود بی، اے۔
۷۰	ابتدائی تعلیم	

تاریخ و جغرافیہ

۷۱	البدر	حضرت مولانا مولوی محمد عبدالواسع صاحب
۷۲	البیرونی	سید حسن برنی، بی، اے۔
۷۳	مشاہیر یونان و روما جلد اول	مترجمہ سید ہاشمی فرید آبادی
۷۴	دربار اکبری	شمس العلما مولانا مولوی محمد حسین صاحب
۷۵	سیرۃ المحمود	جناب مولوی محمد عزیز مرزا صاحب مرحوم۔
۷۶	ہمارے رسول	خواجہ محمد عبدالحی فاروقی۔
۷۷	الخطبات الاحمدیہ فی العرب	ڈاکٹر سید احمد خان
۷۸	تاریخ الامت حصہ ہفتم	مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری
۷۹	تاریخ ہند قدیم۔	مسٹر کے، ایم۔ اے۔
۸۰	قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب	مترجمہ منشی پریم چند۔
۸۱	عرب و ہند کے تعلقات	مولانا سید سلیمان صاحب ندوی۔
۸۲	تاریخ ہند (حصہ دوم) ترجمہ اکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا۔	اسمتھ مترجمہ شیخ عبدالحمید صاحب۔

دینیات

۸۳	تفسیر القرآن از جلد اول تا ششم	ڈاکٹر سر سید احمد خان مرحوم

سائنس

۸۴	معیارت طلبار	سی۔سی۔کیلپ صاحب ایم۔اے۔
۸۵	فرسٹ ایڈ ٹو دی انجرڈ	ڈاکٹر مرزا کریم خاں خدیو جنگ ایم۔ڈی
۸۶	تندرستی	محمد واجد علی قادری

معاشیات

۸۷	زرعی افلاس ہند	ڈاکٹر جعفر حسن صاحب

اخلاقیات

۸۸	مضامین حکمیہ	مولوی عزیز حسن ابن مولوی الطاف حسین صاحب
۸۹	سیرت و کردار	" عبدالرحمٰن صاحب رئیس
۹۰	تعلیم الاخلاق	ناظم الاخلاق مولانا ذہین
۹۱	ہندو اخلاقیات	جے۔اے۔چنداوا کربی۔اے۔مترجمہ مولوی غلام ربانی صاحب
۹۲	تاریخ اخلاق یورپ جلد اول	عبدالماجد بی۔اے۔
۹۳	" " " حصہ دوم	" "

علم السیاست

۹۴	ریاست افلاطون	مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی

فلسفہ

۹۵	مبادی فلسفہ	میر حسن الدین بی۔اے۔
۹۶	مکالمات برکلے سوم	عبدالماجد بی۔اے۔
۹۷	مبادی علم انسان	مولوی عبدالباری ندوی

علم النفس

۹۸	نفسیات ترغیب	سید وہاج الدین احمد کندری
۹۹	فلسفہ اجتماع	عبد الماجد۔ بی۔ اے
۱۰۰	فلسفہ جذبات	" "
۱۰۱	نفسیات عنفوان شباب	مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم۔ اے۔

لغات

۱۰۲	لغات جدیدہ (عربی)	سید سلیمان ندوی
۱۰۳	وضع اصطلاحات (اردو)	مولوی وحید الدین صاحب سلیم

رپورٹ

۱۰۴	اسلامی تہذیب اور قومی تعلیم	مترجمہ محمد مسلم ایم۔ اے۔
۱۰۵	خطبات عالیہ حصہ اول	مرتبہ مولوی انوار احمد صاحب زبیری
۱۰۶	" " " دوم	" " " "
۱۰۷	" " " سوم	" " " "
۱۰۸	رپورٹ بہ اجلاس سی وششم	
۱۰۹	سالنامہ ۳۵ و ۱۹۳۶ء	

تفریق کے سوالات اکثر آخر الذکر طریقہ سے بھی حل کئے جاتے ہیں اور یہی طریقہ آجکل زیادہ مناسب سمجھا گیا ہے۔ اس میں یہ بات بچوں کے ذہن نشین کرانی ہوتی ہے کہ مفروق منہ ظاہر کرنیوالا عدد مفروق اور تفریق کو جمع کرنے سے آتا ہے۔

۴۵ - ۷ اکو اس طرح بھی ظاہر کر سکتے ہیں کہ ۱۷ میں کونسا عدد جمع کیا جائے کہ حاصل جمع ۴۵ ہو سوال ہذا میں تفریق کا کوئی لفظ بھی نہیں پایا جاتا۔

طریقہ تتمی یا تکمیلی جمع کا کافی تصور دلانے کی غرض سے ابتدا میں ایسے سوالات دئے جائیں جن میں مفروق منہ کا ہر درجہ کا ہندسہ مفروق کے اسی درجہ کے ہندسہ سے بڑا ہو۔

سیکڑہ	دہائی	اکائی
۴	۸	۹
۲	۵	۴
۲	۳	۵

مثال ۴۸۹ - ۲۵۴ یعنے ۲۵۴ میں کیا جمع کیا جائے کہ حاصل جمع ۴۸۹ ہو۔ اس کا عمل ذیل میں بتایا جاتا ہے۔

اکائیوں میں کتنی اکائیاں جمع کی جائیں کہ کل ۹ اکائیاں ہوں گی۔ جواب (۵) یہ ہندسہ اکائی کے خانہ میں لکھدیا جائے۔

۵۔ دہائیوں میں کتنی دہائیاں جمع کی جائیں کہ کل آٹھ دہائیاں ہوں گی ۔جواب (۳) یہ ہندسہ دہائی کے خانہ میں لکھدیا جائے۔

۲۔ سیکڑے میں کتنے سینکڑے جمع کئے جائیں کہ کل ۴ سینکڑے ہوں گے جواب (۲) یہ ہندسہ سینکڑے کے خانہ میں درج کیا جائے اور کل جواب ۲۳۵ بتایا جائے۔ مفروق اور حاصل تفریق کو اگر جمع کیا جائے تو نتیجہ مفروق منہ کے برابر ہوگا۔ ۲۵۴+۲۳۵=۴۸۹۔

بعض وقت تفریق بہ طریقہ تکمیل جمع کی پڑتال طریقہ تحلیل یا طریقہ مساوی جمع کے ذریعہ سے کرائی جائے تاکہ بچوں کو اس کا اطمینان ہوجائے کہ تینوں طریقے ایک ہی نتیجہ کو پہونچاتے ہیں اور طریقہ تتمی یا تکمیلی جمع ان کی سمجھ میں آسانی سے آئے گا۔

اس کے بعد ایسے سوالات دئے جائیں جنمیں مفروق منہ کے چند درجوں کے ہندسے مفروق کے ہندسوں سے چھوٹے ہوں۔

مثال ۳۳۴ - ۱۴۷

۱	۸	۷
۱	۴	۷
۳	۳	۴

ابتدا میں ان سے ۱۴۷+۱۸۷ کا حاصل جمع دریافت کرایا جائے اور یہ بات ان سے اخذ کرائی جائے کہ ۳۳۴ کا عدد دو اعداد ۱۴۷ اور ۱۸۷ کا حاصل جمع ہے۔ لیکن جواب میں کا ہر ہندسہ ان دو ہندسوں

کی حقیقی جمع کو ظاہر نہیں کرتا۔ مثلاً ۷ اور ۷ کا حاصل جمع ۱۴ ہے ۴ نہیں ہے۔ جو جواب میں تبلایا گیا ہے۔ ۱۴ کا صرف اکائی کا ہندسہ وہاں رکھکر ایک دہائی حاصل لیکر دہائیوں میں ملائی جاتی ہے۔

طلبہ کو یہ سمجھایا جائے کہ اگر ۳۳۴ کا عدد ۱۴۷ اور کسی دوسرے عدد کا حاصل جمع ہے تو یہ ۴ جو ۷ سے چھوٹا عدد ہے، اور دوسرے عدد کی اکائیوں کا حاصل جمع نہیں ہوسکتا بلکہ وہ ہندسہ ۴ کا اس حاصل جمع کی اکائیوں کو ظاہر کرتا ہے جو عدد ۷ کے اوپر کے درجہ کا ہو۔ اور جس کا اکائی کا ہندسہ ۴ ہے یعنی ۱۴ متذکرہ بالا سوال کا طرز عمل حسب ذیل ہوگا۔

سیکڑہ	دہائی	اکائی
۳	۳	۴
۱	۴	۷
۱	۸	۷

(۱) دس کی تکمیل کرکے ۷ اور ۳ دس۔ ۱۰ اور ۴ چودہ ۷ اکائی کے خانہ میں لکھکر حاصل کا ۱ لیا جائے۔

۱ اور ۴ پانچ ۵ اور ۵ دس ۱۰ اور ۳ تیرہ ۸ دہائی کے خانہ میں لکھکر حاصل کا ۱ لیا جائے۔

۱ اور ۱ دو ۲ اور ۱ تین ۱ سینکڑہ کے خانہ میں لکھدیا جائے۔ اور ۱۸۷ تبایا جائے۔

۲۔ راست جمع سے۔

۷ اور ۷ چودہ ۷ اکائی کے خانہ میں لکھدیں اور ۱ حاصل کا لیں اور ۴ پانچ ۵۔ اور ۸ تیرہ ۸ دہائی کے خانہ میں لکھدیں اور ۱ حاصل کا لیں ۱ اور ۱ دو ۲ اور ۱ تین ۱ سینکڑہ کے درجہ میں لکھدیں اور جواب ۱۸۷ بتائیں۔

یہ طریق گویا مساوی جمع کی ایک شاخ ہے۔ اس کو بعض اصحاب جمع استفہامی (Interrogative Addition) کہتے ہیں کیونکہ دوران عمل میں حسب ذیل طور پر سوالات کئے جاتے ہیں۔

مثلاً ۷ اور کتنے ۱۴؟ ۷ اور ۷ چودہ ۷ اکائی کے درجہ میں لکھدیتے ہیں حاصل آیا ۱، ۱ اور ۴ پانچ ۵ اور کتنے ۱۳؟ ۸ اور ۵ تیرہ ۸ دہائی کے درجہ میں لکھتے ہیں۔ حاصل آیا ۱، ۱ اور ۱ دو ۲ اور کتنے ۳؟ ۱ ۲ اور ۱ تین ۱ سیکڑہ کے خانہ میں لکھتے ہیں۔ اور جواب ۱۸۷ بتاتے ہیں۔

عمل بذریعہ شکل

طرزِ عمل۔ ۷ میں کیا جمع کئے جائیں کہ ۱۴ ہو (مفروق کو بیج یا اور کسی چیزوں سے ظاہر کیا جائے) ۷ بیج زیادہ کرکے ۷ کا ہندسہ اکائی کے خانہ میں لکھدیا جائے اب اکائی کے خانہ میں ۱۴ بیج ہوں گے ان کو ۴ اکائیاں اور ایک دہائی کی صورت میں ظاہر کیا جائے اس جدید دہائی کو دہائیوں کے خانہ میں جمع کرنے سے ۵ دہائیاں ہوں گی۔

۵ دہائیوں میں کتنی دہائیاں جمع کیجائیں کہ ۱۳ دہائیاں ہوں ؟ ۸ دہائیاں بیج (تھیلیوں کی صورت میں) جمع کئے جائیں اور ۸ کا ہندسہ دہائیوں کے خانہ میں لکھدیا جائے اب دہائیوں کے خانہ میں ۱۳ دہائیاں (تھیلیاں ہیں) جن میں سے دس دہائیوں کو سیکڑہ کی صورت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔جب سیکڑہ کے خانہ میں منتقل کیا جائے تو کل سیکڑے ۲ ہوں گے ۔ ۲ سیکڑے میں کیا جمع کیا جائے۔ اور اس ایک سیکڑہ کو سیکڑے کے خانہ میں لکھدیا جائے۔جواب ۱۸۷ آئے گا۔

طریقہ تکمیلی یا تتمی جمع میں لفظ تفریق کا استعمال بالکل جمع نہ کیا جائے تفریق کو جمع کی نئی شکل میں بتایا جائے۔ متذکرہ بالا سوال کو حسب ذیل مرتب کیا جائے۔ دو اعداد کا حاصل جمع ۳۲۴ ہے ان میں سے ایک عدد ۱۴۷ ہے دوسرا عدد دریافت کرو۔ ۱۴۷ + ؟ = ۳۲۴

یا
۱۴۷
؟؟؟
۳۲۴

مثال ۳۳۴۵ - ۱۹۸۷

۳	۳	۴	۵
۱	۹	۸	۷
۱	۳	۵	۸

مثال مذکور کا عمل ذیل میں درج ہے ۷ اور ۸ پندرہ ۸ اکائیاں کے خانہ میں لکھکر ایک حاصل کا لیا جائے ۱ اور ۸ ۹ اور ۵ چودہ ۵ دہائی کے خانہ میں لکھکر حاصل کا ایک لیا جائے۔ ۱ اور ۹ دس ۱۰ اور ۳ تیرہ۔ ۳ سیکڑے کے خانہ میں لکھدیا جائے۔ اور ۱ حاصل کا لیا جائے ۱ اور ۱ دو ۲ اور ۱ تین۔ ۱ سیکڑہ کے خانہ میں لکھدیا جائے۔ اور جواب ۱۳۵۸ بتایا جائے۔

طریقہ ہذا ایں مثل جمع کے قاعدہ کے حاصل آتا ہے کیونکہ یہ جمع کا ہی طریقہ ہے تفریق کے سوالات حل کرنے کا یہ ایک راست اور قدرتی عمل ہے لہذا یہ طریقہ عام طور پر رائج ہو تو نامناسب نہیں ہوگا۔

تفریق سکھانے کے متعلق اور چند ہدایات۔

(۱) مروجہ طریقے (Formal Methods) بالکل ابتدائی حالت میں چھوٹے چھوٹے طلبہ کو بتائے جائیں۔ زبانی مشق سے ہی ان میں مہارت پیدا کی جائے۔ اور کافی مشق کے بعد قاعدے بتائے جائیں۔

(ب) چھوٹے بچوں کو اصطلاحات مفروق ۔ مفروق منہ ۔ حاصل تفریق وغیرہ سے پریشان نہ کیا جائے۔ صرف بڑا عدد۔ چھوٹا عدد۔ باقی وغیرہ الفاظ بتا دئے جائیں تو کافی ہے۔

(ج) تفریق کے سوالات کی پڑتال جمع کے ذریعہ سے کرائی جائے۔

(د) اگر کسی سوال میں بہت سے صفر واقع ہوں تو مفروق اور مفروق منہ ہر دو سے ایک ایک منہا کرنے سے تفریق کے عمل میں سہولت ہوگی۔ مثلاً ۱۰۰۰-۵۶۴ کا عمل کرتے وقت مفروق منہ اور مفروق ہر دو میں سے ایک ایک تفریق کرنے کے بعد سوال مذکور ۹۹۹-۵۶۴ کی

کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اب آسانی کے ساتھ اور صحیح طور پر جواب معلوم ہو سکتا ہے۔
جب بچے تفریق کے سوالات حل کرنے میں مشاق ہوں گے تو ان کو ایسے عبارتی سوالات دئے جائیں۔ جن میں جمع اور تفریق دونوں عمل کرنے ہوں گے۔
مثال۔ ایک مدرسہ کی تعداد طلبہ درج رجسٹر ۲۲۰ ہے ایک روز صغیر جماعت میں ۵۹، اول جماعت میں ۴۱، دوم ۴۷ سوم میں ۳۵ اور چہارم ۲۰ طلبہ حاضر تھے۔ تو بتاؤ کہ کتنے غیر حاضر ہوں گے۔
اس قسم کے سوالات سے بچوں میں سوچنے کی عادت پیدا ہوگی۔ سوال میں کیا چیز دی گئی ہے۔ اور جواب کیا طلب کیا گیا ہے۔ جواب لانے کے لئے کیا عمل کرنا ہوگا۔ وغیرہ باتوں پر وہ غور کریں گے۔ مدرس پہلے ہی کچھ نہ بتائے ورنہ بچوں کی عقلی قوی کی مطلق ورزش نہ ہوگی اور وہ ہمیشہ مدرس کی امداد کے محتاج رہیں گے۔ بچے اگر نہ سمجھے ہوں تو انکی مشکل قدرے دور کی جائے۔ سب سوال حل کرکے نہ بتایا جائے۔

سوال مذکور کو حل کرنے میں بچے پہلے پانچ جماعتوں کے حاضر طلبہ کی تعداد دریافت کریں گے۔ تمام جماعتوں کے حاضر طلبہ کی تعداد کو جمع کرنے سے حاصل جمع ۲۰۲ معلوم ہوا۔ جملہ تعداد درج رجسٹر ۲۲۰ ہے لہذا ۲۲۰ میں سے ۲۰۲ منہا کرنے سے ۱۸ تعداد غیر حاضر طلبہ کی ہوگی

صغیر	۵۹
اول	۴۱
دوم	۴۷
سوم	۳۵
چہارم	۲۰
جملہ	۲۰۲
	۲۲۰

درج رجسٹر	۲۲۰
حاضر	۲۰۲
غیر حاضر	۱۸

بعد میں انکو اس طرح عادی بنایا جائے کہ وہ ایک ہی عمل میں جواب لاسکیں سوال مذکور کو حسب مندرجہ حاشیہ لکھا جائے گا اور طرز عمل حسب ذیل ہوگا۔ ۵، ۱۲، ۱۳، ۲۲، اور ۵ تین ۳ ۵ نیچے لکھدیں حاصل آئے ۲، ۳، ۵، ۸، ۱۲، ۲۱، اور ۱ بائیس ۲۲ ا نیچے لکھدیں اور جواب ۱۸ بنائیں

صغیر	۵۹
اول	۴۱
دوم	۴۷
سوم	۴۵
چہارم	۲۰
غیر حاضر	۱۸

یہی سوال جمع کے طرز پر بھی ظاہر کیا جا سکتا ہے ۔ جس میں آخری سطر مقررہ رکھی جائے جیسا کہ ذیل میں بتایا گیا ہے ۔ اس میں عمل اوپر سے نیچے کی طرف کرنا ہوگا ۔ مثلاً ۹، ۱۰، ۱۷، ۲۲ اور ۲۸ تیس ۸ اکائی کے خانہ میں لکھدیں اور حاصل ۳ ۔ ۳، ۸، ۱۲، ۱۶، ۱۹، ۲۱ اور ۱ بائیں ۱ دہائی میں لکھدیں اور جواب ۱۸ بتائیں ۔

صغیر	۵ ۹
اول	۱۴
دوم	۴۷
سوم	۳۵
چہارم	۴۰
عنصر حاضر	(۲ ۸)
	۲۲۰

صحت اور عجلت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر ایک طرز کے صرف ۵ یا ۶ سوالات حل کرانے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا ۔ اس کے لئے متعدد سوالات کرانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ بالکل عادی بن جائیں حساب میں زیادہ تر عادہ ۔ عمل و ذاتی کوشش کی ضرورت ہے قاعدہ رٹانے سے یا حفظ کرانے سے کوئی بات پختہ طور پر ذہن نشین نہیں ہو سکتی ۔ بلکہ جلد بھول جانے کا اندیشہ ہوتا ہے لہذا مشق کی سخت ضرورت ہے ۔ ساتھ ہی ساتھ سوالات کے جانچ کی بھی ضرورت ہے ۔ سوالات کی جانچ اگر احتیاط سے نہ ہو تو اس کی اہمیت کم ہوگی اور بچے لاپرواہ ہوں گے

ضرب

ضرب متواتر جمع (۱) :۔

ضرب کی تفہیم نئے سبق یا نئے قاعدے کی حیثیت سے نہ دیجائے بلکہ تجربہ کے طور پر بچوں کو یہ سمجھایا جائے کہ ایک ہی عدد کی متواتر جمع کا مختصر طریقہ ضرب کہلاتا ہے ۔ یہ بات ایک دو مثالوں کے ذریعہ ان کے ذہن نشین کرائی جائے ۔

مثال ۲ + ۲ + ۲ + ۲ = ۸

اس مثال میں ۲ چار مرتبہ لے کر ان کی جمع کیگئی ہے اور یہ معلوم کیا گیا ہے کہ ۲ چار مرتبہ لینے سے ۸ ہوتے ہیں اس کو حسب ذیل طریقہ سے بھی ظاہر کر سکتے ہیں

(۱) ۲ + ۲ + ۲ + ۲ = ۸ ۔ (ii) ۲ چوکے ۸ (iii) ۲ × ۴ = ۸

(۱) جمع سے ۲ ۲ ۲ ۲ ۸ (ii) پہاڑے سے ۲ چوکے ۸ (iii) ضرب سے ۲ ۴× ۸

علامت × مرتبہ یا دفعہ کی نشانی ہے۔

اسیطرح ۳ + ۳ + ۳ + ۳ + ۳ = ۱۵ یہاں تین کے عدد کو ۵ مرتبہ لے کر جمع کیا گیا ہے۔ اس کو ۳ × ۵ سے ظاہر کر سکتے ہیں۔ اور ۳ پنجے ۵ کہتے ہیں۔

ان دو مثالوں سے بچوں کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرائی جائے کہ ضرب گویا ایک ہی عدد کو متعدد بار جمع کرتا ہے بعد میں ضرب کی علامت کا مطلب سمجھایا جائے کہ وہ علامت (×) متعدد بار جمع کے مختصر طریقہ کو ظاہر کرتی ہے۔ ۲ × ۳ سے مراد یہ ہے کہ ۲ کا عدد ۳ بار جمع کرنا ہے۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ علامت (×) مرتبہ یا دفعہ کو ظاہر کرتی ہے اور پڑھتے وقت ۲ × ۳ کو ۲ ضرب ۳ کہتے ہیں۔ مقرون اشیاء کی مدد سے یہ بات اخذ کرائی جائے کہ ۳ × ۲ سے وہی نتیجہ حاصل ہوتا ہے جو ۲ × ۳ سے حاصل ہوتا ہے

۳ × ۲ = { ٥ ٥ / ٥ ٥ / ٥ ٥ } = ۶ ، ۲ × ۳ = { ٥ ٥ ٥ / ٥ ٥ ٥ } = ۶

ضرب کا تصور اس وقت بچوں کو دلایا جائے جبکہ ان کو ایک ہی عدد متعدد بار جمع کرنے کی کافی مشق ہو جائے۔ تاکہ اس صورت میں وہ ضرب کے قاعدہ کو ٹھیک طور پر سمجھ سکیں اور ایک ہی عدد کو متعدد بار جمع کرنے کا مختصر طریقہ ان کو معلوم ہونے پر اسی طریقہ کو پسند کریں۔ مثلاً ۲ چھ مرتبہ لکھکر ان کو جمع کرنے کے بجائے ۲ × ۶ کی صورت میں وہی سوال لکھنا زیادہ مختصر اور مفید سمجھیں گے۔

۲۔ ضرب کا ابتدائی سبق۔

(ا) جمع کو ضرب سے تعبیر کرنا۔

ضرب کے معنی سمجھائے جائیں

۶ =	٥ ٥	٥ ٥	٥ ٥	= ۳ × ۲	
۱۲ =	٥ ٥ ٥ ٥ (۳)	٥ ٥ ٥	٥ ٥ ٥	٥ ٥ ٥	= ۴ × ۳
۲۰ =	٥ ٥ ٥ ٥ ٥	٥ ٥ ٥ ٥ ٥	٥ ٥ ٥ ٥ ٥	٥ ٥ ٥ ٥ ٥	= ۵ × ۴

ابتدا میں بیج یا گولیاں استعمال میں لاکر ضرب کا تصور دلایا جائے۔ ایک ہی مقدار کو متعدد بار ظاہر کرنے کے لئے مندسوں کے تاش (کارڈ) استعمال میں لائے

جائیں اور گولیوں کے ہر ایک ڈھیر یا گچھے پر تعداد بتانے والے ہندسہ کا کارڈ رکھدیا جائے ۔ اور تحریری عبارت ہندسوں کے ذریعہ جمع کی علامت کا استعمال کر کے ظاہر کی جائے مثلاً ۔

۲ + ۲ + ۲ یعنے ۲ تین مرتبہ = ۲ × ۳ = ۶

اور اسی تحریر کو الفاظ میں ضرب کا استعمال کر کے بھی بتایا جائے ۔

معرّہ خانوں کی تکمیل بچوں سے کرائی جائے

۲ + ۲ + ۲ + ۲	=	۲	× ۴	= ۸
۴ + ۴ + ۴	=	۴	× ۳	=
۳ + ۳ + ۳ + ۳ + ۳		۳	×	=
۵ + ۵ + ۵ + ۵			×	

ب ۔ مساوی کپوں کی جمع سے چیزوں کی تعداد دریافت کرنا ۔

(۱) تیلیوں کے ذریعہ

ہر صورت میں نتیجہ فوراً بتایا جائے بچے تجربہ سے یہ معلوم کر لیں کہ ہر صورت میں نتیجہ وہی ہوگا

۳ تیلیاں ۴ مرتبہ
۴ " ۳ "
۲ " ۶ "
۶ " ۲ "

۱۲ تیلیاں = ۲ × ۶ = ۶ × ۲ = ۳ × ۴ = ۴ × ۳

۲ ۔ گولیوں کے ذریعہ ۔

بچوں کو کہا جائے کہ وہ ۱۸ گولیاں اٹھائیں جائیں اور ان سے مساوی گولیوں کے جتنے کپے بن سکیں لگے بنوائے جائیں اور نتیجہ تحریری طور پر ظاہر کرایا جائے ۔

{ ۹ × ۲ = ۱۸) ۲ × ۹ = ۱۸) } , { ۶ × ۳ = ۱۸) ۳ × ۶ = ۱۸ }

{ ۱۸ × ۱ = ۱۸ } ۱ × ۱۸ = ۱۸ }

ضرب میں مہارت پیدا کرنی ہو تو پہلے بچوں کو پہاڑوں سے اچھی طرح واقف کرایا جائے ۔ پہاڑوں کے اصول پر ہی ضرب کا قاعدہ مبنی ہے ۔ پہاڑوں کا تصور دلانے کے لئے چیزوں کے (مساوی مقدار کے) کپوں کی گنتی کرانا مناسب ہے ایک ہی عدد کو متعدد بار جمع کرنا ۔ گویا پہاڑوں کی تعلیم کے لئے ۔ ان کو تیار کرنا ہے ۔

پہاڑے علم حساب میں پہاڑے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ انہیں کی بدولت روزمرہ لین دین کے حساب، جلد اور صحت کے ساتھ حل کئے جاتے ہیں۔ جو شخص پہاڑوں سے خوب واقف ہے اس کو سوالات حل کرنا بالکل معمولی کام معلوم ہوتا ہے روزمرہ کاروبار کے اور بازاری لین دین کے سوالات آسانی سے حل کر سکتا ہے۔ زمانہ قدیم میں ۳۰ تک کے ضربی پہاڑے۔ اور پاؤ، آدھا۔ پون۔ سوا۔ ڈیڑھ = وغیرہ کے کسری پہاڑے بچوں سے حفظ یاد کرائے جاتے تھے لیکن بلا اصول بچوں سے پہاڑے یاد کرانے سے ان کے دماغ پر بہت زیادہ بار پڑتا ہے حقیقت میں اکثر پہاڑوں کا استعمال روزانہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ اور جو پہاڑے روزانہ استعمال میں لانے کی ضرورت ہے وہ سب صغیر جماعت میں پڑھانا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ ایک ہی سال میں سب پہاڑے پڑھانے سے اور بلا اصول یاد کرانے سے بچوں کے دماغ پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ ایک دفعہ بچوں کو پہاڑوں کی ساخت (بناوٹ) معلوم ہو جائے تو وہ خود بخود پہاڑے تیار کر سکتے ہیں۔ اور خود کی کوشش سے تیار کئے ہوئے پہاڑے یاد بھی رہ سکتے ہیں۔

پہاڑوں کی تعلیم دیتے وقت اشیار محوسہ کا استعمال ضرور اور کافی طور پر کیا جائے پہلے تین یا چار پہاڑوں کا تصور اگر اچھی طرح دلایا جائے۔ تو پہاڑے کیا چیز ہے۔ یہ معلوم کر کے آئندہ کے پہاڑے بھی وہ جلد بنا سکیں گے۔

دو کا پہاڑہ مدرس پہلے دو گولیاں اٹھائے اور ان کو میز پر یا بچوں کے سامنے رکھدے بچوں سے بھی یہی عمل کروائے اور ان سے پوچھے کہ میز پر یا ان کے سامنے گولیوں کے کتنے کپے ہیں؟ جواب "ایک" اخذ کرایا جائے اس کپے میں گولیاں کتنی ہیں؟ جواب "دو گولیاں" بذریعہ سوال و جواب بچوں سے یہ بات اخذ کرائی جائے کہ دو گولیاں ایک مرتبہ لیجائیں تو جملہ دو گولیاں ہوتی ہیں۔

اس کے بعد ایک کپے میں دو گولیاں ایسے دو کپے (ڈھیر) میز پر یا بچوں کے سامنے رکھدئے جائیں اور بچوں سے بھی عمل کرایا جائے اور ان سے پوچھا جائے کہ اب ان کے سامنے یا میز پر کتنے کپے ہیں؟

جواب "دو" نکلوایا جائے۔ ہر ایک کپے میں گولیاں کتنی ہیں۔ دو دو کپوں میں ملکر کل گولیاں کتنی ہوئیں؟ جواب "۴ گولیاں" نکلوایا جائے۔ بذریعہ سوال و جواب

بچوں سے یہ بات اخذ کرائی جائے کہ ۲ گولیاں اگر ۲ مرتبہ لی جائیں تو جملہ ۴ گولیاں ملتی ہیں۔

اس کے بعد ہر ایک کپے میں ۲ گولیاں رکھکر ۳ کپے بنائے جائیں اور بچوں سے بنوائے جائیں اور مندرجہ بالا طریقہ سے بذریعہ سوال وجواب یہ بات بچوں سے اخذ کرائی جائے کہ ۲ گولیاں ۳ مرتبہ لینے سے جملہ ۶ گولیاں ہوتی ہیں۔

اسیطرح دو دو گولیوں کے چار پانچ چھ کپے بناکر اور بچوں سے بنواکر گولیوں کی جملہ تعداد ان سے دریافت کرائی جائے اور بذریعہ سوال وجواب یہ بات نکلوائی جائے کہ دو گولیاں ۴ مرتبہ ۴ لینے سے ۸ گولیاں ہوتی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اسطرح دو کا پہاڑہ پورا بتایا جائے اور بچوں سے بنوایا جائے اور مختلف چیزیں استعمال میں لاکر پہاڑہ کی تصدیق کرادی جائے۔

* یعنے ۲ گولیاں ۵ مرتبہ

○○ دو گولیاں ایک مرتبہ لیجائیں تو جملہ دو گولیاں ہوتی ہیں۔

○○ ○○ ۲ گولیاں دو مرتبہ لیجائیں تو ۴ گولیاں ہوتی ہیں۔

○○ ○○ ○○ ۲ گولیاں ۳ مرتبہ لیجائیں تو ۶ گولیاں ہوتی ہیں۔

○○ ○○ ○○ ○○ ۲ گولیاں ۴ مرتبہ لیجائیں تو جملہ ۸ گولیاں ہوتی ہیں۔

اس طرح ۲ کا پہاڑہ آخر تک بتایا جائے اور بچوں سے انہی کی کوشش سے بنوایا جائے ایک ہی روز میں سالم پہاڑہ نہ بتایا جائے اور کہا جائے کہ ایک بار دو (دفعہ) کیلئے ایکے۔ دو بار (دفعہ) کیلئے دوے یا دونے۔ تین بار یا مرتبہ کے لئے تئے چار بار یا چار مرتبہ کے لئے چوکے کہتے ہیں۔ ۲ کا پہاڑا حسب ذیل طور پر پڑھوایا جائے جو بذریعہ شکل ذیل درج کیا جائے۔

۲ × ۱ = ۲		دو ایکے دو
۲ × ۲ = ۴	○○	دو دونے چار
۲ × ۳ = ۶	○○ ○○	۲ تیئے چھ
۲ × ۴ = ۸	○○ ○○ ○○	دو چوکے آٹھ
۲ × ۵ = ۱۰	○○ ○○ ○○ ○○	دو پنجے دس
۲ × ۶ = ۱۲	○○ ○○ ○○ ○○ ○○	دو چھکے بارہ
۲ × ۷ = ۱۴	○○ ○○ ○○ ○○ ○○ ○○	دو ستے چودہ
۲ × ۸ = ۱۶	○○ ○○ ○○ ○○ ○○ ○○ ○○	دو آٹھے سولہ
۲ × ۹ = ۱۸	○○ ○○ ○○ ○○ ○○ ○○ ○○ ○○	دو نوے اٹھارہ
۲ × ۱۰ = ۲۰	○○ ○○ ○○ ○○ ○○ ○○ ○○ ○○ ○○	دو دہائی بیس

اسی طرح دو کا پہاڑا بچوں سے بنوا کر ان سے ان کی سلیٹوں پر لکھوایا جائے اور بعد میں یاد بھی کرایا جائے اور مشق کے لئے مندرجہ ذیل قسم کے مشقی کارڈ دیکر ان میں معرئی خانوں کی تکمیل بچوں سے کرادی جائے ۔

۳ × ۱ = [۳]
۳ × ۲ =
۳ × ۳ =
۳ × ۴ =
۳ × ۵ =

پہاڑوں کے مشقی کارڈ

۳ × ۶ = [۱۸]
۳ × ۷ =
۳ × ۸ =
۳ × ۹ =
۳ × ۱۰ =

پہاڑوں کی تعلیم دیتے وقت ایک ہی نتیجہ ظاہر کرنیوالی اور بھی باتیں بذریعہ اشکال بناکر بچوں کے ذہن نشین کرائی جائے مثلاً ۲ تین مرتبہ لینے سے جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے وہی نتیجہ ۳ دو مرتبہ لینے سے حاصل ہوتا ہے ۔

۲ × ۳ = ۳ × ۲ = ۶

دو تین دفعہ لینے سے یا تین دو دفعہ لینے سے یا جملہ ۶ آتے ہیں ۔

۲ چار مرتبہ لینے سے جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے وہی نتیجہ ۴ دو مرتبہ لینے سے آتا ہے

۲ × ۴ = ۴ × ۲ = ۸

دو چار مرتبہ لینے سے ۸ آتے ہیں

۴ دو مرتبہ لینے سے ۸ آتے ہیں ۔

۲ + ۴ = ۴ × ۲

اس طرح تعلیم دی جائے تو ۲ کا پہاڑا بناتے وقت اور بھی دیگر باتیں بچوں کو بلا احساس تکلیف معلوم ہو سکتی ہے اور آیندہ پہاڑوں کی ساخت میں بہت آسانی اور سہولت بھی ہوتی ہے۔ مثلاً ۲ × ۳ کو معلوم کرتے وقت ۳ × ۲ کو بھی معلوم کر سکتے ہیں ۲ × ۴ کو معلوم کرتے وقت ۴ × ۲ بھی معلوم کر سکتے ہیں۔ اس طرح دو کے پہاڑے کی تعلیم دیتے وقت مندرجہ ذیل باتیں بھی

۳ × ۲ = ۲ × ۳ = ۶ ۷ × ۲ = ۲ × ۷ = ۱۴

۴ × ۲ = ۲ × ۴ = ۸ ۸ × ۲ = ۲ × ۸ = ۱۶

۵ × ۲ = ۲ × ۵ = ۱۰ ۹ × ۲ = ۲ × ۹ = ۱۸

۶ × ۲ = ۲ × ۶ = ۱۲ ۱۰ × ۲ = ۲ × ۱۰ = ۲۰

دو کا پہاڑہ اچھی طرح یاد ہونے پر اس پر چند عبارتی سوالات بھی کئے جائیں۔ اور اچھی مشق کرائی جائے البتہ اس بات کی احتیاط رکھنا چاہیئے کہ جواب دیتے وقت بچے پہاڑہ شروع سے نہ پڑہیں بلکہ جواب کیلئے جس کی ضرورت ہو وہی فوراً لکھدیں۔

مشقی سوالات:۔ (۱) ہر ایک بچے کے دو ہاتھ ہوتے ہیں دو بچوں کے ملکر کتنے ہاتھ ہوں گے۔ (۲)۔ ہر ایک بچے کو دو دو گولیاں دیدی جائیں تو ۳ بچوں کو ملکر کتنی گولیاں دی جائیں گی۔ (۳) ہر ایک شیروانی کے دو جیب ہوتے ہیں تو ۴ شیروانیوں کے کتنے جیب ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔

پہاڑوں کی بنیاد ڈالنے میں کاغذ کی پٹیاں (خانہ دار کاغذ ہو تو بہتر) بھی کارآمد ہو سکتی ہیں مثلاً ۶ کا پہاڑہ پڑہانا ہو تو ذیل میں بتائی ہوئی شکلیں کام دے سکتی ہیں۔

۶ × ۱ = ۶ چھ ایکے چھ
چھ ایک مرتبہ

०	०	०	०	०	०

۶ × ۱ چھ ایک مرتبہ = ۶

۶ × ۲ = ۱۲ چھکے دونے بارہ
۲ × ۶ = ۱۲ دو چھکے بارہ

०	०	०	०	०	०
०	०	०	०	०	०

چھ × ۲ چھ دو مرتبہ = ۱۲

۶ × ۳ = ۱۸ چھکے تیئے اٹھارہ
۳ × ۶ = ۱۸ تین چھکے اٹھارہ

०	०	०	०	०	०
०	०	०	०	०	०
०	०	०	०	०	०

چھ تین چھکے تین مرتبہ = ۱۸

چھ چوکے ۲۴
چار چھکے ۲۴

○	○	○	○	○	○
○	○	○	○	○	○
○	○	○	○	○	○
○	○	○	○	○	○

۶ × ۴ چھ چار مرتبہ = ۲۴

چھ پنجے ۳۰
۵ چھکے ۳۰

○	○	○	○	○	○
○	○	○	○	○	○
○	○	○	○	○	○
○	○	○	○	○	○
○	○	○	○	○	○

۶ × ۵ چھ پانچ مرتبہ = ۳۰

۶ چھکے ۳۶

○	○	○	○	○	○
○	○	○	○	○	○
○	○	○	○	○	○
○	○	○	○	○	○
○	○	○	○	○	○
○	○	○	○	○	○

۶ × ۶ چھ مرتبہ = ۳۶

۶ = ۱ × ۶
۱۱ = ۶ × ۲ = ۲ × ۶
۱۸ = ۶ × ۳ = ۳ × ۶
۲۴ = ۶ × ۴ = ۴ × ۶
۳۰ = ۶ × ۵ = ۵ × ۶

۳۶ = ۶ × ۶
۴۲ = ۶ × ۷ = ۷ × ۶
۴۸ = ۶ × ۸ = ۸ × ۶
۵۴ = ۶ × ۹ = ۹ × ۶
۶۰ = ۶ × ۱۰ = ۱۰ × ۶

مقرون اشیاء کی مدد سے۔ انک کے پہاڑے بتانے کے بعد مندرجہ ذیل تختہ پہاڑوں کے مشق اور اعادہ کیلئے کارآمد ہو سکتا ہے۔

۱۰	۹	۸	۷	۶	۵	۴	۳	۲	۱
۲۰	۱۸	۱۶	۱۴	۱۲	۱۰	۸	۶	۴	۲
۳۰	۲۷	۲۴	۱۹	۱۸	۱۵	۱۲	۹	۶	۳
۴۰	۳۶	۳۲	۲۸	۲۴	۲۰	۱۶	۱۲	۸	۴
۵۰	۴۵	۴۰	۳۵	۳۰	۲۵	۲۰	۱۵	۱۰	۵
۶۰	۵۴	۴۸	۴۲	۳۶	۳۰	۲۴	۱۸	۱۲	۶
۷۰	۶۳	۵۶	۴۹	۴۲	۳۵	۲۸	۲۱	۱۴	۷
۸۰	۷۲	۶۴	۵۶	۴۸	۴۰	۳۲	۲۴	۱۶	۸
۹۰	۸۱	۷۲	۶۳	۵۴	۴۵	۳۶	۲۷	۱۸	۹
۱۰۰	۹۰	۸۰	۷۰	۶	۵۰	۴۰	۳۰	۲۰	۱۰

تختہ مذکور جمع۔ تفریق۔ ضرب۔ تقسیم چاروں قاعدوں کے اعادہ کے لئے بھی کام دے سکتا ہے،
تختہ مذکور میں یہ نظر آئیگا کہ دائیں طرف سے بائیں طرف جائیں۔ تو وہ خانہ جمع۔ پہاڑہ ضرب کو ظاہر کر سکتا ہے۔ اور یہی بات اوپر سے نیچے کی طرف آنے میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً

(۱) عمودی (افقی) قطاروں میں سے پہلی قطار میں ۵ کا ہندسہ دیکھئے اور اس ہندسہ کے بائیں نیچے طرف افقی (عمودی) قطار دیکھی جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ ۵ کی متواتر جمع ہے یعنے ۵ میں ۵ جمع کرنے سے ۱۰ ہوتے ہیں۔ ۱۰ میں ۵ جمع کرنے سے ۱۵ ہوتے ہیں ۱۵ میں ۵ جمع کرنے سے ۲۰ ہوتے ہیں یعنے ۵ کی متواتر جمع ان قطاروں میں نظر آتی ہے۔

(۲) ان قطاروں میں ۵، ۱۰، ۱۵، ۲۰ وغیرہ ۵ کے پہاڑے کو ظاہر کرتے ہیں ایسے ۵ ایکے ۵، ۵ دونے ۱۰، ۵ تیئے ۱۵، ۵ چوکے ۲۰، وغیرہ

(۳) ۵، ۱۰، ۱۵، ۲۰، وغیرہ اعداد جس افقی (عمودی) قطار میں واقع ہیں اُسی قطار کے عمودی (دائیں) طرف کے پہلے خانہ میں ۱، ۲، ۳، ۴ وغیرہ ہندسے نظر آتے ہیں۔ اس سے اس سے یہ معلوم ہوگا کہ ۵×۱ = ۵، ۵×۳ = ۱۵۔ ۵×۴ = ۲۰ وغیرہ یعنے افقی (عمودی) پہلی قطار میں جو ہندسے ہیں ان کو اگر ۵ میں ضرب دیں وہ نتیجہ ۵ کے افقی (عمودی) خانہ میں نظر آتا ہے۔

اس تختہ میں بائیں طرف سے دائیں طرف اور نیچے سے اوپر کی طرف جائیں تو متواتر

تفریق اور تقسیم اور پہاڑوں کی الٹی ترتیب (یعنے دہائی سے اکے کی طرف) نظر آتی ہے۔ مثلاً ۴۰، ۳۶، ۳۲، ۲۸، وغیرہ میں یہ معلوم ہوگا کہ ۴ کی متواتر تفریق کیگئی ہے اور پہاڑے کے لحاظ سے ۴ × ۱۰ = ۴۰، ۴ × ۹ = ۳۶، ۴ × ۸ = ۳۲، کو ظاہر کیا جاتا ہے آخری خانہ کے ۴۰ کا دائیں۔ طرف ابتدائی خانہ میں ۱۰ کا ہندسہ ہے اسی ۴۰ کے عمودی قطار کے پہلے خانہ میں ۴ ہے اور اس سے تقسیم کا عمل ظاہر ہوسکتا ہے۔ لہذا یہ تختہ ابتدائی چار افقی قاعدے پہاڑوں کی مشق اور اعداد کے لئے استعمال میں لایا جائے تو بچوں کو آیندہ اصول اور قاعدوں کی سمجھ میں بہت سہولت ہوگی اور عجلت اور صحت کے ساتھ سوالات حل کرنے میں بھی آسانی ہوگی۔

پہاڑوں کی بناوٹ کا طریقہ بچوں کی سمجھ میں آنے کے بعد اور پہاڑے ان کی ذاتی کوشش سے بنوانے کے بعد اگر عبارتی سوالات کے ذریعہ کافی مشق ہوجائے تو بچوں سے پہاڑے حفظ کرانے میں کچھ بھی مشکل نہ ہوگی۔ پہاڑوں کو حفظ یاد کرانا ضروری ہے عجلت اور صحت کیساتھ حساب حل کرنے کے لئے پہاڑوں کا حفظ ہونا سخت ضروری ہے۔ پہاڑے گویا حفظ کی کلید ہے کسی امر کا عادی ہونا باقاعدہ مشق پر منحصر ہے بلاتعلق یا بلاتسلسل کوئی بات یاد نہیں رہ سکتی ۴ × ۵ کا تعلق ۴ × ۶ کے ساتھ یا ۴ × ۶ کا تعلق ۴ × ۷ کے ساتھ دیکر یاد کرانا فضول ہے یہ صرف میکانی طریقہ ہے اشیاء محسوسہ کے ذریعہ تجربہ سے یہ بات جلد سمجھ میں آسکتی ہے اور آسانی سے یاد بھی رہ سکتی ہے۔

زمانہ قدیم میں پہاڑوں کا اعادہ باقاعدہ اجماعی طور پر کیا جاتا تھا۔ زمانہ حال میں بھی یہ طریقہ چند دیہاتی مدارس میں پایا جاتا ہے کسی صورت میں پہاڑوں کا حفظ کرانا ضروری ہے۔ اعادہ با توجہ اور بہ کوشش ہونا چاہیئے۔ اس کا ذریعہ خواہ اجماعی اعادہ ہو یا انفرادی مشق ہو۔ پہاڑوں میں بچوں کو اس قدر مشاق بنایا جائے کہ ۹ چھکے کتنے؟ یہ سوال کرتے ہی فوراً "۵۴" یہ جواب ان سے آنا چاہیئے ۹ ایکے ۹ سے ۹ چھکے ۵۴ تک گنتا ہوا کوئی طالب علم اگر نظر آئے تو وہ مذکورہ پہاڑہ سے واقف نہیں سمجھا جائیگا۔ لہذا محض میکانی طور پر اعادہ نہ کیا جائے میکانی اعادہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچوں کو پہاڑہ شروع سے پڑھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اعادہ کے وقت بچوں کو سلسلہ سے سوالات کرنے کے بجائے درمیان میں کسی بچے کو سوال کیا جائے تاکہ تمام بچے متوجہ رہیں۔ ۲ چھکے۔ ۴ چوکے۔ ۵ ستے وغیرہ

سوالات کے جوابات طلبہ فوراً دیدیں شروع سے نہ گنیں اس قسم کے سوالات کے بغیر حسابی تعلیم میں عجلت اور صحت کی امید نہیں پائی جاتی۔

بچوں کو پہاڑوں کی تعلیم سلسلہ سے (یعنے ۲۔ ۳۔ ۴ .... ۱۰) دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آسان آسان پہاڑے پہلے بتائے جائیں مشکل پہاڑے بعد میں بتائے جائیں۔ ۵ کا پہاڑہ ۴ کے پہاڑہ سے آسان ہے۔ ۱۱ کا پہاڑہ ۹ کے پہاڑے سے آسان ہے۔ ۱۰ کا پہاڑہ تو سب پہاڑوں سے آسان ہے۔ اس لحاظ سے اگر پہاڑوں کی تعلیم کے مدارج بتائے جائیں تو وہ حسب ذیل ہوں گے۔ ان پہاڑوں کی تعلیم دیتے وقت ان کی خوبیاں بھی بذریعہ سوال وجواب

(۱) ۱۰ اور ۵ کے پہاڑے
(۲) ۲، ۴، ۸ " "
(۳) ۳، ۶، ۹، ۱۲ " "
(۴) ۱۱، ۷ " "

بچوں سے اخذ کرائی جائیں تو پہاڑے یاد رکھنے میں بالکل دقت نہ ہوگی۔ مثلاً۔
۵ کے پہاڑے میں اکائی کے درجہ پر سوائے پانچ یا صفر کے اور کوئی ہندسہ نظر نہیں آتا۔ ۱۰ کے پہاڑے میں مرتبہ (دفعہ) بتانے والے عدد پر صفر جوڑنے سے نتیجہ نکل آتا ہے مثلاً ۱۰×۱ = ۱۰، ۱۰×۲ = ۲۰، ۱۰×۳، ۱۰×۴ = ۴۰ وغیرہ۔

۱۱ کے پہاڑے میں ۱۱ نوے تک اکائی اور دہائی کا ہندسہ وہی ہوتا ہے جو مرتبہ (دفعہ) بتانے والا ہندسہ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ مثلاً۔

۱۱ × ۱ = ۱۱، ۱۱ × ۲ = ۲۲، ۱۱ × ۳ = ۳۳، ۱۱ × ۴ = ۴۴

۹ کے پہاڑے میں اکائی کا ہندسہ سلسلہ سے بقدر ایک ایک کم ہوتا جاتا ہے اور دہائی کا ہندسہ بقدر ایک ایک بڑھتا جاتا ہے اور ہر صورت میں نتیجہ کے ہندسوں کا مجموعہ ۹ ہی ہوتا ہے مرتبہ بتانے والے ہندسہ سے دہائی کا ہندسہ ہر صورت میں بقدر ایک کم ہوتا ہے مثلاً ۹ × ۱ = ۹۔ ۹ × ۲ = ۱۸، ۹ × ۳ = ۲۷، ۹ × ۴ = ۳۶، ۹ × ۵ = ۴۵۔ وغیرہ۔

ایک سے بارہ تک کے پہاڑے اچھی طرح یاد کرانے کے بعد ضرب کا قاعدہ بتایا جائے اگر ایک ہی عدد میں ضرب دینا ہو اور مضروب اور مضروب فیہ کی جگہ آپس میں تبدیل کیجائے تو حاصل ضرب میں کچھ فرق نہیں ہوتا یہ اصول طلباء کو سمجھایا جائے تو تختہ مندرجہ صفحہ (۳۷) نظری طور پر حاصل ضرب دریافت کرنے میں کارآمد ہو سکتا ہے۔

Reviews.

Elementary Science.—Physics, by V. N. Viswanatha Aiyar M. A, L. T. Chemistry, by Narayana Aiyar, M. A., L. T.

Second Edition. Revised and Enlarged, Messrs. S. Varadachari & Co. Madras 1932.

A excellent text book covering the H, S. L, C. Syllabus for Elementary Science, (Physics and Chemistry) profusely illustrated with accurate and clear diagrams. There are also numerous references to instruments and appliances in use in modern every-day life, explaining their basic principles, as well as those of many natural phenomena.

To the Physics Section there are some useful appendices, which are designed to assist the science teacher to do his job efficiently, and also 23 pages of Revision Questions, averaging about 12 questions per page.

To the Chemistry Section there is appended an outline scheme for 15 Practical lessons, and 4 pages of Revision Questions. The use of Chemical Symbols and Formulae has been omitted from the book, equations being expressed in words.

At the price of Rs. 1/4 (Cardboard cover), it is an excellent production.

R. S. HUGHESDON.

Rhythmic Exercises by Shri Yogendra, published by Messrs Varadachari and Co., Mount Road, Madras.

A very useful book for all those who are in search of such form of exercises as contribute to the harmonious development of the body. The exercises described in the book may not appear to be new, yet the rhythmic breathing suggested therein is an innovation. Persons who are unable to take out-door exercises are recommended to give a trial to this system.

S. M. HADI.

Breathing Methods by Shri Yogendra, published by Messrs. Varadhachari and Co. Mount Road, Madras.

A useful book on deep breathing and control of breath. It contains instructive matter on how to preserve one's health by correct breathing. The exercises suggested by the author are simple and can be easily practised every day.

S. M. HADI.

recalled that in 1927 Mr. Syed Mohamed Husain Jaferi was deputed, along with Mr. S. Ali Akbar, to represent the Hyderabad State at the Imperial Education Conference in London. At the conclusion of the Conference, Mr. Jaferi visited Denmark to study the educational system of that country. A short time after his return to India, he published a book in Urdu on the educational system of Denmark. Mr. Syed Mohamed Husain Jaferi chose to write his work in Urdu because he was anxious that it should be read widely by teachers in the rural areas of H. E. H. the Nizam's Dominions, many of whom are not acquainted with English. We are glad that he has now translated important portions of his book into English for the benefit of those who, on account of their ignorance of Urdu, are unable to read the original. No one who has heard or seen anything of Danish schools can help feeling that they have an important message for India, especially rural India. We should like therefore to offer our warm thanks to Mr. Mohamed Husain Jaferi for giving us the pleasure of publishing these articles, and we are sure that they will be read with much interest and profit.

(2) "The diversion of more boys to industrial and commercial careers at the end of the middle stage, for which provision should be made by alternative courses in that stage, preparatory to special instruction in technical and industrial schools."

In our opinion, it is high time that a comprehensive scheme on these lines was worked out. In deciding on the types of schools to be opened for boys intended for industrial and commercial careers, consideration may be given to the suggestion made by Dr. Ziauddin for the opening of polytechnics, or institutions which offer varied courses of instruction, "so that a student who finds himself unable to proceed with the ordinary school instruction can shift at any stage of his education to the technical side in which instruction is provided in the neighbouring rooms of the same building". In fact, such schools are already in existence in the West. In his interesting book " The Rural Community and the School " Dr. Krishnayya describes a most efficient high school where five parallel courses are provided: For Boys—(*a*) Agricultural and (*b*) Mechanical; For Girls—(*c*) Domestic arts and Crafts; For Boys and Girls—(*d*) Teacher training and (*e*) Literary Scientific (for those proceeding to College). The work in this rural school is so arranged that no matter in what field a student specialises, he or she gets a useful amount of instruction in the others.

Whatever scheme is adopted, if wastage in the high schools is to be avoided, it is necessary, as pointed out by Professor Wadia, that the question whether a child is to receive university or technical education should be decided not later than at the end of the middle school stage.

We print elsewhere the first of a series of articles on the Danish Educational System by Mr. Syed Mohamed Husain Jaferi, B. A. (Oxon), Deputy-Director of Public Instruction, H. E. H. the Nizam's Dominions. It will be

Editorial

Wastage in Indian Secondary Schools.

We publish elsewhere the texts of two important addressses on the educational problems of India delivered recently by Professor A. R. Wadia of the Mysore University and Dr. Ziauddin Ahmed, respectively. Both these eminent educationists call special attention to the need for reforming the system of secondary education in India. As was pointed out by Dr. Ziauddin Ahmed, the defect of that system lies in the courses being too literary and "framed with the single purpose of preparing the boys for admission to the universities". In 1929 the same criticism was made by the Hartog Committee, which declared: "The whole system of secondary education is still dominated by the ideal that every boy who enters a secondary school should prepare himself for the university; and the immense numbers of failures at Matriculation and in the university examinations indicate a great waste of effort".

The Government of Mysore attempted to remedy this defect by introducing vocational courses in the ordinary high schools, but we are informed by no less an authority than Professor Wadia that the result has been disappointing. The reason given by him for the failure of the experiment is that "two hours' work a week for vocational study was hardly of any use in producing a real vocational bias, while for the university type of boy it meant a waste of energy on subjects in which he could not take any interest".

The remedies proposed by the Hartog Committee were :—

(1). "The retention in the middle vernacular schools of more of the boys intended for rural pursuits, accompanied by the introduction of a more diversified curriculum in those schools ;"

and the pupil teachers of the Normal School took part in the High School Tournaments. To these tournments were this year added one in Cricket for the High Schools and one in Hockey for the Middle Schools. All the High and Middle Schools of the Division, without exception, took part in the tournments. The teams were allowed concession rates by motor agencies The local College won the Hockey, Cricket and Badminton shields and the High School at Jagtial the Football shield. The Middle Schools at Yellandu, Koratla and Mankondur won respectively the Football, Hockey and Badminton shields.

SPORTS.

The sports were held in the field specially prepared for the purpose behind the Normal School. New items like pole jump and hop-step-and-jump were introduced this year. There were also a few items for teachers, but the entries for the teachers' items were far from encouraging. The preliminary heats were run on the 27th December. The next day was the finals. The senior and the junior champion medals went to the College. Of the other institutions, the High Schools at Matwada and Khammam won many prizes in individual events. The Senior Tug-of-war was won by the Normal School and the Junior by the Middle School at Huzurabad. At the conclusion of the Sports, the prizes were distributed by Nawab Khan Bahadur Mirza Akbar Beg Saheb, the Superintending Engineer. The President of the Association, in requesting him to do so, dwelt upon the spirit the tournaments and sports infused in the boys, the healthy competition they evoked amongst the schools and the consequent increase in the number of entries and the improvement in the standard of the game this year as compared with the previous year. The President of the evening congratulated the winners of the day aud appreciated the impetus given to such healthy activities. Then the function came to a close with cheers to His Exalted Highness and the guests.

The Conference commenced its work with the President opening the Exhibition on the 24th December. After the usual prayers in Arabic and Sanskrit, the report of the year, briefly surveying the activities of the Association and its branches, was read by the Secretary. The President in his opening remarks explained that the object of the Conference was to focuss the attention of the members on problems that confront them in their daily work.

Separate sub-committees had been appointed to consider how best the present syllabus of studies in the several subjects could be efficiently worked out. An exclusive conference of the Inspecting Officers of the Division discussed problems connected with school inspection. Lectures open to discussion were also delivered on the Kindergarten, the Project Method, Mentally Deficient Boys and the Teacher's Part in Village Reconstruction. Other items included in the programme were a model lesson in Geography and poems in Urdu composed by some of the members.

THE EXHIBITION.

This work was entrusted to a separate Committee and the exhibits mostly of card board and wood work, drawings, paintings and designs were all performances of pupils and teachers of the schools of the Division. They were carefully classified and artfully arranged in the tastefully decorated building of the Normal School. Both in number and quality the exhibits of this year were a decided improvement on the last year's and merited more prizes and certificates. The Exhibition Hall was open to the public and a day was set apart for ladies with special purdah arrangements.

TOURNAMENTS.

Last year the Association conducted hockey, football and badminton tournments for High Schools and Football and Badminton Tournaments for the Middle Schools of the Division. The High Sections of the Intermediate College

the need for research in education and recommending the institution of Research Degrees in Pedagogy.

At a meeting of the Council of the All-India Federation of Teachers' Associations held at Lahore during the Conference, the following were elected to represent the Federation at the Fifth Biennial Conference of the World Federation of Education Associations to be held at Dublin from July 29th to August, 4, 1933:—

Prof. P. Seshadri, M.A., Principal, Govt. College, Ajmer.

Dr. Ziauddin Ahmad, M.A., D.SC., C.I.E.

A. C. C. Hervey, M.A , Principal, Govt College, Ludhiana.

Mr. S. Ali Akbar, M.A., (Cantab), Divisional Inspector of Schools, Hyderabad Dn.

Prof. C. R. D. Naidu, Lecturer in Psycho-Physical Education, Kushtia (Nadia), Bengal.

Dr. V. S. Ram, M.A., Ph. D., Lucknow University, Lucknow.

The Warangal Subah Teachers' Conference, 1342 F.

The Second Annual Conference of the Warangal Subah Teachers' Association was held at the Normal School Warangal on the 24th and 25th December, 1933. Along with the Conference an Educational Exhibition and the Subah Inter-School Sports and Tournaments were also held, as in the previous year.

About 600 members attended the Conference. A feature of this year's Conference was the absence of all ostentation and formalities attached to such conferences. All the proceedings were quite business-like and of practical utility. Mr. Ahmed Hussain Khan, B. A., the Divisional Inspector of Schools and President of the Association, presided over the Conference.

function and expressed his appreciation of the performance offered by the pupils, most of whom were very young. Such an entertainment, apart from affording enjoyment to the audience, was a source of real education to the child. The bringing together of all the pupils and teachers on a common platfrom and the preparation for it all not only developed *esprit de corps* among the boys and teachers but enabled each to know what the others were doing. Dr. G. S. Krishnayya thanked Nawab Sir Amin Jung Bahadur and others who had attended the function and those who had co-operated to make it a success. This brought a very crowded and no less enjoyable day to a close.

The All-India Education Conference, Lahore Session.

The 8th All-India Educational Conference was held at Lahore on the 14th April and the subsequent days under the presidency of Dr. Ziauddin Ahmed. In his Welcome Address, Raja Narendra Nath, M. L. C., opposed the idea of relegating English to the position of a second language in Indian universities and recommended the adoption of the Roman script for Indian vernaculars. A feature of the Conference was that a large number of sectional meetings were held on different subjects, including "The University and Secondary Education", "Mental Hygiene" and "Religious Education". The Conference passed resolutions (1) urging the need for the promotion of vocational and adult education ; (2) requesting Provincial and State Governments to penalise the sale of cigarettes and 'biris' to boys under 18 years of age ; (3) recommending for teachers of Aided schools the establishment of Arbitration Boards on the lines of those of Bengal ; (4) appealing to teachers to emphasise in their work the ideals of international intellectual co-operation; (5) suggesting temporary interchange of teachers among the different Provinces and States of India ; and (6) urging

(*b*) *Mathematics.*—Many teachers of the local schools took part in the discussion giving out their views and experience in regard to the teaching of Mathematics, each with special reference to some particular topic.

2. *Primary Section.*

(*a*) *English*—At the Primary Section meeting, Miss Patel read a paper on the "Teaching of English to Primary Pupils" which was listened to with great interest and profit.

(*a*) *Mathematics.*—Mr. K. Samba Murthi, B. A., L. T., of the Wesleyan High School read an address on the "Teaching of Arithmetic" and gave many useful hints to the teachers as to how Mathematics in the lower classes might be made interesting.

EVENING PROGRAMME.

Social Gathering—This was followed by a social provided for the teachers and visitors. There was a physical demonstration on the Wesleyan High School play-ground in which many schools took part. Staff drill, marches, modern games and various other items that were witnessed, showed that great attention was being paid to the physical side of pupils' education and gave one an idea of what was approved and up-to-date in physical education.

Variety Entertainment.—The last and most interesting item of the Conference, namely, the Variety Entertainment, came off in the Ramgopal Theatre Hall. The hall was packed to its capacity with visitors, teachers and a large number of students. Not less than 15 schools participated in the entertainment—Girls' schools, Boys' schools, Indian schools and European schools—and offered as many as 22 items. Never before had all the schools of the Administered Areas co-operated to provide such a public programme. Every item of the entertainment was witnessed with great interest. The audience was kept spell-bound for 2 hours by the boys' music, songs, farces, dances, action songs, dramas and other feats. Nawab Sir Amin Jung Bahadur presided over the

and corrective. The emphasis must be on prevention rather than on the cure of diseases. There is a variety of good posture exercises which makes for the improvement of many important parts of the body. He then pointed out the correct posture which would ensure good health, and closed his address with an interesting verse on "Good Posture".

Mr. M Hanumanth Rao, B. A , L T., Principal, Mahboob College, proposed a vote of thanks to the President and the other visitors and the morning session came to a close.

AFTERNOON SESSION.

The Exhibition.—There was an exhibition organised in the Wesleyan High School Hall in connection with the Conference. No less than 750 exhibits from different schools were on show and were highly appreciated, being artistic and of great educative value. Most of the exhibits were in the nature of teaching aids in English, Mathematics, History, Geography and Story-telling, besides a large number of exhibits prepared by pupils and teachers under manual work, book-binding, rattan work, sewing, embroidery, painting, fine arts, etc.

SECTIONAL MEETINGS.

1. *Secondary.*

The sectional meetings were held in two sections, one for the Secondary Department and the other for the Primary. This time the Conference concentrated on Mathematics and English only.

(*a*) *English.*—Mrs. Garden, B. A., of the Methodist Boys' School, Hyderabad, gave a model lesson in English prose to the puplis of Form V. This was watched with keen interest by all the teachers, since such practical teaching solves the difficulties of many teachers. The lesson was followed by an interesting discussion by the teachers.

progress. The teacher must provide conditions to liberate the child from adult domination.

The children of St. George's Grammar School, tastefully dressed, provided two interesting items of drill, which were greatly appreciated.

Lecture by Dr. Lateef Sayeed.—Dr. Lateef Syeed, M. B., Ch. B (Edin.), then spoke on "Health and Hygiene" in an unorthodox and unconventional manner. The learned doctor stressed the importance of fresh air, wholesome food, clean water, regular exercise, daily bath, light clothes, care of eyes, and moderation in general habits. The teacher's function in aiding the child to take care of himself is really great. He should consider it as much his duty to get the child in the right path in this respect as it is his duty to see to the training of his mind. Sunlight, air, water and food, clothes and houses were a few external elements that conduced to human health. As man has to live in groups and communities, he should individually and in vigilant co-operation with others see to the avoidance of their contamination and, if such contamination is unavoidable, see to its speedy removal and safe disposal. Dress must be comfortable and of passable appearance.

Lecture on "Physical Education".—Mr. F. Weber then delivered a lecture on "Physical Education." He said that the modern aim of Physical Education is to produce "the man healthy in body and soul and full of life, efficient, and harmoniously developed, possessing the desire to find his place in society, and thus educated for obedience as well as leadership." Physical education is more comprehensive than physical training, and in addition to improving the general health, is thought of as developing the higher brain centres and a finer morale, resulting in mental keeness, habits of improved behaviour, attitutdes of good sportsmanship, the formation of character and sounder judgment. Physical education, he said, must be hygienic

physical as well as moral, that could be derived from games, which would ultimately inculcate the qualities of fairplay, justice, manliness, sportsmanship, etc. A teacher should be a sportsman at all costs. He concluded by exhorting the teachers to live up to those noble ideals and wished the Association long life and hoped that it would be a living force working for the building up of the future citizens of the country.

The Presidential address was followed by some excellent music provided by the Methodist Boys' School orchestra.

Dr. Kumarappa's Address.—Dr. J. M. Kumarappa, M. A., Ph. D., the distinguished educationist of Mysore, then spoke on "The Mission of a Teacher". His address was highly thought-provoking. He struck the keynotes of "Individuality" and "Self-activity". He lamented that till lately the child had been relegated to the back-ground, and that the teacher had been dominating as the absolute monarch with his word as law. Freedom of the pupils was synonymous with "License" or the child was trained to be more a slave than a free man. The pupil must be allowed to learn at his own pace and according to his own taste quite free from external coercion. The teacher in avoiding license on the one hand and tyranny on the other, must break through old notions of adult domination and provide pupils with ample opportunities to think, plan and act for themselves. He should help the child to find itself nearer the goal of self-education. He should win the child's co-operation in working towards the realization of this ideal. The child must be led to think for himself before acting, and certainly the appreciation of the help given by the teacher will tend to set up in the child the right attitude towards the teacher as the guide. Force, no doubt, is effective in producing quick results, but if the child's self-activity is not aroused, he will never be truly educated. He learns only by doing. Self-activity is indispensable at every stage of educational

ministered Areas, traced the circumstances under which the new Association came into being and the great programme of work that lay before them. He said that this infant owed a great deal to the parent association in Hyderabad, and hoped to continue to derive nourishment from there and co-operate in every vital way. Continuing, he remarked that in their scattered schools with all their peculiar problems there was danger of their ignoring their professional growth and that an Association of this kind might help to promote it. He deplored that their education was woefully one-sided and the whole boy was rarely educated. To remedy this defect, efforts were being made to give the pupils training outside their class-room, and in the variety entertainment would be exhibited a few items of extra-curricular activities encouraged in the different schools.

Presidential Address.—After the Secretary, Mr. P. Venkatesulu, B. A , had read out the messages of good will and greetings received from similar Associations in other parts of India, Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur, M. A., delivered his presidential address which was highly instructive and interesting The teacher, he said, was neither an engineer nor an architect but pre-eminently the builder of the country as a whole. On his shoulders lay the most momentous task of training the children who would be the future citizens of the country. He was entrusted with flesh and blood, real live human material, and should remember the action and reaction going on between mind and body. Much depended on the early home training of the child. Teacher, like the poet, was born, rather than made. He must possess a peculiar talent to impart what he knows, and in this task it is not material emoluments that ought to be reckoned with, but pure selfless enthusiasm and honest work He should be a thorough psychologist, conversant with the subtle workings of the human mind, to know the latent talents in the boys and cater to particular inclinations. The teacher must improve his pupils by example rather than by mere precept. He stressed the importance of education,

Recent Educational Conferences.

First Annual Conference of the Teachers' Association, British Administered Areas, Hyderabad Deccan.

This Association is affiliated to the Hyderabad Teachers' Association and has been working in close co-operation with the parent body. As it was found that a very large number of teachers are unable to attend the Conference in the City College or send their exhibits there, it was decided that a Conference should be conducted in Secunderabad for the discussion of local and regional problems and the exhibition of local hand-work. The Secunderabad Association is similarly contemplating starting a magazine, library and a reading room for meeting its teachers' peculiar needs more effectively, while still drawing benefit and inspiration from its membership of the Hyderabad Association.— G. S. K.

The first conference of the teachers of the Administered Areas was held on the 25th March, 1933 under the presidency of Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur, M. A. (Oxon), Political Member, H. E. H. the Nizam's Government.

MORNING SESSION.

Opening Address by Major G. T. Fisher.—In the absence of the Hon'ble the Resident, Major G. T. Fisher, I. A., Secretary to the Hon'ble the Resident at Hyderabad, very kindly opened the Conference. In doing so, he laid great stress on the advantage of organisation in every sphere of human activity, and pointed out the opportunities for work which were within the reach of Teachers' Associations in India. Teachers should avoid stagnation and try to keep their knowledge of the theory and practice of education growing. Continuing, he remarked that the education of boys could be made more useful by teachers constantly meeting together and devising means of improving their pupils' welfare. Co-operation rather than competition must be the spirit with which schools should work in order to create professional loyalty and self-respect.

Welcome Address.—In his Welcome Address, Dr. G. S. Krishnayya, M. A., Ph. D., Educational Officer, British Ad-

they are 7 years old and continue till the age of 14. In Denmark these schools are called elementary, but really secondary education or education for middle section begins in these schools from the 6th class. The result is that pupils who leave school at the age of 14, the compulsory age, do not go away with a smattering of education but receive a thorough and sound instruction in most of the cultural subjects.

Middle Schools.—(Mellemm Skolen). These have a four years' course terminating with a public examination known as *Mellemm Skole Eksamen.* Before a pupil can enter the middle school, he has to pass an Entrance Examination at the age of 11, when he has been at an elementary school for 5 years. It may be noted that a middle school really consists of the three top classes of an elementary school and an extra class corresponding to our Form III.

Real Skolen.—All those middle schools to which an extra class, called 'Real Class' (in Danish 'Real Klassen'), is attached, are named Real Schools (Real Skole). Such pupils as do not wish to proceed to the Gymnasium but want to enter life join this class at the age of 15 after passing the middle school examination.

Gymnasium.—Pupils who desire to proceed to the University join the high schools after finishing the middle course. The course is of 3 years and the pupils join at an average age of 15 and finish at 18.

Folk High Schools and Agricultural Schools.—These are private continuation schools for adults. Detailed description of these will be given later on.

(*To be continued.*)

The Present System.—The present state-educational system of Denmark comprises Primary, Secondary and University Education. It provides that all children shall receive the same kind of education during the first 5 years of their school life. Children who desire to receive secondary education enter the middle schools and those who are not destined for secondary education continue for two or three years more in the elementary schools, usually until 14 or 15 years of age. Secondary education begins when a child is 11 years or at the end of the 5th school year. It includes the middle course of 4 years. Children who wish to continue further may take the one year *real* course, or enter the three year Gymnasium, which offers instruction in Classics, languages, mathematics and sciences and prepares for the University. There are also Folk High Schools, Agricultural Schools and Schools for Household Economics. These institutions are Denmark's special contribution to education and are not secondary schools but continuation schools for adults. When pupils who do not wish to take up literary secondary education finish their elementary education at the age of 14, they go back to their homes and work on the fields with their parents for 4 years and then join these institutions at the age of 18 or 19.

The following diagram will give a clear idea of the school system now prevalent in Denmark :—
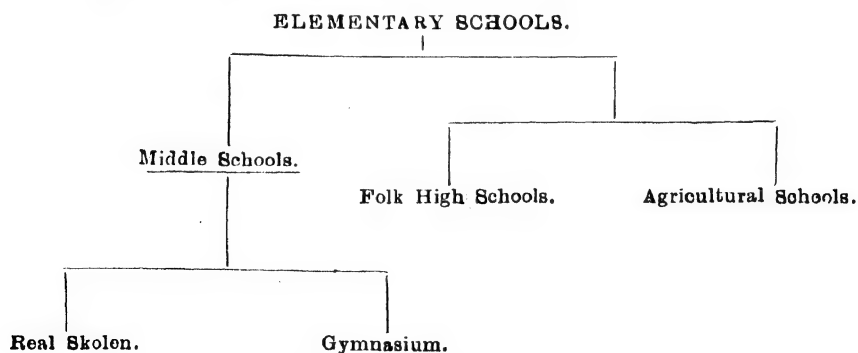
Elementary Schools.—(Folk Skolen) Elementary schools have 7 classes and the pupils enter these schools when

Christian VI, son of Frederick IV, extended his father's idea and conceived a national system of education. During his reign a Commission was appointed to consider the state of education in the country and prepare for the establishment of a national school system. As a result of this Commission, an Ordinance was passed in 1769 which laid down the following principles :—

1. Every parish is in duty bound to establish and maintain schools.

2. Children are in duty bound to receive instruction during a certain period of their lives.

The first real advance in education came in 1814 when on the recommendation of the Great Commission a law was enacted by which compulsory education was enforced. The burden of the support was placed upon local communities, salaries of teachers were fixed, and provisions made for small pensions. The subjects taught were religion, reading, writing, arithmetic, singing, gymnastics for boys and, where possible, history and geography. The enforcement of this law was unfortunately checked by the poor economic condition of Denmark during the early part of the 19th century.

Modern Period.— Educational conditions improved materially after 1830. Professionalism began to make itself felt among the teachers who formed associations and founded educational journals. At the same time, Bishop Grundtvig and Kristen Kold made contributions to Danish educational thought and practice which have had profound influence. The supervision of the schools was, however, ineffective until after 1848, when the Ministry of Education and Ecclesiastical Affairs became the central authority in all educational affairs. In 1856 a new law was passed under which the state began to pay a part of the school expenses such as salary increments and direct aid to weak communes. The laws of 1899, 1903, 1904 and 1908 have brought elementary education to its present condition.

reading and writing. These existed in all the commercial towns. Elementary public schools in the modern sense did not exist. Monastic schools disappeared when monasteries were dissolved at the time of the Reformation. The cathedral schools were transformed into Latin Schools. Ultimately there developed two fairly definite types of Latin Schools —higher schools in the larger cities and lower schools in the smaller towns. In the former, training for the office-holding class was given and the curriculum consisted of Religion Latin and Greek, Danish being prohibited.

After the Reformation education became more widespread. Most of the schools were formed as a result of co-operative effort on the part of several families. The common people of Denmark had only very meagre opportunities for schooling prior to the 17th century. At that time 80% of all the people living in the country and 40% of those living in towns could neither read nor write. Now there is practically no illiteracy.

The year 1793 marked the first definite step in public school organization. In consequence of a Royal promulgation of that year in Copenhagen and other cities, free schools were opened. These institutions were supported by freewill contributions and were the foundation for the present public-school system of Copenhagen.

King Frederick IV built 240 schools. He took great interest in the work of education, not only aiding in the building of school houses, but issuing specific instructions regarding the work of the schools. Dr. Hegland writes, " The schools which were both for boys and girls, whether rich or poor, were to be kept six days in the week, parents were punished if they did not send their children. Instruction in the most elementary subjects was free, in advance subjects tuition was charged. Teachers' salaries in cash were paid by the King and salaries in kind by the Local Communities."

The Danish Educational System

BY

SYED MOHAMED HUSSAIN JAFERI, B. A., (Oxon),

Deputy Director of Public Instruction, Hyderabad, Deccan.

I

HISTORICAL DEVELOPMENT

Early Times.—We get evidence of the culture of the old Norse world as far back as A. D. 500. At this period children received their early training from their mothers. Later on their training was entrusted to foster-fathers. Foster-fathers were chosen from among the wisest men of the community, who, in most cases, were priests. The relations between the foster-fathers and the children were always those of intimacy and affection.

The chief object of education in those early days was the teaching of manliness. Such training was given to children from the beginning as was calculated to make them physically and intellectually vigorous and develop in them the qualities of courage, chivalry, complete self-possession and utter disregard of death.

The education of girls was not neglected. They were taught needle-work, embroidery, spinning, weaving and other household duties. Their intellectual training was of a very limited nature, and it consisted of learning of poetry. Girls enjoyed every freedom. They were allowed to take part freely in all the communal festivals and amusements and to attend public meetings.

Middle Ages.—During the medieval period there were in Denmark, as elsewhere in Europe, three chief types of schools—monastic, cathedral and burgher schools. In monastic schools were taught religion, reading, writing, singing and the subjects of trivium and quadrivium. The cathedral schools trained for priesthood. The burgher schools, established by citizens, taught Danish, German,

say that the Assembly and its Finance Committee will sanction the amount of Rs 40,000 which, in the opinion of Government, is sufficient to establish the Board.

The work of the Librarian has now become a technical subject. In most Universities in Europe, courses of instruction, both theoretical and practical, have now been framed for the training of librarians. This aspect has been completely neglected in India, but I am glad that the Punjab University have taken the initiative in this matter.

Adult Education.

The precentage of literacy of India is very low; even the enforcement of compulsory education will not altogether remove illiteracy within half a century unless active measures are adopted to educate the adult population. The responsibility for adult education cannot altogether be thrown on the State. State organisations should be supplemented by private effort. Unfortunately there are few societies that are interested in adult education. The courses of instruction and the method of teaching the adult population should be altogether different from those prescribed for children. Adult education has now assumed great importance on account of the adult franchise which the country is demanding in political elections. It is essential that adults should be educated so that they may exercise their right with intelligence.

Ladies and gentlemen, I offer my thanks for the patient hearing you have given me and I earnestly hope that this Conference will soon develop into a powerful organisation similar to those existing in Europe and America. It will help to solve the various problems of education and to co-ordinate the teaching of various grades of institutions in different provinces for which no machinery exists in the country. We are on the eve of an educational revolution and the timely lead of organistions like this may save us from catastrophe.

have before us examples of several countries where two languages are used as media of instruction and every child is bilingual, but the problem here is of special complexity on account of three difficulties :—

1. The official language in India is English which is not the mother-tongue of any province.

2. India has a large number of vernaculars. On account of the multiplicity of vernaculars it is difficult to select a language which may serve as the common medium of instruction.

3. Suitable books in these vernaculars are not available. Books cannot be written in a day ; they require time. In this connection I would like to mention the great service which the Osmania University has rendered in initiating the scheme of instruction through Hindustani. The experiment is being carefully watched and its success will help other Universities in adopting the vernacular as a medium of instruction. In any case our ideal should be to have a common language which may serve as the medium of instruction in all stages of education. The ideal may not be achieved in a day, but we should make every effort to reach the goal by successive stages of development. The vernaculars have already been adopted as the medium of instruction and examination in most of the provinces of India up to the Matriculation stage. The next stage is the Intermediate and it is hoped that, in the near future, vernaculars will become the media of instruction in the college classes also.

The Hartog Committee recommended the establishment of a Central Board of Education to co-ordinate the educational work of different provinces and to keep each province constantly in touch with the experience and progress of other provinces. It will also be expected to give expert advice to the provincial governments. I can confidently

2. It is essential that the system of examinations should be so modified that it may be a test of merit and not the test of a student's cramming power or his luck.

I strongly advocate a thorough investigation into the present system of examinations. It would be impossible to introduce new modes of instruction without modifying simultaneously the system of examination.

Women's Education.

The marked disparity in literacy among men and women, which is 7·6 and 1·8 respectively, is due to social customs and the 'purdah' system. Recent movements have appreciably removed some of the drawbacks and no one can refuse the demand of women for equal rights. Special efforts are necessary ; the level of literacy among women should be raised by opening special schools and by giving liberal grants. Co-education is only possible in the lower primary classes, and in advanced University instruction, where separation is impracticable on account of cost. In all other stages girls' schools should be separated entirely from boys' schools. This principle of separation is admitted even in an advanced country like France and any attempt at co-education at the present stage in India is foredoomed to failure. The courses of instruction in the girls' schools should not be the same as for boys, but it is essential that the examinations in girls' school should have the same academic value as the corresponding examinations for boys. The courses of instruction and the conduct of examinations of the girls' schools should be entrusted to a separate Board of Women's Education, which should have powers of recommending grants to the girls' schools. I am convinced that women's education will not make substantial progress unless they themselves fight their battle in the Councils and on the public platforms. No one gives up usurped rights in good grace.

Medium of Instruction.

The question of the medium of instruction is much more complex in India than it is in any other country. We

The reform of these colleges is a question of very great importance. Training colleges like other professional colleges should be affiliated to the Universities so that the teachers and students may acquire a broader vision of their subject, but questions of administration and admission should be left entirely in the hands of the department. In order to attract the better type of students to the teaching profession it is essential that the pay and prospects of teachers should be made attractive, and that they should have security.

Examinations.

Examintions dominate our entire system of education. The need of reform in examinations is more keenly felt in India than in other countries. Success in examinations, as they are now conducted, is more a question of luck than of merit. 'Should examinations be mended or ended' is a problem that has been keenly discussed in recent years. I agree with Sir Michael Sadler's view that examinations have come to stay. We cannot eradicate them, but we can remove some of their evils The New Education Fellowship at their Fifth Conference held at Elsinore appointed an Examination Enquiry Committee. Enquiries are now being made in every country and it is desirable that we should co-operate with the New Education Fellowship and other similar bodies in their inquiry on the examination system of each country. The Calcutta University Commission did not make a thorough enquiry. It attempted to lubricate the existing machinery. I do not want to enter into details, but I would like to emphasize two points:—

1 We have in this country a very large number of public examinations. It is very desirable that the number of these examinations should be curtailed. It is a very disquieting feature that we are drifting from the system of individual examination to the system of mass examinations. It is impossible to evaluate individual merit correctly in a system of mass examinations.

may fit up and run machinery and may able to repair it. We should also aim at producing men who may control cottage industries which have a bright future in this country. There exists in every country a great demand for this class of technical men, but we have so far made little or no attempt here to train them. These persons are mostly trained in polytechnics which do not exist in India. The absence of polytechnics is a great gap in our system of education. There are two outstanding features in the British system of education and these are just what we have completely ignored. We initiated the old British system, we borrowed their ideals and we are still adhering to those aspects which Great Britain herself gave up after unpleasant experience, but we never attempted to imitate the two outstanding features of the British system of education, *i. e.*, public schools and polytechnics. A polytechnic is an institution in which courses in practically everything are provided except the kindergarten and advanced research. It has a school and a college department and it provides instruction in a large number of technical and professional subjects —sometimes as many as seventy different subjects. A student who finds himself unable to proceed with the ordinary school instruction can shift at any stage of his education to the technical side in which instruction is provided in the neighbouring rooms of the same building. A student thus has plenty of opportunities to choose a trade or a profession which suits his natural aptitude.

Training Schools and Colleges.

No one would subscribe to the view expressed by the Bengal Retrenchment Committee which recommended the abolition of all training schools and colleges. The Committee was of opinion that a teacher's own capacity and education were his chief qualifications and that training made little or no difference. The criticism is due not to any intrinsic defect in the system of training but to the method now being followed in the training colleges in India.

has passed the Matriculation Examination. This state of affairs has a very depressing effect on our system of education. One naturally asks, what is the cause of the deplorably low market value of the educated man ? The reply is simple. The low value is due partly to over-production and partly to the unsuitability of the men to the requirements of the profession they join. The curtailment of the number of students in our schools and colleges is out of the question. In every country, as I have said above, the demand for higher education is increasing and any curtailment of the number of students will be strongly resented and even actively opposed by the people The only remedy lies in completely overhauling our system of education which is antiquated. Take, for instance, the present course of studies. These courses were devised to produce officers and clerks necessary for the administration of the country. We have now produced such officers and clerks several times over. It is, therefore, essential that the courses of studies in our schools and colleges should be so altered as to fit young men for all professions of life. Every country after the War has had to face a similar situation, though not in such an acute form as we are facing to-day. Germany has made technical education compulsory for every boy and girl. England, on the other hand, introduced the Sandwich system of teaching technical and cultural subjects.

The development of Indian industry should constitute an essential part of every system of education. The present system of technical education, if it may be called a system at all, is hopelessly deficient. There are few professional schools for the training of artisans. There are also few engineering colleges and schools of technology which profess to train engineers. These colleges aim at producing men who may be able to design machinery, or new buildings, but we have not paid any attention to what may be called the secondary technical education, which is far more important. We should aim at producing in large numbers foremen who

The demand for higher education has been steadily increasing in every country, specially after the War. India is not an exception. During the last eight years, the number of students in college classes has increased from 59,595 to 99,166.

In a vast country like India, which cannot afford the luxuries of teaching Universities, affiliating Universities cannot altogether be dispensed with. I do not object to the existence of teaching Universities. They are all doing excellent work, but their cost is not commensurate with the result. Though we ought to maintain a number of teaching Universities, yet in a vast country like India, the establishment and maintenance of colleges under affiliating Universities cannot be dispensed with.

I do not wish to discuss the question of autonomy of the Universities. The word is misunderstood and misapplied. The Universities should enjoy a great amount of freedom in instruction and in framing their courses, but the appointment and promotions of the staff should always be in the hands of persons who have no personal financial interest.

In the administration of Universities we should not lose sight of the importance of economy. Efficiency is not necessarily secured by spending large sums of money on expensive buildings and costly equipment, which involve the waste of national resources. The success of an institution does not depend upon palatial buildings or on costly staff but on the earnestness of its workers.

Unemployment.

It is an established fact that the question of unemployment is much more acute among educated classes of our country than among workmen and artisans. It is easy to find a graduate on a salary on which a good cook or a skilled artisan is not always available. An illiterate skilled workman demands higher wages than an educated young man who

pects of teachers in aided schools also cause great hardship. In one Province the schools have been turned into business concerns. Teachers are dismissed before the long vacation to avoid payment of their vacation salaries and to enable the proprietors to recruit cheaper staff after the vacation from among the newer graduates. The system of grant-in-aid is also a great source of annoyance.

The courses of instruction and methods of teaching in the high schools need a thorough revision. The courses are framed with the single purpose of preparing the boys for admission to the University. They are too literary. The courses of instruction should include a large number of professional and industrial subjects.

Intermediate Colleges.

The scheme of Intermediate Colleges advocated by the Calcutta University Commission has been tried by several provinces but without success. The failure has been due not to any inherent defect in the scheme itself, but to the fact that the recommendations of the Calcutta University Commission have been misunderstood and misapplied.

We have to choose one of the two alternative methods :—

1. To raise the standard of the High School Examination to approximately the present Intermediate Standard with three years' course for the B. A. degree and to abolish the Intermediate Examination. This means the transfer of one year from colleges to schools.

2 To keep the present standard of the High School Examination with a four years' course for the B. A. degree. If four years are considered too long a period to be passed over without any public examination, an Intermediate Examination will be necessary. I definitely advocate the former method and this was, in essence, the recommendation of the Calcutta University Commission. A system of splitting the courses into literary and vocational should also be continued into the Intermediate classes.

tions. Denominational institutions have no place in the democracy towards which we are moving. Some persons strongly believe that nationalism in India cannot flourish until separate electorates for political bodies are abolished. The demand for separate electorates is the result, and not the cause, of the tendency towards separation whose germs are sown in denominational institutions. In case the existing policy is not revised, every community in India will be compelled to set up its own organisation for collecting funds and running its own educational machinery. This will lead to the demand for cultural autonomy which some of the Central European States have already granted to the minorities in their country. State responsibility for all forms of education, as in most countries of the West, is the only method of checking this tendency towards separation.

(*b*) The division of schools into State schools and Aided schools and their further denominational sub-division has created several brotherhoods among the teachers of secondary schools. It seriously affects the *esprit-de-corps* of the teachers and is reflected in the attitude of the pupils towards national problems.

(*c*) The present policy has led to wasteful distribution of high schools. The high schools are mostly situated in close neighbourhood of each other in big towns; the interests of the rural population are entirely neglected and they are sure to assert themselves in the near future under the new constitution. Taking the country as a whole, a large number of small high school, all of the same type, in close vicinty to each other, involve national economic waste. The boys could be more efficiently and more economically taught in a single school with parallel classes.

The present policy has also created some minor problems which seriously affect the efficiency of teaching. Its pernicious effect is not fully appreciated. Foremost among these problems is the question of the not altogether happy relations between teachers and managers. The pay and pros-

advocates of primary education, but the problem of secondary education has neither been ever seriously debated in any council, nor ever satisfactorily reviewed by any Committee or Commission in recent years. Secondary schools are the backbone of education in every country, and by neglecting them we lower the efficiency of both higher and primary institutions. The present policy of the Government concerning secondary education was first initiated by the Board of Directors in their famous despatch of 1854. It was elaborated by the Hunter's Commission of 1882 and reiterated by the Government of India in the educational policy laid down by them in 1904 and again in 1918. This policy is strictly followed in all the provinces of India. It has never been seriously challenged, although it has been unfavourably reviewed in the reports of the educational authorities. The present policy is that the Government should leave secondary education to private enterprise and maintain efficiency by means of inspection, recognition and the system of grants; it should only maintain a few secondary schools, usually one at the head-quarters of each district, to serve as models for recognised schools. This policy was initiated in pursuance of the system followed in Great Britain in the nineteenth century. The position has, however, changed after the War. In Germany, France and other European countries, the State is entirely responsible for secondary education, and it maintains a sufficient number of secondary schools at its own expense in places where they are needed. The United Kingdom has now changed its old policy and is now establishing State secondary schools under the direct supervision of local authorities.

The policy of the Government of India has not been successful. There are strong arguments against the present policy concerning secondary education, some of which may be briefly stated as follows:—

(a) It is an established fact that in every country private schools are almost always denominational institu-

Legislative Councils in every province have given their blessings to compulsory education but have at the same time left its enforcement to local bodies, who do not possess sufficient resources to carry out the instructions of the legislature. The Hartog Committee as well as the Literacy Committee of the United Provinces have recommended that the Government should directly assume the responsibility of introducing compulsory primary education, and the administration should be gradually transferred to local bodies with necessary funds for continuing the work of compulsion.

I have repeatedly advocated in the Legislative Assembly that the Government of India who levy income tax should bear half the cost of this additional expenditure on primary education.

It has not been definitely decided whether income-tax will or will not be transferred to the Provinces. In case it is decided that the future Federal Government will retain the revenue from income-tax, it is essential that provision should be made for giving grants to Provincial Governments for primary education to the extent of 6½ crores, which is half of the additional cost; the remaining half may be collected by a direct additional tax. The people of India will readily accept the additional tax provided they are convinced that money so collected will not be mis-spent on costly buildings and unnecessary overhead charges. The period of compulsion and the courses of instruction have not been definitely settled. There is weighty opinion in favour of four years' compulsory education and the gradual extension of the period as circumstances permit. As regards the courses of instruction, I may be permitted to quote from Hartog's Committee report that in primary schools we should teach "the three R's. and no humbug."

Secondary education is the weakest and the most neglected section of the programme of education in India. There are advocates of higher education and there are

estimate of the Hartog Committee is very high, and taking the figures and arguments of the Committee itself, I have come to the conclusion that we require 2 crores of rupees for introducing compulsory education among boys and 11 crores for introducing it among girls. The population of school-going age in British India is estimated at about 34½ millions. It is universally admitted that not more than 80 per cent. of boys of school-going age can be brought under instruction, which means that we have to provide education for 28 million children of whom 14 million may be boys and 14 million girls. The number of boys now receiving instruction is 7½ million and the number of girls *is* 1·7. It is also admitted by the Hartog Committee that about 2·8 million additional pupils can be taught in the existing schools without additional staff. We have, therefore, to provide instruction for 3½ million boys and 12·6 million girls more. The cost of instruction was taken to be Rs. 8 per pupil, which is obtained by dividing the total expenditure by the total number of pupils now in schools; but in case 2·8 million pupils for whom vacancies exist are admitted in the existing schools with-out involving any additional expenditure, the cost per head will be reduced, under the scheme of compulsory education, to Rs. 5½; and taking Rs. 5½ per pupil as the basis, we require about two crores for introducing compulsory education among boys. Now coming to girls, we have to provide instruction for 12·4 million girls. Assuming that about four million girls will be taught with the boys in mixed schools in villages and the remaining 8·4 million in separate schools where the cost per head is Rs. 11, the total expenditure of enforcing compulsory education for girls comes to 11 crores. This cost can further be reduced if the recommendations of the Literacy Committee of the United Provinces are accepted, *viz.*, that one half of the primary schools may be of the old oriental type, that is, improved maktabs and pathshalas, where cost of education per pupil is Rs. 4 only.

be able to produce men with higher ideals, broader out-look, efficient in state-craft and able to earn their livelihood in other walks than Goverment service. Reforms in education are overdue, but there is hardly any visible sign of their introduction.

Primary Education.

It is a very distressing feature of the system of primary education in India that out of 100 pupils who join the first class only 18 reach Class IV. It is universally admitted that lapse into illiteracy cannot be prevented unless a pupil has studied up to Class IV, consequently money and labour spent on 82 per cent of our children in the primary schools is wasted. Mr. Mayhew, the late Director of Public Instruction, Central Provinces, calculated the amount of this wastage and his conclusion, admitted by the Hartog Committee as well, is that India is losing 3.6 crores of rupees every year in stagnation and wastage in primary schools. No serious attempt has ever been made in any province to prevent this wastage and stagnation, or to avoid the financial and intellectual loss to the country which it entails. Both the Royal Agricultural Commission and the Hartog Committee came to the conclusion that the only effective measure against this waståge is the enforcement of compulsory education. The Royal Agricultural Commission has said : "We are convinced that the progressive adoption of the compulsory system is the only means by which may be overcome the unwillingness of parents to send their children to school and to keep them there till literacy is attained"

The question of compulsory education has been before the public since its initiation by the late Mr. Gokhale in 1910. He pleaded for an additional expenditure of 5½ crores of rupees. The estimate was reviewed by the Hartog Committee which came to the conclusion that the cost of introducing compulsory education among boys would be 6½ crores and among girls 13 crores. We thus require 19½ crores for introducing compulsion both among boys and girls. The

share in education which had hitherto been usurped by men; and above all, the new educational system has overstressed the vocational aspect of education. The War, however, produced no impression on the Government of India; instead of becoming alive to the educational needs of the country and ministering to them, it has shirked its responsibility by transferring education to the Ministers of the Provinces. Responsibility has been transferred, but the Provincial Ministers have not been provided with sufficient resources for discharging that responsibility. They have had no control over funds, and are entirely at the mercy of their all-knowing Civilian Secretaries and the Directors of Public Instruction, whose twenty different duties have been enumerated by the Hartog Committee. These Ministers are selected not for their academic abilities but on account of their willingness to follow submissively the orders of the Executive Government. As a result, no progress is visible in the education of any province. Dissatisfaction is now wide-spread, and if a satisfactory solution is not found in the near future, there will be a general educational revolution all over the country, a revolution more dangerous in character than either the movement for non-co-operation or the movement for non-payment of taxes. People are so dissatisfied with the existing system of education that they readily agree to non-cooperate with it, but are compelled to return on account of the absence of a better system. The Government of India ought to have initiated educational reforms simultaneously with or immediately before the introduction of political reforms in 1921.

The Government alone is not to blame for the neglect of education. Our public men are equally responsible for it. Great agitation is now going on for the introduction of new reforms, but whatever may be the value of these reforms, positive or negative, we shall not be able to produce men competent to take charge of the administrative machinery till our programme of education is overhauled. We should

5. *Accepting the algebraic method as universal and valid in all cases, was seen more among mathematically brained subjects.* They preferred an algebraic solution as being less empirical than an arithemetical one.

6. *Accepting a procedure after understanding the reasoning of its derivation, which means educing a rule and then accepting it, was noticed in very few cases.*

Looking to these various kinds of proof in the light of Spearman's system of Psychology, we find that the processes of education are very often adulterated by the principle of retentivity. This latter principle is responsible for errors. In the first five kinds more reliance is placed on retentivity and consequently there is a good deal of scope for error.

Conclusion—The acceptance of a certain line of reasoning is not always inherent in the logical sequence of the various steps constituting argument. The statement that a proof can be of manifold levels is here confirmed in the case of adults also. The bearings of the result on the practice of education would be interesting but need not be detailed here.

The All-India Educational Conference

Lahore Session, April 1933

Presidential Address

BY

Dr. ZIAUDDIN AHMED, M. L. A., C. I. E., M. A., Ph. D.

There have been great educational upheavals in every country since the War. Old ideals have been modified and altered; new types of educational institutions have been established; the doors of universities and colleges have been flung wide open to the working classes who, till recently, were unable to secure admission to them; women by determined and continued struggle have secured their legitimate

introspections, matter relevant to the nature of proof was collected.

The various grounds for the acceptance of a certain line of reasoning could be classified under six headings :—

1. *Accepting a formula or rule because it worked in a few cases was very common.* The acceptance was not based on reasoning about the derivation of the rule nor on understanding the derivation even when given. The results of the new method were checked to see if they satisfied the conditions of the problem or agreed with the results by the subject's own method. Non-mathematical subjects were less interested in understanding the derivations of the rules, in seeing why the method was valid, in the "mathematical proof" as one subject called it. But it was seen that when a rule was accepted on these grounds, there was not a complete confidence in its validity or universality. There was a little dissatisfaction and the subject felt the need of checking the result obtained by the rule.

2. *Accepting a new procedure from analogy.* If the data of a particular problem were similar to those of a problem where a procedure was known to hold, the same procedure was naturally inferred to hold in the particular problem also. In a few cases, a procedure was supposed to to be understood by some irrelevant analogy. Often, this kind of proof followed the first kind, so that it seems that this is a higher level of proof and gives greater confidence and pleasure Even this kind of proof does not carry complete confidence.

3. *Accepting a formula because it is familiar was also found in a few cases.* But, then, the need was felt of checking it, to see if it worked. If it did work, it was thought to be understood.

4. *Interpreting a new method in terms of one known already was another means of accepting it.* This procedure also did not give complete confidence and satisfaction.

The Nature of Proof

BY

D. D. SHENDARKAR, Ph. D., (London),

Oosmania Training College, Hyderabad Dn.

Sir Percy Nunn suggested that the meaning of "proof" may be different with children of various levels of mental development. The rigidly logical and objective reasoning of the adult, as for example, the one employed in present-day school geometries, may not only be not comprehensible but may also be not convincing to the child. On the other hand, what is sufficient ground for belief to the young child may be deemed insufficient by the same child at a later age when he has grown in experience. This fact he links up with the three stages of the development of a subject, viz., Wonder, Utility and System.

The reaction against the ideal and objective character of proof is expressed clearly in the report by the Mathematical Association on the "Teaching of Geometry in Schools." Says the report :—

" If there existed an ideal standard of proof, something might be said in favour of requiring the beginner to conform to it ; one might even hold that departure from the utmost rigour is least pardonable when habits are being formed. But if the standard must be relative, it should be adjusted to the learner's mentality rather than determined by the position which Peano or Whitehead has reached at a given moment, by the level which the teacher happened to attain during his own training, or by Euclid's choice for the adult students of Alexandria."

The Experiment.—Apart from these observations, there is little experimental work on the subjective nature of proof. In my investigation, Arithmetical problems were given for solution to twelve students of Psychology. From their

take and hold your proper place in the village life, you must practise what you preach. You should teach them the dignity of labour by your example. Scout work is sure to help you in this direction. Give practical training in social service to your children whenever a suitable opportunity occurs. In this way boys and girls are sure to learn co-operation in the village.

Teach the villagers how to free themselves from the clutches of the money-lender by starting co-operative credit societies. Impress upon their minds that their happiness and prosperity depend on their own efforts. Deep ploughing with improved ploughs, using good manure, living in well-ventilated houses, eating clean food, drinking pure water and breathing fresh air, removing all filth to keep out the enemies to health, such as flies, rats, and mosquitoes, teaching not only boys and girls but also adults the three R's, using every opportunity to take the boys and girls out to bring them into direct contact with Nature, leading an exemplary life to deserve the affection and respect of the villagers, giving them the benefit of your wisdom and experience in all their difficulties, and, above all, being regarded by one and all of them as their rare and genuine friend—these are some of the most important items in your programme of work.

Friends, the subject is vast, and the time is limited. I have only sketched an outline of the work to be done by every village teacher in the matter of rural reconstruction. Our benign government is spending a good deal of money on education, and on you depends the success or failure of village-uplift work in the State. May God give you the strength, courage, and wisdom to play your part well !

years old. In the light of this discovery, you, village teachers, are sure to realise the terrible handicap under which you labour.

Friends, need I remind you that the future of the village lies in your hands? You, as village teachers, must raise the banner of "Up-lift" in your villages. The task is, no doubt, onerous, but it is also honourable. A happy contented village from which there is no exodus for earning livelihood must be your aim. Healthy men, women and children living in good sanitary surroundings must be the result of your selfless work. Your influence due to your sterling character and willing service should command their love and respect. A good teacher has always been respected in our country. If you are one, the villagers are sure to have confidence in you and treat you as their leader. A clean well-ventilated school, with a cheerful selfless worker in it, is sure to attract the village boys and girls to be moulded into useful farmers, honest folk, and loyal citizens. In after-life they are sure to do you credit. Brothers, don't you think that a life of so much usefulness would be a joy to you?

I have already pointed out that a village school should fit boys and girls to carry on their ancestral occupations. A farmer's son should, through the education he receives, become a better and more intelligent farmer; a carpenter's son should become a better carpenter, and so on.

In this life of ours, nothing is of any value without health. Health implies cleanliness, personal and general. By our efforts the unhealthy and uncomfortable village should be converted into a healthy and comfortable home. The villagers should be made to live in sanitary habitations. The villagers should unhesitatingly refer their problems to you for solution. If you have absorbed the spirit and training of the rural school your equipment for the new part you have to play will be complete. Let me repeat that to

the same slavery to greedy money-lenders, and, above all, the same philosophic resignation to Fate. The poor ryot is illiterate and ignorant, and his wife or sister or daughter is no better. His children are unhealthy and emaciated. Year in and year out, from day to day, his debts go on swelling. He has the ambition to better his condition, but he knows not the ways and means thereof.

Many of my students told me that in almost every village the parents put the question to the canvassing schoolmaster, "Your education is of no use to our boys. It does not help us in our agricultural operations. There seems to be a gulf between your work and our needs". If this is true, and I think it is, the parents have wisely expressed their disapproval of the present primary school. The poor ryot desires to have a bumper crop and healthy children. Improved methods of agriculture and good life in sanitary conditions are the only means to secure this end.

Teachers must remember that the children of to-day are the citizens of to-morrow. They are our hope. We can make or mar them. Rural education of the right sort must aim at greater efficiency throughout the whole field of agricultural production, and must make the business of cultivation more profitable to the farmer. The village teachers' business is not only to teach the children the three R's, but to remove illiteracy from among the adults as well. This can be accomplished through night schools and by closer co-operation between the teachers and the villagers. You all know that good home-training is a condition precedent to good school-training; but there can be no good home-training so long as the parents continue to be illiterate and ignorant. Women must be so educated as to enable them to give their children suitable training at home, which would serve as a good foundation for your work in the school. The latest books on Child-Psychology tell us that the child's character is made or marred by the time he is six or seven

them an honoured place as the very rock-bottom of our entire educational system.

And what has been accomplished for and through the Kindergartens in my own country, I am confident can be as fully accomplished for and through Kindergartens in India. Further, I believe the means used by us, with some modifications to suit national differences, might just as effectively be employed by you.

The Place of a Village Schoolmaster in a Scheme of Rural Reconstruction in H. E. H. The Nizam's Dominions.[1]

BY

Mr. A. VENKATARAMANIAH, B. A., L. T.,

Superintendent, Government Normal School, Warangal.

Mr. Chairman and Gentlemen,

India is essentially an agricultural country. It is divided into thirteen Provinces, and 156 recognised principal States, of which Hyderabad is the Premier State. The chief occupation of the majority of the people is agriculture. In this State, as in British India, the village has not kept pace with the progress of civilization. If a person who had lived in an Indian village two centuries ago, were to visit it again, he would not notice any appreciable change. With a few exceptions, the agricultural conditions would be found much as they were in his time. The same ill-ventilated houses, the same customs and traditions, the same agricultural implements, the same sorry cattle, the same squalor, dirt and disease all round, the same apathy and conservatism,

1. Notes of a lecture delivered at the Warangal Subah Teachers' Conference, in December 1932.

and so on, occasionally giving up an entire meeting to the discussion and answering of questions brought in by her guests.

(*e*). Constantly the teacher urged upon the parents the reading of Kindergarten literature, offering the loan of her own personal supply and suggesting where other books might be obtained. Now and then she invited one of the more progressive and interested mothers to give a talk or read a paper at the following meeting, dealing with some specially assigned subject chosen, perhaps, by the guests themselves.

Reports of these meetings were published in the newspapers and it was not long before public interest mightily increased and there soon followed a radical change in sentiment toward the Kindergarten. Enlightenment had aroused a sympathetic attitude, and this sympathetic attitude led to action which finally culminated in that co-operation which had been so sadly needed and perseveringly sought.

The time was now ripe for our final step. With the public working with us, we felt confident that helpful legislation could be secured. So our Kindergarten Association sent representatives to lay before our School Boards, public-spirited men, Governors and Legislators, the difficulties which were handicapping our Kindergartens, and to urge proper legislation for their reform. Our appeals were so convincing that soon, with the help of our now multitude of co-operating friends, we won out and it was not long before money was apportioned for supplying needed materials and housing facilities; laws were drawn up and rigidly enforced restricting the course of study to the proper Kindergarten curriculum, and the eligibility of pupils to proper Kindergarten age and aptitudes, and making the date of enrolment uniform with that of the rest of the school, and so on. Thus our Kindergartens came to function as they should, and the good they have accomplished has given

that there should be no peace for the parent or friend who failed to accept. Before the opening of each of these meetings, in order to break down any possible restraint, and to promote a friendly atmosphere, we served simple refreshments. After refreshments, at each meeting the teacher gave one of a regular series of informal talks in which she explained the underlying purposes and values of the various Kindergarten materials and activities.

(*a*). As she dealt with Materials, she demonstrated her points by the use of concrete illustrations transforming her audience into a Kindergarten class, bringing them at each step to an understanding of their values to the child.

(*b*). When she spoke on the Circle Talk, again she regarded her guests as a Kindergarten class, leading them to see the opportunities these talks provide for self-expression, language development, training in poise, gaining of valuable information, promotion of right relationships with others, and so forth.

(*c*). Again her audience became her class as she taught them various Kindergarten games; and they discovered first-hand how valuable these are in breaking down social barriers, promoting a spirit of fair-play and good sportsmanship where the losers accept defeat cheerfully and the winners take success modestly. There was also ready recognition of the opportunities afforded by these games for physical, mental, and moral development. For what child, for example, can play a bird game without the strengthening of his body in imitating its flight, the quickening of his mental alertness, and deepening of respect and humane sympathy for our helpless animal friends as he imitates their search for food, their care for their young and their efforts to escape injury or death at the hands of their numberless ever-watchful foes ?

(*d*). And thus she proceeded, from month to month further demonstrating the purposes and values underlying the Kindergarten songs, stories, cccupations, gifts,

money, we cannot get materials, we cannot get co-operation. Is there anything we can do to bring about a changed attitude toward the Kindergarten enterprise?

First of all, do not get discouraged. Discouragement never got anybody anywhere! This last question leads us back to our starting point. We believe there are means whereby you can effect a decided change, and we shall now proceed to answer this and others of your major questions by relating how we met identical situations in America.

1. At the outset, we organized ourselves into a Kindergarten Association for the discussion of our problems and for the formation of plans to overcome them. To meet our chief difficulty, that of winning co-operation, we set to work, by various means, to instruct the general public and our fellow-teachers along those lines already mentioned at the beginning of this paper, such, for instance, as the underlying principles of the Kindergarten, its aims, and so forth.

2. We started a systematic programme of regularly and persistently calling on the parents and firiends of our pupils. This had for its chief design the establishment of friendliness and helpful intercourse between parents and Kindergarten teachers.

3. We inaugurated weekly "Visitation Days" for the purpose of inducing parents and others to visit our Kindergartens during school hours. Through the press, and, until the practice had become an established custom, through written invitations also, we announced these "Visitation Days" and explained something of their aim. On these Visitation Days we presented only our regular daily programmes of work, our object being not to entertain but to instruct.

4. Once a month, at the close of the afternoon session, we held Parents' Meetings which we also thoroughly advertised through the newspapers and by written invitations sent home with the children, whom we sought so to enthuse

two or three years ago, I saw a fine little house of this sort, with door-way, shelves, seats, teacher's cabinet, and protected openings for windows, which had been put up almost entirely by First Grade boys. Put such an one up and continue to urge the necessity for a pukka one.

15. Is it not detrimental to our entire school system that the Kindergarten, the very foundation of it all, is so sadly neglected?

Yes, the neglect of Kindergartens is most detrimental to any school system.

16. Is not the apportionment of funds to our Colleges, Universities and other schools of higher learning entirely out of proportion to that provided for Kindergartens?

The opinion of some of your best educators is that a far more equal distribution of money among your various educational institutions could be made.

17. What influence may an unwise apportionment exert throughout our entire school system?

According to the views, again, of some of your thinking educationists the influence exerted through unwise distribution of monies is detrimental to your entire school system; for any hampering of work, especially at the start, can only result in a serious crippling of the entire system.

18. How can we Kindergartners keep up-to-date in teaching methods when we have not access to libraries and the majority of us cannot afford to purchase current Kindergarten literature?

Induce several Kindergarteners to club together to purchase such literature and, if necessary, to cover postage on its distribution among Club members.

19. When we left our Training Schools, we came to our work with high ideals and firm purpose to carry them out. But we are getting discouraged, for we cannot get

11. What reply shall we make to those who object to their children receiving Kindergarten instruction and insist on their being taught Primary and other subjects foreign to the Kindergarten course?

Such persons need to learn the purpose of the Kindergarten. Presently we shall deal more fully with this problem.

12. What reply shall we make to the charge that Kindergarten children spend their school hours in play and do not learn anything?

Freely acknowledge the first "charge" as being true, and then patiently and diligently work for that enlightenment of your accusers which will lead them to acknowledge that play is, as recognized by the highest scholastic authorities, the only pedagogical, physiological and psychological method of teaching these children of pre-school age.

13. How can we give proper instruction without adequate material with which to work?

You cannot do it. Sufficient material is absolutely essential to successful teaching. However, you may largely supplement your limited supply by the use of seeds, shells, grasses, grains, sterilized earth and sand, cardboard and wood from discarded boxes, and inexpensive materials from the bazaar, such as paper, string, glue, toothpicks, and potters' clay. Also by having as much as possible of your play-building materials made by a low priced carpenter instead of ordering them from expensively priced shops.

14. With no avilable money, how can we better our present unsuitable housing conditions?

If you can secure a bit of land, somewhat removed from the confusion of the other classes, the problem is not an altogether hopless one. Interest the older boys of your school in building a mud house for your class. At Cavali,

8. How can we increase the interest of our pupils in doing and preserving hand-work?

Provide hand-work which will interest them and attractive materials for their use. Frequently, at the close of the lessons, call for a vote from your class as to which are the best pieces of work, and then hang up in the room the pieces of their choice. Or, star each bit of satisfactory work. Most children are proud of such distinctions and find them an incentive to put forth their best efforts. Of course, the teacher will guard against any tendency on their part to be continually looking for opportunities to "show off." Another effective plan is to have the daily work mounted in regular hand-work books and permit the children to take thes home at the close of the term.

9. How can we secure better attendance?

Call at the homes and try to discover the causes for irregular attendance and then work with the parents to remove them if possible. Use such devices as Perfect Attendance Honour Rolls and Perfect Attendance Honour Cards.

10. What shall we do with the restless and naughty child who manifests little, if any, interest in Kindergarten activities?

Such lack of response in a well regulated Kindergarten is abnormal and generally, where such cases exist, there is some mental or physical defect in the child requiring medical attention. In case there is no school physician, the parents of the child should be notified and advised to have him examined by a competent doctor. Again, it may be that the work you are giving him is either too difficult or else not difficult enough to gain and hold his interest, in which case, you will endeavour to suit the work you give him to his requirements.

six years of age, should come in the morning for a daily session of about two and a half hours. Regular promotions of morning classes into First Primary, and of afternoon classes into morning classes should be a yearly, or semi-yearly, part of the regular school promotion programme.

4. How shall we overcome class distinctions?

Carefully select and employ those Kindergarten games, such as "Come, Take a Little Partner," "Lads and Lassies," "Little Playmate Dance With Me," etc., which are purposely devised to meet this very emergency.

5. How can we hold the attention of our pupils when they come to us with such different backgrounds?

Studiously observe that Kindergarten rule which calls for the selection of only such topics for your Circle Talks as make a general appeal; for instance, family life, different foods, animals, trades, and so on. As all activities of the day centre about the Circle Talk, this should solve your problem.

6. What can we do to overcome the aversion of some of our pupils to manual labor?

Through playing Trade games, specially designed for this purpose, such as The Carpenter, the Miller, The Farmer, and so on, your pupils should soon come to recognise the interdependence of man and the universal need for co-operation, and thus be led to a sense of the dignity of labour as exemplified by Christ.

7. How can we meet the requirements of visitors desiring purdah accommodation?

By the exercise of a little ingenuity this can be easily accomplished. Curtain off portions of your school room, grounds or veranda with sheets and the like, remembering that in accredited Kindergartens only women teachers are employed.

general public, nor could the general public attend such if they were provided. What, then, were we to do? Were there any possible means whereby to accomplish so great a task? We believed there were and we set about to discover them, and discover them we did!

But just here let us pause before proceeding to these greater difficulties to consider some of the lesser ones which are perplexing your teachers. They are as follows:

1. How shall we break down language barriers among our pupils?

Children speaking vernaculars differing from the one employed by the teacher will, by careful listening and observation, soon acquire a working vocabulary.

2. How can we prevent ayahs and visitors from talking, walking about the room, and otherwise disturbing the class?

In conspicuous places post notices requesting the non-continuance of such, briefly stating the reasons for your request. If disturbances continue, firmly but courteously, call attention to these notices. If they still continue, stop all operations till they cease. In America, ayahs or nurse maids, as we term them there, would not be permitted to remain during Kindergarten sessions.

3. How can we establish unity of thought and action among our pupils when there exists so great a diversity of ages among them?

You cannot establish such unity under this condition. Your class should be divided according to the age of the children in order successfully to carry on the regular two-year course of standard Kindergartens. The younger children, from four to five years old, should be enrolled in the afternoon class, meeting for a daily programme of about two hours; the advanced class, made up of children from five to

riculum differs from a High School curriculum. The natural outcome of such widespread ignorance was a general belittlement of the work and, consequently, a most limited and inadequate equipment with which to carry it on, and the poorest of accommodation in which to house the pupils. Of course, these major difficulties included a host of minor ones which, however, with the overcoming of the greater ones, in many cases automatically righted themselves. Judging from my observation of your schools and from interviews with some of your outstanding educators, I am strongly of the opinion that the crippling of India's Kindergarten work may be due to conditions very similar to those we had to face and to overcome

As we plodded on and on, there was always the feeling that if only we could secure the co-operation of educators and others, our problems would quickly vanish. But there was no such cooperation, and for a long and weary time there continued to be no co-operation. Then, at length, it dawned on us that, in order to secure this desired co-operation, we should have to establish unity of purpose between these others and ourselves, and that, in order to bring about such unity, we should have to lead those, whose help was so imperative to the establishment and functioning of real Kindergartens, to an intelligent understanding of certain fundamental facts; we should have to acquaint them with the vital purposes of the Kindergarten and instruct them concerning its underlying principles, the aims of its various activities and the necessity for, and the basic values of, all such. Thus, and thus alone, we believed, could we secure for this crucial period of Kindergarten child-life that firm basis for the all-round development of the little child, that sure foundation for his entire future course, which lies at the root of all pure Kindergarten education.

But how was it possible to provide instruction in such a wholesale manner? Most certainly our United States could not establish Kindergarten Training Classes for the

India's Kindergarten Problems & How to Meet Them[1]

BY

Miss SARAH E. LOUCKES

American School for Missionary Children, Kodaikanal.

A few years ago when fresh from a three years' rigid course in Kindergarten and Primary Training, I entered upon my profession as Kindergarten teacher in America. I found problems very similar to many I have observed in your country hampering the successful execution of my duties.

In the first place, the uninstructed public in general, and the majority of even our best educators, in particular, held most erroneous views concerning the purposes and operations of the Kindergarten. To some, it was simply a place of amusement; a sort of nursery for little children with trained ayahs in attendance for the purpose of relieving mothers of the responsibility of caring for them. To others, it was merely some sort of an unorganized Pimary Class differing from the ordinary one in that there were no rules regulating the age limit, the mental capacity, the moral development, or the time of enrolment for its pupils; a class in which subjects entirely foreign to the Kindergarten curriculum were pursued. The classes, in some schools, were heterogeneous gatherings of children ranging in age from two and a half years upward, and they often consisted of those who were abnormally weak, physically, mentally and morally. Frequently, there was an unlimited enrolment of pupils entering and dropping out at any and all times during the school year. There were pitiably few teachers, outside the specially trained Kindergarten force, who had the remotest conception of the function of the Kindergarten, or of a Kindergarten programme which differs as widely from a Primary programme as a primary cur-

1. A Paper read at the Warangal Subah Teachers' Conference in December, 1932.

The child must find his mistake for himself. He must think, "What have I done that this won't work?" The Dalton method has, theoretically, outstanding claims to the first place as a remedy. The older the pupil the more valuable is the Dalton Plan. Our teaching must be alive and the Dalton Plan means that inspiration must be gained more from the book than the teacher. As yet India lacks the writers who will give for school use colourful pictures of what man is doing in the world of to-day. The Dalton plan also demands a much larger expenditure on the Staff. Unless the work is carefully corrected, the exercises done are useless, for the same mistake will be repeated. The amount of correction needed is so much greater than is ordinarily the case that great increase in the number of teachers is essential. More highly trained teachers are also essential, for the success of the method depends on the assignments. Dull, unimaginative assignments kill creative thought.

But the problem of the backward child is of such importance (they form in England for instance 10% of the urban child population for *poor* rural districts—a small number reach 25 %) that it merits far more attention than is commonly given to it. Any method which brings home to the child that he can do something better than some one else is the first step upwards. If they are musical, let them take this in playing the march for school assembly; if they are neat in work, let them do a school poster for a passage way or entering up school athletic scores, or something of general interest. But to find these abilities the teacher must get to know the children better by visits to the homes, in sport, in welfare work with seniors, or in school expeditions. The onus is thrown on the profession to follow the steps of the world's greatest teacher, "Suffer the little children to come unto me and forbid them not for of such is the Kingdom of Heaven"

Having discovered the cause of backwardness in any one child, the next problem is to remove it. Here again tests of progress are essential. One authority in the U. S. A. has shown that in one typical school the number of children not placed in the right class is amazing. At no period in India's life is the need greater than to-day for gifted leadership. It is not fair to the gifted children, nor to the nation nor to the less gifted not to make special arrangement for such. But to help the backward child particularly various methods have been adopted.

Removal of Backwardness.

1. One teacher is sometimes set apart whose special job it is tc study the backward child, especially to visit the home from which he or she comes. The specialist should be a sound judge of character, for parental conditions often are the key to the solution.

2. Another method is more careful grading. There are A, B and C classes. Such do not mean that a child may necessarily always stay in a C class through the school, but the consciousness that the work where he is can be satisfactorily done will often spur him to greater effort. " Some time I have done something " is the first step to " I can do something more difficult. "

3. In big towns special classes are often organised. The children are drafted back to the usual ones some months later.

4. In a very large school the plan of having all the school working at the same subject at the same time has much to recommend it. A child is, say, in I B for one language, II C for another, II C for mathematics, and I A for his class In all cases of specially backward children manual training is essential. It has been proved that as manual skill increases so do brain centres become active.

The value of the Montesorri method for small children lies largely in the fact that the apparatus is self-corrective.

children it absolutely bars the way to the best progress of which they would otherwise be capable.

Training centres insist upon the study of psychology as an essential for satisfactory teaching but those with a real love for children will use applied psychology naturally. Such need not deplore this lack of theoretical psychological knowledge. A sympathetic teacher with high ideals can accomplish what a university graduate, without such, can never succeed in doing.

Corporal punishment is another method of crushing self-respect which in small schools is often far too greatly resorted to. We fail as teachers when we change the act but not the attitude. With girls resource should very very seldom be needed to this form of restraint. With boys when they are at the animal stage of development, the knowledge that a disregard of the needs of others in the class will result in a caning acts as a good deterrent. Up to the age of 10 a helpful practice might be to keep a small note book in which a jotting was made of how many reminders to pay attention and not interrupt needlessly were given in a week in one class by the class teacher. If the number were over 6 the cause should be sought by the teacher not in the boy but in himself. Uninteresting lessons must produce inattentive children. But with all adolescent boys, especially is small schools, a full record should be made of the offence and the number of cuts given. Respect for his own body and its needs is a very necessary lesson in India. Frequent corporal punishment arouses no shame but rather a tit for tat attitude. As a prisoner once said to a Chaplain, " Well I've paid for what I did, anyhow!"

Corporal punishment when frequent destroys self-respect and in the crisis of life it is our ideal of the self which determines our actions.

teacher who on his daily first encounter with his class lifted his hat to them for "who knows that I am not saluting an embryo genius" enshrines a needful principle.

The virtues of the world's greatest educators are their greatest weakness in that a true leader must be a man of strong personality. Yet it is fatally easy for such so to impose their own personality upon the taught that they grow up spineless jelly fish incapable of self judgment and self support.

Miss Clemence Dane (an English play writer) has painted an unforgettable picture in one of her novels of the evils to which false sentimentality may lead. Her story is somewhat overdrawn—the danger is greater in girls' schools than boys'—but it is true that unless a healthy big sister or big brother attitude is adopted towards our pupils, absolute tragedy may follow, perhaps not during days of school but 30 or 40 years later. One of Miss Dane's characters, a highly strung, sensitive and gifted pupil, committed suicide.

Yet, especially in India, conditions tend towards the crushing out of individuality, especially in the case of girls. While the self-sacrificing abnegation of the women of India commands the highest respect from all for the ideal at which so many aim, and to which in large measure resort, the teaching profession should be alive to the fact that it is a standard which is often only attained by much needless suffering. A mother in whom the instinct of self-abasement is too pro nounced or a father in whom its complement, self-assertion, is too developed means a home in which these traits are almost certain to be reproduced in some of the family. Suicides are found among those whose instinct of self-abasement is too strong.

Many teachers crush individuality by the use of sarcasm. It is a most heinous method of securing results, for the pupil is left absolutely defenceless, and with sensitive

Mental weakness is due to a variety of reasons, some of which are outside the teacher's power to remedy, while others are directly traceable to school mismanagement. Unwise petting—as has already been noted—may be so persistent at home that the child may become almost temperamentally incapable of facing a disagreeable job. The line of least resistance is fatally easy for the guardian, but often ruins the child. Disagreeable tasks must be done in this world, and the sooner the boy realises that nothing of value is gained without sacrifice the better. Devotion to their children is known the world over as an Indian characteristic, but the teaching profession has its part to play in setting before the parents what the highest form of love is. Too often the road to the ideal is full of the mist and fogs of uncertainly, false because there are not enough men of vision to electrify the way.

Only spiritual "electricity" can dispel the fogs of its universe even as a strong electric discharge rolls away those of the material world. But the danger to the child from home spoiling is very secondary in importance to the evils wrought by various forms of what can be proudly termed terrorism.

There are very few homes in India where lack of sympathy is shown to the child, but there are many schools where the teacher (too often lacking self respect himself) naturally utterly fails to bring it to healthy growth in the child. The class (except in technique) is treated as a unit and each child's individual needs are not studied.

How often is the transition from the Play-way and co-operative work of the Kindergarten made by at a bound to a "Stand and deliver" attitude. The boy comes into the new world of the upper school fearing and hoping. A new world is opening before him. It should be a world of heroes and great enthusiasm, for he is fitting himself to be a nation builder and nation creator. The story of the

laws of hygiene, and in thousands of cases children are infected with disease from birth. In others the lack of all training results in most ill-advised indulgence. Regular hours for feeding and wise choice of food for mother and infant are unknown or impossible of attainment, and the result is an ill-controlled baby, and as the infant grows up, he develops an unhappy peevish disposition.

A school child who has been utterly spoilt and unregulated must start school days with a handicap. Many school children also do not get enough sleep and consequently begin the day fatigued. On top of all this, many parents insist on anything from 1-3 hours being spent on home work. Still further fatigue is inevitable. Were it not for children's heaven-sent gift of inattention, thousands would break down utterly. Inattention (though often exasperating beyond measure to a teacher) is in India nature's shield against injury. It is madness in many cases to expect children to spend in profitable study the hours upon which the parents insist. Other physical defects, such as poor sight, deafness, spinal curvature, poor teeth and general weakness due to malaria etc., are so strictly the province of the doctor, that the work of teachers should be more the insistence upon regular medical inspection than direct remedial measures, but as physical weakness of some kind is so general, it should be the first sought for cause of retardation.

Visits to the homes of the children will help to remove backwardness due to a constant change of school. No matter how excellent a school, a newcomer must lose valuable time on entry. If the parents are assured that a true interest is being taken in their children's welfare they will not remove them if promotion is not granted. But to show interest only when removal is mooted cannot fail to bring the profession into deserved disrepute.

The next most important cause (which has many subdivisions) is second in importance—physical disabilities.

of an institution where such children can be sent and lovingly treated. To place them, as is too often the case, in a school for the normal child not only precludes almost all chance of their development but their presence has a most injurious effect on the ordinary normal child. The subnormal child has often visible peculiarities of facial expression and action which are copied by his associates, and perhaps these defects result in the subnormal becoming the butt of the class round whom coarse jests and thoughtless cruelty revolve.

But as many teachers are not qualified to distinguish between the two classes, the first need when considering the problem of the treatment of backward children is to classify them into the two groups of backward and subnormal, and when once differentiated, to set to work to discover the cause of the retardation so that it may be treated.

In the matter of such differentiation the country from which India can gain most help is the U. S. A. There are several reasons for this. Both countries are of vast extent. Both have a number of children whose vernacular is not that commonly spoken in the area in which they live. Both have need of tests which are so constructed that they will be of "continental" value. Both need tests applicable to children who are illiterate.

A variety of tests have been constructed in the U. S. A. They fall first into two great groups. There are class intelligence tests, and individual intelligence tests. The former help to discover *all* backward children, the latter are often needed to discriminate between the merely backward and the subnormal.

Causes of Backwardness

But once discovered, the next task is to diagnose the cause of backwardness. In India by far the most common cause is physical. Physical weakness is in many cases more within the domain of the welfare worker and doctor than the teacher. The parents are ignorant of many of the most elementary

sense education covers the whole of life; it is a mission and the teacher a missionary.

Many of you are probably acquainted with the anecdote of the school master who on being once asked by a stranger who he was replied that he was the ruler of the village. He justified the statement by arguing that he ruled the children, the children ruled their mothers, the mothers ruled their husbands and the husbands ruled the village; and therefore, he (the school master) was the ruler of the village. The same ennobling ideal should guide all educationists whether they are university professors or primary school teachers.

The Backward Child

BY

Miss F. N. WOOKEY, B. A., M. R. A. T. (Eng.)

St. George's Grammar School, Hyderabad Deccan.

The problem of the backward child is one which in any country presents great difficulty, but especially is this the case where the majority of teachers are untrained and inexperienced.

Differentiation of Backward and Sub-normal Children.

The term backward child is commonly used to cover two distinct classes, viz., those who are simply backward, (but are capable of great improvement) and those who are subnormal, and whose improvement is therefore much more limited. With the latter class I do not propose to deal for their instruction should be in the hands of teachers specially trained for this work, and should be carried out under the very close supervision of a medical practitioner who should have made a special study of such children. I would only remark in passing that few needs are greater in India than the founding

be changed. It is here that educationists fail. They have not provided a type of education fit for non-university children. At the end of the high school course, if parents are not capable of undertaking this work, at least the teacher should do it, and if the boy is unfit his attention should be diverted to one of the various technical courses. If this is done, the problem will be solved to some extent.

Vocational Educational.

It is often recommended that vocational courses should be introduced in the ordinary schools. Some years ago an experiment was made in Mysore in this direction by the inclusion of printing, or drawing, or carpentry, etc., as an additional subject of study in the High schools. The result was disappointing. For the problem was tackled the wrong way. Two hours' work a week for vocational study was hardly of any use in producing a real vocational bias, while for the university type of boy it meant a waste of energy on subjects in which he could not take any interest.

Boldness and courage are necessary for tackling the problem, and if the work of rigorous selection is undertaken, university education will find only a few individuals who by inherent capacity are fitted for it. It would be far better for the students themselves, the professors and the University. Then and then only will be recognised the three-fold ideal of education ; first, the acquisition of knowledge not as an end in itself but as a means of further development ; secondly, the power to think which is at the root of all progress ; and thirdly, the power to act without which the other two are useless. Educationists must face these problems and try to solve them. They are problems not merely of education but of politics in its broadest sense as well.

Education is a mission. It is not merely a device to keep the children away from the homes or to satisfy political slogans or a luxury for the select few, but in its broadest

The process of weeding out the undesirables should begin in early stages, both in the interests of the young and of society. It is a mistaken kindness to promote students and give grace marks to those who are really unfit for promotion. In the higher classes such students are a handicap to the teachers. The tendency in recent years has been towards the degeneration of the standard of education. Indian universities are blamed for producing inefficient graduates. The reproach is true, but it is forgotten that the universities have very bad material with which to build. So long as the secondary educational system remains unchanged, the universities cannot help the present state of affairs. What ought to be done is that if, after trial, a teacher finds that a particular student is incapable of improvement, it must be his duty to point out to the parent concerned that the student is of no use for that particular line and to dissuade the parents from continuing their child's education. It is a great mistake to have one uniform type of secondary education, due perhaps to political reasons. It must be realised that it is not every child that is fit to go up to the university course. Slogans are all right for political platforms but when we consider them in the light of educational realities to-day, we as educationists, free from political prejudices and prepossessions, have to admit that all children are not fit for university education.

I do not say those unfit for university education are necessarily inferior either as individuals or as citizens. Success in life can be achieved without passing through the portals of a university. The finish of being a university graduate need not be emphasised on the child's mind. Therefore, at the end of the middle school stage the question must be faced honestly whether a child is fit for university education. Do not gamble with the future of the child for the sake of the prestige of obtaining a degree which, thank God, is disappearing very rapidly. If a child is not fit, what must be done is that his educational course must

The well-being of the child must be safeguarded within the bounds of our present resources instead of thoughtlessly imitating the advanced ideas of the West. Leisure, so important in University education, should be appreciated for its value both for the teachers and for the pupils even to a greater extent during the plastic age of childhood. There is no use having four or five hours of school work each day. It is much better to have more concentrated teaching and leave the rest of the time for the children to play, to draw with pen and paper, or to devise new games so that they may realise the full benefit of leisure. Children to-day are given a large amount of home work which is very unfortunate. We do not realise that over-burdening their mind has a cramping effect, stunting their growth and development. The result is that the child loses its power for thinking and for originality.

Secondary Education.

It is, however, in the secondary stages of education that we find the greatest weakness of education in India. All attention is focussed on the university stage, it being taken for granted that the child is intended for university education. Energies are concentrated on the production of the best examination results so that the school comes to be judged by the large number of passes it has to its credit. What use is it when we produce graduates who are unable to find a job, who are not capable of writing their applications in correct English? It is a matter for wonder how such graduates could have passed their school examinations. This shows that there is something radically wrong with our educational system. The real reason is that students pore over their prescribed text-books and over notes which are often longer than the books themselves. The examiner in correcting the answer papers finds the candidates faithful to the text-books, and he overlooks bad English and gives credit for the labour spent on the text-books. But at the end of the university career we find that the graduates trained thus do not prove successful.

at home, if the children are taken to the nursery schools and are kept under the guidance of a sympathetic teacher—usually a lady teacher—the children receive a certain direction for their creative activity. The result is that foundations will be laid for the successful education of the children later on. It is an extraordinarily interesting experiment, but very costly and only very rich educational authorities can afford it, such as those in England and America. There are few such schools satisfactorily managed in India.

The fact of the matter is that all grades of education are starved in this country. The salaries of teachers are so inadequate that it is idle to expect them to be able and willing to teach the children of the slums in a proper way. It is an aspect of education which ought to claim the attention of our millionaires and of even the middle classes. It would be worth while starting such schools, if not for all children, at least for the benefit of a few. Perhaps it may be undertaken in our orphanages and by missionaries, not necessarily confined to the Christian missionaries.

Primary Education.

In India education begins only with the primary school stage, especially so in the villages. The Primary schools leave a good deal to be desired both in the quality of the teachers and in the school equipment. The teacher does not do his duty properly because he is so badly paid, and the four years spent in the primary schools are often a waste of energy and a period of agony for the children. Therefore, the amount of education both in its quality and in its quantity leaves much room for improvement. The educational policy of many States is not unexceptionable. There is a tendency to overload the curriculum and the result is that the child does not learn how to read and write as well as might be expected. Its mind is puzzled by the elaborate schemes which are more often than not intended for the edification of the school inspectors. The curriculum, therefore, has to be drastically revised.

the child will learn during those years all the necessary amount of reading and writing, for, after all, education does not mean that only. It means the training of the child in its most plastic years; it means that the foundation of moral and religious education could be laid in the first seven years of his life so that whatever may be the influences that may affect it later on, the impressions it has received during its formative period will always be present.

Nursery Schools.

This is the reason why in recent times a movement has been started in Europe and America, known as Pre-Primary Education or Nursery Schools. In the Nursery schools the dangers of premature instruction and the rigid discipline of the primary school are avoided and recognition is given to the elementary principle that the age of childhood is primarily that of play. It is wrong to conceive of play as useless; for it gives vent to the energy of the child, enabling it to come into contact with its own world. Play and liesure should be utilised for educational purposes by directing the energies of the child. It is this which forms the basis of the Kindergarten and even the Montessori systems of education. This must be begun some time before the child is taught to read and write, so that scope may be afforded for the development of its creative activity. I have seen some pictures drawn by children of Nursery Schools while I was in London two years back. Though the pictures might not be artistic productions, they were calculated to develop the creative faculties of children.

Nursery Schools offer a solution to the problem of the slums, the problem of fighting the disadvantages of undesirable family life. Many parents are ignorant, most of them slovenly, a few perhaps vicious. Nursery Schools tend to minimise the harmful effects of such atmosphere and impart to children impressions which would contribute to their development in future. Whatever influences may prevail

instruction for six years and who was still so backward that the Doctor pronounced him hopeless. The law required that the child should study for one year more but the mother was anxious that she should take away the boy from the school, so that he might earn a little and add to the family income. Ever since that time, I have realised the futility of compulsion in educational matters. Compulsion has a certain significance if the child who is subjected to it is capable of receiving instruction, but it is a waste of the most precious years of a young life when it is forced to study subjects which it cannot follow. We are apt to imagine that human nature is the same everywhere; but the plain truth is that it is not. We are to-day face to face with the problem of making education universal, and so devising it that all children can benefit by it. Because a child cannot read or write properly, it does not follow that the child is useless. Nature is very rich in compensations. In the same school which I visited in London, there was another boy backward at lessons, but he passed the tailoring examination with distinction and secured a first class. It may be that he is not intellectual from a particular stand-point but may be quite intelligent from another point of view.

Modern educational administrators have got to face the question in their attempt to suit the different levels of intelligence, to see that each child gets a fair degree of education. It is clear that there must be different types of eduation to suit different intellects.

Pre-Primary Education.

Time was when people took it for granted that education began with the primary school stage, that is, with the learning of the alphabet. As a matter of fact, a child has to be moulded practically from its infancy. What a child receives during the first seven years of his life will leave a permanent and life-long impression on its mind which it will not willingly let go. This does not mean that

far more complex to-day than it was in Plato's time or during the days of Herbert Spencer. The plain fact stares us in the face that all human beings are not equal. Bentham's dictum, "One man, one vote", may satisfy political theorists, but cannot be applied to education. When put into practice the result is so radically different that if we seek to enforce education by making it compulsory we may perhaps create more problems than solve the original problem itself. This is the third phase through which education is passing to-day.

It may be described as the phase of " New Education. " It is no exaggeration to say that the present age may be spoken of as the era of the child, in which the child is not conceived as a machine or an empty receptacle into which the teacher pours forth a number of facts, not a store-house of learning, but it is an age in which a new factor is being recognised, namely, that each child has a certain individuality of its own, that is, has traits not shared by other children. It is true, of course, that there is a certain measure of agreement among all children but there are individual peculiarities also with which we have to reckon. In our attempts at standardisation, we should take care that we do not kill the individuality of the child. Mass education must be imparted in such a way that the individual genius of each child is preserved. Education must be not only the work of imitation but the expression of individual aspirations. We should remember that the aim of our education should be to develop the child's personality.

Problem of Backward Children.

In this age we have also come to realize that it is a vain hope to expect that each child will necessarily react in a desired way to a particular system of standardised education. This fact was brought home to me two years ago when I paid a visit to a school run by the London County Council, which was specially meant for 'backward' children. There was a boy in the school aged 14 years who had already received

Education has passed through two phases. During its first phase, which lasted for several centuries, education was the monopoly of a few select individuals, not only in India but in Great Britain, and other parts of the world. It was considered so special and intrinsically difficult a subject that only a few were deemed to be qualified for it and the others had perforce to be content with being hewers of wood and drawers of water. This state of affairs continued right down to the middle of the last century when there came a new phase, dominated by the democratic ideas introduced into Europe as a result of the successful French Revolution. Education began to be treated as the birthright of every individual, a right conferred on him by his humanity, and it was felt that every person was both qualified and competent to receive education. The first phase could be described as the dominance of Nature and the second might be conveniently spoken of as the dominance of Nurture. The latter was a good optimistic belief calculated to break down the prevailing monopolistic view of education, and emphasising a sense of humanity governing all ranks from the highest to the lowest. It was under this belief that the various countries in Europe passed educational Acts for imparting primary instruction under compulsion and irrespective of the wishes of the parents. A new era was dawning and it was felt that educationists would carry out into actual practice the slogans of political democracy. Alas, the problems of education have not been so easily solved. Fifty years' experience of compulsory primary instruction has made us realise the enormous complexity of human nature and the attendant dangers of attempting to standardise human beings. It is not possible that education, good enough for certain individuals or for a certain section of individuals, should necessarily be good for all individuals and for all sections. We now feel that the problem is too complex to be dealt with by the adoption of dogmatic methods, whether by amateurs or by experts. The problem of education is

Some Phases of Education.

Trends of Education To-day

BY

A. R. WADIA, B. A. (Cantab), Barrister-at-Law,

Professor of Philosophy, Mysore University.

Mr. Chairman, Ladies and Gentlemen,

I consider it a privilege to have been asked to address you on a question which in one sense is exceedingly technical and in another sense so popular that every one of you and every one of the general public may well be expected to have definite and settled convictions. I can not say that I am specially qualified, as specialists are supposed to be qualified, to speak on this particular topic. But I am glad that the Chairman has taken the line of least resistance in introducing me as one whose subject is primarily philosophy. As a student of life, I may well be expected to have some views at least on education. Apart from that, I may claim for myself certain special privileges that I have enjoyed during the last 20 years of my professional career, especially the privilege I had of presiding for a short space of time over the destinies of the Education Department of Mysore. This gave me particular opportunities of acquainting myself with the actual working of Primary and Secondary schools in Mysore. India is a very huge country and I dare not say that what holds true of Mysore or of Bombay holds necessarily true of every other province in India, but the educational systems throughout the country possess certain broad features sharing some elements of commonness, and it is to those features that I will address myself in the course of my lecture.

---

* A lecture delivered at Hyderabad-Dn. on 1st March under the auspices of the Hyderabad Teachers' Association.

ERRATA.

Page	176 L 13	from	top	"resource" read "recourse".
,,	176 L 9	,,	bottom	"is" read "in".
,,	182 L 9	,,	,,	"ef" read "of".
,,	183 L 14	,,	top	"thes" read "them".
,,	184 L 6	,,	bottom	"avilable" read "available".
,,	184 L 2	,,	,,	"hopless" read "hopeless".
,,	201 L 9	,,	,,	"school" read "schools".
,,	201 L 8	,,	,,	"vicinty" read "vicinity".
,,	223 L last	"sections" read "section".		

THE HYDERABAD TEACHER

CONTENTS

PAGES.

TRENDS OF EDUCATION TO-DAY BY Professor A. R. WADIA, B. A. (Cantab), Barrister-at-Law ... 162

THE BACKWARD CHILD BY MISS F. N. WOOKEY, B. A., M. R. A. T. (Eng.) 171

INDIA'S KINDERGARTEN PROBLEMS AND HOW TO MEET THEM BY MISS SARAH E. LOUCKES. ... 179

THE PLACE OF A VILLAGE SCHOOL MASTER IN A SCHEME OF RURAL RECONSTRUCTION IN H. E. H. THE NIZAM'S DOMINIONS BY MR. A. VENKATARAMANIAH, B. A., L. T. ... 189

THE NATURE OF PROOF BY Dr. D. D. SHENDARKAR, Ph. D. (London.) 193

THE ALL-INDIA EDUCATIONAL CONFERENCE Lahore Session, April 1933, PRESIDENTIAL ADDRESS BY DR. ZIAUDDIN AHMED,. M. L. A., C. I. E. M. A., Ph. D. 195

THE DANISH EDUCATIONAL SYSTEM BY Mr. SYED MOHAHMED HUSSAIN JAFERI, B. A. (Oxon), Deputy Director of Public Instruction, Hyderabad, Dn. 210

RECENT EDUCATIONAL CONFERENCES First Annual Conference of the Teachers' Association, British Administered Areas, Hyderabad, Dn ... 215

The All-India Educational Conference, Lahore Session. 221

The Warangal Subah Teachers' Conference, 1342 F. 222

EDITORIAL 225

REVIEWS 228

Vol. VII. REGISTERED ASAFIA No. 47. No. 4.

THE

HYDERABAD TEACHER

Quarterly Magazine of the Teachers' Association,
Hyderabad-Deccan

Under the Patronage of
Khan Fazl Mohamed Khan Esq., M. A.,
Director of Public Instruction.

APRIL—JUNE, 1933.

SECUNDERABAD-DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD
1933.

Annual Subscription Rs. 3.

Vol. VII. No. 4.

THE HYDERABAD TEACHER

APRIL—JUNE, 1933.

Editorial Staff

S. ALI AKBAR M. A. (Cantab.) *Chief Editor.*

F. C. PHILIP, M. A.

M. ATAUR RAHMAN, B. A.

G. S. KRISHNAYYA, M. A., Ph. D., (Columbia).

SECUNDERABAD-DECCAN

PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD

1933.